تاریخ شناسی

تاریخ شناسی

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
۱۸- مزنگ روڈ، لاہور

نام کتاب: تاریخ شناسی

پبلشرز: فکشن ہاؤس

18 مزنگ روڈ لاہور' فون 7237430

کمپوزنگ: ایپکو گرافکس' شادمان مارکیٹ لاہور' فون 417994 481819

پرنٹرز: زاہد بشیر پرنٹرز' لاہور

سرورق: ریاظ

اشاعت اول: 1993

قیمت: 125 روپے

فہرست

حصہ اول: تاریخ نویسی

1- پیش لفظ 5
2- تاثرات 7
3- تعارف 11
4- تاریخ نویسی کیا ہے؟ 17
5- مسلمانوں کی تاریخ نویسی 23
6- برصغیر کی تاریخ نویسی 45
7- یورپی تاریخ نویسی 87
8- انلز تاریخ نویسی 113
9- امریکی تاریخ نویسی 117

حصہ دوم: تاریخ اور فرقہ واریت

1- پیش لفظ 129
2- برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات: ڈاکٹر مبارک علی 131
3- قدیم ہندوستان کی تاریخ اور فرقہ واریت: رومیلا تھاپر 145
4- عہد وسطی کی تاریخ اور فرقہ وارانہ نقطہ نظر: ہربنس کھیا 167
5- جدید ہندوستانی مورخ اور فرقہ واریت: بپن چندر 181
6- عہد وسطی کی تاریخ اور فرقہ پرست: اصغر علی انجینئر 203
7- المیہ تاریخ: ڈاکٹر مبارک علی 211

پیش لفظ

مورخ جب ماضی کی تشکیل کرتا ہے تو اس میں اس کے اپنے عہد کے نظریات و افکار اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انہیں کی بنیاد پر وہ ماضی کی تعبیر اور ہونے والے واقعات کی تشریح کرتا ہے۔ اس وجہ سے ماضی کی تعمیر و تشکیل ہر دور میں نئے انداز اور نئے طرز سے ہوتی رہتی ہے اور حال کے تجربات ماضی کو نئے معنی دیتے رہتے ہیں

اس سے پہلے "تاریخ نویسی" اور "تاریخ و فرقہ واریت" کے عنوان سے دو علیحدہ کتابیں شائع کی تھیں۔ اب موضوع کے لحاظ سے ان دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے تاکہ تاریخ نویسی اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس کتاب میں ایک اضافہ فرانس کے انلز اسکول کی تاریخ نویسی پر ہے جو اردو دان طبقہ کے لئے نیا ہے۔

تاریخ نویسی کے بارے میں جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بعد ہی قاری اس قابل ہوتا ہے کہ وہ مختلف مورخوں کے اسلوب اور نظریات کا تجزیہ کر کے ان کے تعصب پسند و ناپسند اور رائے کے بارے میں اندازہ لگا سکتا ہے' اور تاریخی واقعات میں سے حقائق کو ڈھونڈ سکتا ہے۔

تاریخ نویسی سے یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح بدلتے ہوئے حالات میں تاریخ لکھنے کے طریقے بھی بدل رہے ہیں۔ اور کس طرح تاریخ آہستہ آہستہ انسانی ذہن اور جذبات کو اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔

میں فکشن ہاؤس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو چھاپنے کا اہتمام کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی

جنوری 1993ء

لاہور

باب نمبر 1

تاثرات

برصغیر کی تحریک آزادی میں تاریخ نویسی نے نہ صرف قوم میں آزادی اور حریت کے جذبات کو پیدا کیا۔ بلکہ سوئے ہوئے قومی جذبات کو ابھارا اور غیر ملکی اقتدار سے جدوجہد کا حوصلہ پیدا کیا۔ آزادی کے بعد تاریخ نویسی کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں کیونکہ اب اس کے سامنے ماضی کے مفروضوں اور نو آبادتی دور کے اداروں اور روایات کو توڑنے کا چیلنج تھا۔ ہندوستان کے مورخوں نے اس مشن کو آگے بڑھایا اور اپنی قدیم و جدید تاریخ کی تشکیل کا کام شروع کردیا' پاکستان میں تاریخ نویسی ایک جگہ منجمد ہو کر رہ گئی اس کے ذریعہ دو قومی نظریہ اور چند مخصوص شخصیتوں کو ضرور اجاگر کیا گیا مگر نہ تو اپنی ماضی اور اس کے فرسودہ اداروں کے خلاف جنگ کی گئی اور نہ ہی نو آبادیات کی روایات کو توڑا گیا یہی وجہ ہے کہ ہمارا تاریخی شعور ناپختہ اور ادھورا رہ گیا اور جب معاشرہ اس کی روایات و اقدار' اور اس کے اداروں کے زوال اور اس کے اسباب کے تجزیہ کرنے کا وقت آیا تو ہم خرابیوں کی جڑ تک نہیں پہنچ سکے۔

کسی بھی معاشرہ کی بنیاد اس کے معاشی و سماجی اور سیاسی اداروں پر ہوتی ہے اور ان اداروں کی تشکیل میں طبقاتی مفادات ہوتے ہیں اور یہی مفادات انہیں فرسودہ اور ناکارہ ہونے کے باوجود برقرار اور زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تاریخ نویسی کا کام ہے کہ ان اداروں کی فرسودگی اور ناکارہ پن کو تاریخ کے ذریعہ بیان کرے تاکہ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو کہ یہ ادارے ایک خاص وقت اور ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اپنا تاریخی عمل ختم کرکے اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ اور ان کی موجودگی اب معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ اس لیے پاکستان میں معاشرہ کے زوال کے اسباب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کی تاریخ ان خطوط پر لکھی جائے کہ جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرے' ان میں سب سے اہم موضوعات حکمران طبقوں اور ان کے اداروں کی تاریخ ہے۔

نظام جاگیرداری کی جڑیں تاریخ میں بڑی گہری ہیں' برصغیر میں اس کی ابتداء کب ہوئی اور مختلف عہدوں میں اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں' اور بالاخر برطانوی دور حکومت میں اس ادارہ کا کیا کردار رہا اور پاکستان بننے کے بعد اس کا سیاست پر کس قدر گہرا اثر رہا؟ اس کے منفی اثرات نے معاشرہ کی ترقی میں کس طرح رکاوٹیں ڈالیں؟ اور کیا اس ادارہ کی جڑیں ابھی تک مضبوط ہیں یا ان میں کمزوری کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں؟

پیر پرستی کا ادارہ کن وجوہات کی بنا پر عوام کو ذہنی طور پر مفلوج بنائے ہوئے ہے؟ انگریزی عہد میں اس ادارہ کی کیوں سرپرستی کی گئی' اور اسے مضبوط بنانے کی خاطر انہیں کیوں زمینیں دی گئیں' پاکستان میں پیروں کے خاندان سیاست پر کس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں؟

علماء کا طبقہ کیوں جدیدیت کے خلاف ہے؟ اور اب تک فرسودہ نظام تعلیم کے ذریعہ تنگ نظر اور متعصب مذہبی جماعتوں کو پیدا کر رہا ہے۔

فوج کا موجودہ ادارہ نو آبادیاتی ضروریات کے تحت تشکیل دیا گیا تھا جس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا' آزادی کے بعد ڈھانچہ میں کیوں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی' اور اس نے پاکستان کی تاریخ میں جمہوری حکومتوں کو ختم کر کے کیوں مارشل لاء حکومتوں کو نافذ کیا؟

بیورو کریسی بھی نو آبادیاتی دور کا یادگار ادارہ ہے' اس میں بھی آزادی کے بعد کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور جمہوری حکومت کی غیر موجودگی میں یہ ادارہ محاسبہ نہ ہونے کی وجہ سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اب یہ جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

سیاسی جماعتوں کی تاریخ ان کے منشور کس حد تک عوام کی خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں اور کس حد تک وہ مراعات یافتہ طبقوں کے لیے ہیں۔؟

اس کے علاوہ شہر گاؤں' پنچائت' رسوم و رواج' دست کاری اور مختلف ذاتوں اور گروہوں کی تاریخ اور اس کا تجزیہ ضروری ہے کیونکہ یہ وہ تاریخ ہوگی جو معاشرہ کی بنیادوں اور اس کی جڑوں کو سامنے لائے گی۔ اور اس کی مدد سے ہم اپنے موجودہ حالات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ایسے مورخ کہاں سے لائیں گے جن

میں شعور کی اتنی پختگی ہو اور جو علم اور تحقیق میں اس مرتبہ پر ہوں کہ ان موضوعات پر لکھ سکیں' کیونکہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اس وقت تاریخ کا موضوع اپنی افادیت کھو چکا ہے' فرسودہ نصاب' رسائل و جرائد اور کتابوں کی کمیابی' بنیادوں ماخذوں کی عدم دستیابی' سرکاری دستاویزات اور کاغذات کی تباہی' باعلم اساتذہ کا فقدان اور تاریخ کی عملی افادیت کا ختم ہوجانا' یہ وہ سب عوامل ہیں کہ جنہوں نے تاریخ نویسی کے ذریعہ معاشرہ کو بیدار کرنے کے تمام راستے بند کردیئے ہیں۔ اس مرحلہ پر ترقی پسند سوچ رکھنے والوں کے لیے یہ چیلنج ہے' اور انہیں اس کا حل ڈھونڈنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ معاشرہ کے فرسودہ نظام کو تبدیل نہیں کرسکیں گے۔

تعارف

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تاریخ فرقہ واریت کا شکار ہے اور یہ فرقہ واریت سیاست کے تابع رہی ہے۔

برصغیر میں ہندو مسلم تعلقات کے اتار چڑھاؤ میں تاریخ پہلو بہ پہلو ان کے ساتھ چلتی رہی ہے' اور فرقہ وارانہ ذہنیت کی عکاسی کرتی رہی ہے۔

فرقہ وارانہ سیاست میں تاریخ کو استعمال کر کے سیاستدانوں اور حکومتوں نے اپنے مفادات کا تحفظ کیا' کیونکہ تاریخ کے اس نقطہ نظر میں تاریخ کی وسعت سکڑ کر رہ جاتی ہے اور ذہن تنگ ہو کر اپنی توجہ صرف ایک مسئلہ پر مرکوز کرلیتا ہے۔ فرقہ وارانہ جذبات معاشرے کے اہم اور ضروری مسائل کو پس پردہ دھکیل دیتے ہیں اور غیر اہم مسائل زندگی اور موت کے مسئلے بن کر معاشرے کی تمام توانائی صرف کردیتے ہیں۔

برصغیر ہندوستان و پاکستان کے معاشروں میں انتہائی اہم مسائل غربت' بیماری' بھوک' جہالت اور انسانی عظمت و احترام کے فقدان کے ہیں۔ یہ مسائل اس لیے پیدا ہوئے کہ یہ دونوں معاشرے طبقاتی طور پر اعلیٰ و نچلے طبقوں میں تقسیم ہیں۔ اور ان میں مراعات یافتہ طبقوں نے زندگی کی تمام سہولتیں اپنے لئے حاصل کرکے اکثریت کو ان سے محروم کرر کھا ہے۔

ایک طبقاتی معاشرہ ہمیشہ اس خوف اور ڈر میں رہتا ہے کہ نچلے اور محروم طبقوں میں کہیں طبقاتی احساس اور شعور بیدار نہیں ہو جائے' کیونکہ اس صورت میں محروم طبقے اپنے حقوق کی جدوجہد کرکے اس طبقاتی ڈھانچہ کو توڑ کر معاشرے میں عزت و احترام حاصل کرنا چاہیں گے۔ اس شعور کو روکنے اور طبقاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ جذبات انتہائی موثر کام کرتے ہیں اور اگر تاریخ کے ذریعہ انہیں معاشرے کی رگ و پے میں سرائت کردیا جائے تو رجعت پرستی و قدامت پرستی کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔

چنانچہ برصغیر کی تاریخ میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر کی وجہ سے ان ملکوں کے عوام کے تاریخی شعور کو نہ صرف روکا گیا بلکہ انہیں رجعت پسندی کی جانب دھکیلا گیا۔ اس کے تحت ہندو اور مسلمان محروم طبقے اپنے بنیادی مسائل کو بھول کر' جو ان کو ایک دوسرے سے ملائے ہوئے ہیں اور جن کی اذیت و تکلیف سے وہ صدیوں سے دوچار ہیں۔ انہیں نفرت و

عناد اور دشمنی کے جذبات کے ذریعے ایک دوسرے کے خلاف لڑایا جاتا ہے' اور انہیں اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جذبات کے تحت پیدا ہونے والے ہیروز کو اپنا سمجھ کر' ان سے محبت کریں۔

فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے جو ہیرو تخلیق کیے جاتے ہیں تو صرف ان کی خوبیوں اور نیکیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور ان کے جرائم اور سیاہ کارناموں کو جان بوجھ کر نظرانداز کردیا جاتا ہے اور ان کی عوام دشمنی کو سامنے نہیں لایا جاتا۔ فرقہ پرستی کے تحت جتنے بھی ہیرو تخلیق کیے جاتے ہیں ان کا تعلق حکمران طبقہ سے ہوتا ہے اور اسی لیے ان کی آڑ میں مراعات یافتہ طبقہ اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے' حالانکہ تاریخ میں وہ شخصیتیں بھی ہیں جنھوں نے عوام کے حقوق کے لیے حکمرانوں سے جنگیں لڑیں مگر ان عوام دوست شخصیتوں کو تاریخ کے پوشیدہ گوشوں میں چھپا دیا جاتا ہے تاکہ ان کے عمل سے عوام میں طبقاتی شعور پیدا نہ ہوجائے۔

یہ نقطہ نظر حکمران طبقوں کے لیے انتہائی سود مند ہوتا ہے کیونکہ اس کی آڑ میں وہ اپنے استحصالی کردار کو چھپا لیتے ہیں اور عوام کی صفوں میں شامل ہو کر ان کی ہمدردی حاصل کرلیتے ہیں۔ دوسرے اس نقطہ نظر کے ذریعے عوام کے تاریخی شعور کو پیچھے دھکیلا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ طبقاتی کشمکش سے ناواقف رہیں۔

تاریخ میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر تاریخ کو سہل اور آسان بنا کر پیش کرتا ہے کیونکہ اس میں کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی چونکہ مسلمان بادشاہ تھا اس لیے ہندوستان پر حملے' اس کی لوٹ مار' مندروں کی تباہی' بتوں کو توڑنا' اور ہندوؤں کا قتل عام کرنا یہ سب اسلام کے لیے تھا۔ اس وجہ سے ہر مسلمان کے لیے اس کی شخصیت قابل احترام اور عزت کے لائق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس میں محمود غزنوی کی شخصیت' وسط ایشیا اور ایران کا سیاسی پس منظر اور ترکوں اور ایرانیوں کے معاشرے میں ہونے والی سماجی و معاشی تبدیلیاں بالکل نظرانداز کردی جاتی ہیں اور محمود کی سامراجی پالیسی کو صرف فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے دیکھ کر' اس کے دوسرے اہم پہلوؤں کا تجزیہ نہیں کیا جاتا۔

یہی صورت حال عربوں کی فتح سندھ کے مسئلہ پر ہوتی ہے۔ اس کو صرف مذہبی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے سندھ اور برصغیر کے لیے باعث رحمت سمجھا جاتا ہے' اور حملہ کے پس منظر میں امیہ سلطنت کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور معاشی و سماجی تبدیلیوں کا تجزیہ نہیں کیا

جاتا جو اس حملہ کی وجوہات تھیں۔ تاریخ کو اس قدر سہل کرنے سے ہمارا تاریخی شعور ناپختہ رہ جاتا ہے اور اس وجہ سے ہم تاریخی عمل کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم اپنی موجودہ تاریخ کو بھی اس انداز سے دیکھنے کے عادی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے مسائل کی جڑوں سے واقف نہیں۔ یہ جڑیں ہماری تاریخ میں پوشیدہ ہیں اور ان سے اسی وقت آگہی ہوگی جب تاریخ کا مطالعہ معاشی' سیاسی اور سماجی تناظر میں کیا جائے گا۔

اگرچہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تاریخ کا فرقہ وارانہ نقطہ نظر غالب ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ہندوستان میں اس کے خلاف روشن خیال مورخوں نے جہاد شروع کردیا ہے اور وہ اس کے مضر اثرات کی نشاندہی کررہے ہیں اور تاریخ کو ایک وسیع کینوس پر پیش کررہے ہیں جب کہ اس کے برعکس ہمارے ہاں اسے دن بدن تقدس کا درجہ مل رہا ہے اور اس کی جڑیں اور گہری ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس کے خلاف ہر لبرل اور روشن خیال تحریک کو سختی سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اس فرق کی وجہ سے ہندوستان میں تاریخ نویسی کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے اور ہمارے ہاں مسلسل سکڑ کر محدود ہورہا ہے۔ اس فرق کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارے ہاں تاریخ نے گھٹا ہوا اور تنگ ذہن پیدا کیا ہے جو تاریخی تبدیلیوں اور تاریخی عمل کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے۔ تاریخی معلومات ایک خاص حد تک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے دی جاتی ہیں۔ اس لیے ہم عالمی تاریخ اور اس کے پس منظر سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔

اس کتاب میں تین مضامین "ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ واریت"

"COMMUNALISM WND THE WRITING OF INDIAN HISTORY"

سے لیے گئے ہیں۔ یہ مضامین رومیلا تھاپر' ہربنس مکھیا' اور بپن چندر نے لیکچر کی صورت میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیے تھے۔ بعد میں انہیں کتابی شکل میں چھاپا گیا' اور اپنے خیالات کی جدت اور تاریخ نویسی میں ایک نئے انداز کی وجہ سے مقبول عام ہوئے۔ یہ ہندوستان کے ان تین روشن خیال مورخوں کی تحریریں ہیں۔ جنہوں نے روایتی تاریخ کے مفروضوں کو پاش پاش کرکے رکھ دیا اور تاریخ سمجھنے کا وسیع اور سیکولر انداز دیا۔ تاریخ نویسی میں ان کے اس انداز اور اسلوب سے فرقہ پرست طبقہ بوکھلا گئے اور انہوں نے علمی میدان میں مقابلہ کی بجائے سازش کے ذریعہ اس تحریک کو ختم کرنا چاہا مگر انہوں نے جس

سائنٹفک طریقہ سے تاریخ کو پیش کیا ہے وہ آہستہ آہستہ ہندوستان کی تاریخ نویسی میں تبدیلی لا رہی ہے۔

چوتھا مضمون اس میں اصغر علی انجینئر کا ہے جو ان کی کتاب

(INDIAN MUSLIMS: A Study of the Minority problems in India)

"ہندوستانی مسلمان۔ ہندوستان میں اقلیت کے مسائل کا ایک مطالعہ" سے لیا گیا ہے۔

اصغر علی انجینئر ہندوستان میں ہندو مسلم فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف تحریری اور عملی جہاد کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں وہ تاریخ کے فرقہ وارانہ استعمال اور اس کے مہلک اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے خلاف کچھ نہیں کیا گیا' یا اگر کہا بھی گیا تو بہت کم اور دبی دبی آواز میں۔ اس وجہ سے اس کا اثر کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھ رہا ہے۔ خصوصیت سے ہماری نصابی کتابیں اور ذرائع ابلاغ عامہ اس نقطہ نظر کو پھیلانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

ایک خاص تبدیلی جو اس عرصہ میں آئی ہے وہ ہے کہ اب ہندوستان کے بجائے جنوب ایشیا کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ نصابی کتابوں اور حکومتی ذرائع ابلاغ عامہ سے ہندوستان کے لفظ کو یکسر خارج کردیا ہے اور اب سکول کی کتابوں میں اس قسم کے جملے پڑھنے کو ملتے ہیں کہ "جب مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں اپنی حکومت قائم کی" یا "جنوب ایشیا کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف جدوجہد کی" وغیرہ' وغیرہ۔ یہ اصطلاح طالب علموں اور عام قاری کو الجھن میں ڈال دیتی ہے جنوب ایشیا کی اصطلاح امریکی اور مغربی یونیورسٹیوں کی پیداوار ہے ان اصطلاحات کے ذریعہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے مفادات کے تحت مختلف علاقوں کو جغرافیائی طور پر تقسیم کردیں تاکہ وہ اپنی خارجہ پالیسی تشکیل دے سکیں اور تجارتی تعلقات قائم رکھ سکیں اس لیے یہ ان کے مفاد میں ہے کہ ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' سری لنکا' نیپال اور ہمالیہ کی ریاستوں کو جنوب ایشیا کے نام سے موسوم کرکے ایک جامع پالیسی بنائیں اس لیے ان کی پیدا کی ہوئی یہ اصطلاح ہمارے تاریخی اور ثقافتی ورثہ کی ترجمان نہیں بن سکتی اور ہم ان کے پس منظر میں اپنے تاریخی عمل کو نہیں سمجھ سکتے اس اصطلاح کو جوں کا توں قبول کرلینا اور اس کے اثرات کو نہ دیکھنا ہمارے دانش وروں کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔

دوسری تبدیلی جو ہمارے ہاں آئی وہ یہ ہے کہ اب ہم اپنی تاریخ کی ابتداء سندھ پر عربوں کے حملے اور ان کی فتوحات سے کرتے ہیں۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ اور کلچر کا مطالعہ یکسر نصابی کتابوں سے خارج کردیا گیا ہے پچھلے دنوں پاکستان سول سروس (CSS) کے نصاب سے اسے نکال دیا گیا۔ یہ سب اس لیے کیا جارہا ہے کہ ہم قدیم ہندوستان کی تاریخ اور کلچر سے ناواقف رہیں۔ اور قدیم ہندوستان کے کارناموں اور تہذیب و تمدن کی بالیدگی سے بے خبر رہیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہندوستان میں تہذیب و تمدن کی ابتداء مسلمانوں کی آمد سے ہوئی اور اس سے پہلے کا زمانہ جہالت اور وحشت کا تھا۔ اس لیے اس کے مطالعہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو لوگ تاریخ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنی پسند کی چیزیں پڑھوانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ خود نہ تو تاریخی شعور سے واقف ہیں اور نہ ہی ان کی خواہش ہے کہ دوسرے لوگ اس سے آگاہ ہوں۔

تاریخ کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اس کے پورے عمل سے آگہی نہ ہو ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کی جڑیں قدیم ہندوستان میں پیوست ہیں اور موجودہ دور عہد وسطی سے پیوست ہے ان ملے ہوئے تاریخی واقعات کو تراش خراش کرکے جب انہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے گا تو اصل جسم سے جدا ہو کر اور تاریخ کے دھارے سے علیحدہ ہو کر ان کی اہمیت کم ہوجائے گی اور ان علیحدہ واقعات اور تاریخ کے ان جداگانہ ٹکڑوں کی مدد سے ہم تاریخ کے مکمل عمل سے آگاہ نہیں ہوسکیں گے۔

- ابتدائی چار مضامین میں ہندوستانی مورخوں نے تاریخ میں ہندو فرقہ وارانہ نقطہ نظر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور مسلمانوں کے نقطہ نظر پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ اس وقت ہندوستان میں یہی نقطہ نظر جارحانہ انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔

آخر کے دو مضامین اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تاریخ نویسی میں کیا رجحان ہیں؟ اور فرقہ پرستی کو تاریخ کے ذریعہ کس طرح فروغ دیا جارہا ہے؟ اس طرح یہ ممکن ہوسکے گا کہ ہم دونوں ملکوں میں فرقہ واریت اور تاریخ کے تعلق کو سمجھ سکیں۔

سب سے آخر میں، ترجمہ کے متعلق یہ عرض کروں کہ ترجمہ اصل کے مطابق ہے صرف اصغر علی انجینئر کے مضمون کی تلخیص کی ہے اور ان مباحث کو نکال دیا ہے جن پر پہلے تین مضامین میں تفصیل سے بحث ہوچکی تھی۔

امید ہے کہ یہ مختصر سی کتاب ہمارے تاریخی شعور میں اضافہ کرے گی۔

باب نمبر2

تاریخ نویسی کیا ہے؟

انسان جب تک انفرادی حیثیت سے اس کائنات میں اپنی بقاء کی جنگ لڑا' اس کی ذات فطرت کی پیچیدگیوں میں گم ہوگئی اور وہ کوئی تاریخ تشکیل نہیں کرنے پایا' لیکن جب انسان نے اجتماعی حیثیت سے زندگی گزارنی شروع کی تو اس نے ان افراد کو یاد رکھنا شروع کردیا جنھوں نے فطرت کے خلاف مزاحمت کی تھی اور اپنے ساتھیوں' اور گروہوں کا آفات و بلائے آسمانی سے تحفظ کیا تھا ان افراد کے یہ کارنامے معاشرہ کی اجتماعی یاد داشت کا ایک حصہ بن گئے' اس کے علاوہ انسان جو کچھ اس دنیا میں سیکھتا رہا وہ ان تجربات کو کہانیوں' گیتوں اور قصوں کے ذریعہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرتا رہا' اور یہی قصے و کہانیاں شاعرانہ تخیل کے ساتھ طویل زرمیہ نظموں میں تبدیل ہوگئے اور ادب میں لافانی شکل اختیار کرگئے ان قصے' کہانیوں اور زرمیہ نظموں نے ماضی سے رومانوی لگاؤ کو پیدا کیا اس کے نتیجہ میں حقیقی واقعات نے افسانوی رنگ اختیار کرلیا اور حقیقی انسان دیوی' دیوتا اور مافوق الفطرت ہستیاں بن گئیں۔

اجتماعی انسانی زندگی میں جب معاشرہ طبقوں اور مراعاتی خاندانوں میں تقسیم ہوا تو شاہی خاندان کے افراد نے خصوصیت سے اپنی عظمت اور بڑائی کو باقی رکھنے کی خاطر خاندانی شجرے محفوظ کرنا شروع کردیئے' اس قسم کے شجرے اول اول سومیریا اور مصر میں لکھے گئے' اور ان شجروں میں جن افراد نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا تھا تو اس کو بھی شامل کردیا گیا اس کے ساتھ حکمرانوں کے عہد میں ہونے والے اہم حادثات و واقعات کو بھی لکھ دیا جاتا تھا' چونکہ اس وقت تک تقویم' یا سنہ کی دریافت نہیں ہوئی تھی اس لیے سال کی ابتدا کسی اہم واقعہ سے کی جاتی تھی' ابتدائی تاریخ نویسی کے یہ نمونے پتھروں پر تحریر کی شکل میں ملے ہیں' ان کتبوں پر شہروں کی فتوحات اور ان کی تباہی کی تاریخ' حکمرانوں کے سال جلوس اور مرنے کی تاریخ اور دیوتاؤں کے نام دعائیں اور مناجاتیں ہیں۔

قدیم مصر میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مشہور شخص مرتا تھا تو پتھر پر اس کی زندگی کا مختصر خاکہ' اور اس کے کارنامے لکھ کر اس کی قبر پر نصب کردیا جاتا تھا' اس سے واقعات کو لکھنے اور انہیں بیان کرنے کی ابتداء ہوئی' لہٰذا تاریخ نویسی شروع میں کتبوں کی شکل میں شروع ہوئی جو محلات' مقبروں اور مندروں پر نصب ہوتے تھے' یا محلات و مذہبی عمارتوں کی دیواروں پر تحریریں ہوتی تھیں' جو آج قدیم عہد کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں۔

جیسے جیسے انسانی تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی' مختلف انسانی معاشرے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے' تجارت' صنعت و حرفت اور جنگ و جدل نے انسانی معاشروں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کرنا شروع کردیا' اور انسان کے تجربات میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔

جب تاریخ تحریری شکل میں آئی تو اس وقت انسانی معاشرے میں بادشاہت کا دور دورہ تھا' یا انسان ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے اولیاؤں کی شخصیت سے متاثر تھا اس لیے اس کی تاریخ کا موضوع یا تو بادشاہ تھے یا اولیاء اور ان کے معجزے ان دونوں صورتوں میں تاریخ نویسی پر شخصیتوں کی چھاپ رہی اور معاشرہ کا عام آدمی تاریخ کے دائرہ سے دور رہا۔
ابتدائی تاریخ نویسی میں بادشاہ اور جنگوں کے حالات بیان کیے جاتے تھے کیونکہ جنگوں کے اثرات انسانی معاشرے پر بڑے گہرے اور تباہ کن ہوا کرتے تھے' لیکن جب بار بار جنگ کے واقعات اور حالات کو بیان کیا گیا تو ان واقعات کی یکسانیت نے ان کی دلچسپی کو ختم کردیا' اس لیے مورخوں نے بیان کے طرز کو بدلا اور اس میں مبالغہ آمیزی اور عبارت آرائی کو شامل کردیا جس سے طرز تحریر میں شاعرانہ انداز میں آگیا۔ بعد میں مذہب کے زیر اثر جب جنگ میں خدا کو شامل کرلیا گیا تو ایک اور ڈرامائی عنصر اس میں پیدا ہوگیا کیونکہ اس کے بعد جنگ میں فتح کا مطلب سچائی' انصاف' اور حق کا غلبہ ٹھہرا' جنگ ایک مقدس عمل ہوگئی۔ اور ہر فریق اب یہ جنگ اپنے دیوی' یا دیوتاؤں کے اشاروں پر لڑنے لگا۔ اس نے معاشرہ کے افراد کو ایک مقصد کے لیے متحد کردیا' اب یہ صرف جارحانہ یا دفاع کے لیے نہیں بلکہ دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے بھی لڑی جاتی تھی اور اس میں قتل و غارت گری' لوٹ مار' اور تباہی و بربادی مذہبی نقطہ نظر سے جائز تھی۔ جنگ میں فتح دیوتاؤں کی جانب سے انعام ہوا کرتی تھی تو شکست ان کے برے اعمال کی سزا' اس وجہ سے ابتدائی

مورخوں نے جنگ کے موضوع کو اپنایا اور اس کو مرکز بنا کر معاشرے کی تاریخ لکھی۔

قدیم زمانے میں نظریہ یہ تھا کہ واقعات چیزوں کی مانند ہوتے ہیں جو کہ بنے بنائے قدرت کی جانب سے نازل ہوتے ہیں' اس لیے ابتدائی تاریخوں میں محض ان کا بیان ہوا کرتا تھا اور ان کا تجزیہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اور واقعات کو محض روایات کی بنا پر صحیح تسلیم کرلیا جاتا تھا' اس لیے ابتدائی تاریخ نویسی میں مافوق الفطرت واقعات کی بھرمار ہے۔

معاصر مورخ اپنے عہد میں ہونے والے واقعات کو لکھتا تھا۔ جب کچھ معاصر مورخوں کے بیانات کو ایک ہی واقعہ کے سلسلہ میں دیکھا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ واقعہ ایک ہے مگر اس کو بیان کرنے اور پیش کرنے کا طریقہ ہر ایک کا جدا جدا ہے۔ اس سے مورخ کی پسند ناپسند اور اس کے ذاتی جھکاؤ کا پتہ چلتا ہے اس لیے معاصر تاریخ جو "ماخذ" کا کام دیتی ہے مکمل طور پر قابل تسلیم نہیں ہوتی ہے لیکن تاریخ نویسی میں ایک عرصہ تک یہ ماخذ اور ان میں بیان کئے ہوئے واقعات آنے والے مورخوں کے لیے محض سچائی ہوا کرتے تھے جب کہ مورخ ان واقعات کو ان کی سچائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی پسند و ناپسند کی وجہ سے منتخب کرتا ہے۔ اس لیے مورخ چاہے قدیم ہو یا جدید اس کے سیاسی' مذہبی اور فکری افکار اس کی تاریخ نویسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ماخذ اور انکی بنیاد پر لکھے جانے والے واقعات کی سچائی کو چیلنج کیا گیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ ماخذ کو اتھارٹی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس میں مورخ کی اپنی ذات اور خیالات کا بڑا دخل ہوتا ہے اس لیے جدید تحقیق میں یہ ضروری ٹھہرا کہ ہم عصر ماخذوں اور مورخوں کی جانچ پڑتال کی جائے اور متضاد شہادتوں کی موجودگی میں وہ اپنا فیصلہ دیا جائے۔ اس سے جدید تاریخ نویسی میں ایک بڑی تبدیلی آئی کہ تاریخ کو محض ماخذوں کی شہادت کی بنیاد پر نہیں بیان کرنا چاہئے بلکہ ان ماخذوں کے ساتھ ساتھ اسے سرکاری دستاویزات' کاغذات' خط و کتابت' فرامین' حکم ناموں' اور ذاتی یادداشتوں کو بھی استعمال کرانا چاہئے اور ان کے ذریعے سے واقعات کی سچائی کو پرکھا جانا چاہئے۔

اس کے ساتھ ہی تاریخ نویسی میں آثار قدیمہ کی شہادتوں' کتبات اور سکوں کو بھی استعمال کیا گیا' اس نے تاریخ نویسی کے دائرہ کو بڑھا دیا اب تاریخ کو عمرانی' نفسیاتی' علم بشریات' لسانیات اور نیچرل سائنس کی مدد سے بہتر طریقہ سے سمجھا جارہا ہے مثلاً" علم کیمیا نے تاریخ کی تحقیق میں نئے نئے اضافے کیے ہیں۔ قدیم انسانی ڈھانچوں کا کیمائی تجزیہ ان

کی غذا اور خوراک کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے اس کی شہادت پر معاشرہ اور ان کے افراد کی غذا' ان کے استعمال کے برتن' اور اس سے ان کے سماجی رتبہ کے اندازہ ہوتا ہے' مثلاً" امریکہ میں سفید نسل کے قبرستان کے مردوں کے تجزیہ سے یہ پتہ چلا کہ ان کی غذا میں سیسہ زیادہ ہے کیونکہ وہ دھات کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے جب کہ کالے باشندوں میں یہ کم ہے کیونکہ وہ لکڑی کے برتنوں میں کھاتے تھے' جب کالوں کے کھانے میں سیسہ کی مقدار زیادہ ہوئی تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سماجی رتبہ بڑھ رہا تھا۔ اس طرح سے ریڈ انڈین مرد اور عورت کے غذائی اجزا ابتدا میں ایک تھے' یہ ان کا شکاری عہد تھا جس میں مرد اور عورت کو مساوی مقام ملا ہوا تھا۔ لیکن جب وہ کاشتکاری کے زمانے میں آئے تو عورت کی معاشرہ میں کم تر حیثیت ہوگئی اور اس کی غذا میں گوشت کم ہوگیا جس سے اس کے کم تر سماجی رتبہ کا پتہ چلتا ہے۔

تاریخ کا نقطہ نظر اب وسیع اور گہرا ہوگیا ہے اب یہ انسان کے ماضی کے بارے میں جو خیالات و افکار ہیں ان کا مطالعہ کرتی ہے اور ماضی اور حال کی نسلوں کے درمیان تعلقات کو قائم کرتی ہے۔

تاریخ نویسی سے معاشرے کی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے ایک قوم جب تک اپنے علاقہ میں محدود رہتی ہے اس کی دلچسپی اور معلومات اپنے علاقہ تک رہتی ہیں اور اسے صرف اپنی تاریخ کا علم ہوتا ہے' لیکن جب یہی قوم تجارت' سفارت اور جنگوں کے ذریعہ دوسری اقوام سے واقف ہوتی ہے تو اس کی تاریخی معلومات کا دائرہ بھی بڑھ جاتا ہے اور دوسری اقوام کی تاریخ اس کی تاریخ کا ایک حصہ بن جاتی ہے' اس تاریخ نویسی کے ذریعہ معاشرہ کی تجارتی سرگرمیوں' ثقافتی ارتقاء اور سیاسی فتوحات و شکستوں کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ تاریخ نویسی معاشرہ کے حالات کی پیداوار ہوتی ہے اور ان مورخوں کے ذہن و فکر سے جنم لیتی ہے جو معاشرے کا ایک حصہ ہوتے ہیں اس لیے ان کی تاریخ نویسی میں ان کا عہد' حالات اور واقعات جھلکتے ہیں' اگرچہ وہ ماضی کے بارے میں لکھتے ہیں مگر یہ ماضی ان کے عہد کے حالات کی تصویر پیش کرتا ہے' مورخ اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہو کر ماضی کے واقعات کے بارے میں اپنی رائے بھی بدلتا رہتا ہے مثلاً" ایک عرصہ تک چنگیز و ہلاکو کے ظلم و ستم' قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی تاریخ کے بھیانک اور دل ہلا دینے والے واقعات تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں جو تباہی و

بربادی آئی اور ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم نے جو تباہی کی اس نے منگولوں کی خون ریزی کے اثرات کو کم کردیا' اور انسان کے تجربات میں اس سے زیادہ بھیانک تجربہ کا اضافہ ہوا۔

قومیت کی تحریک میں تاریخ نویسی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ ایک ایسے دور میں جب کہ کوئی قوم اپنی شناخت کے مرحلہ میں ہوتی ہے اور اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ملا کر متحد کرنے کا عمل ہوتا ہے اس وقت تاریخ نویسی کے ذریعہ ماضی کی تشکیل کی جاتی ہے اور قوم کی ساخت کا عمل اس کے ذریعہ تیز تر ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ماضی کے پرانے اور فراموش شدہ ہیروز کو دوبارہ سے زندہ کیا جاتا ہے زبان کی ہیئت اور اس کی ثقافتی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے' لوک گیت اور کہانیاں دوبارہ سے لکھی جاتی ہیں اور ثقافتی ہم آہنگی کے عناصر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا جاتا ہے۔

تاریخ نویسی کا تعلق تاریخ سے نہیں بلکہ اس تاریخ سے ہوتا ہے جو کہ مورخ لکھتا ہے اور واقعات کی تعبیر و تفسیر اپنے نظریہ سے کرتا ہے' اس لیے تاریخ نویسی کے ذریعہ ان رجحانات کو دیکھا جاسکتا ہے جو مورخوں کی تحریر میں جھلکتے ہیں' جب مورخ اپنے نظریات و افکار کے ذریعہ واقعات کو بیان کرتا ہے تو وہ ان میں زندگی پیدا کردیتا ہے۔ وہ مورخ جو ترقی پسند اور انسانیت سے محبت رکھتا ہے جب وہ ماضی میں جمہوریت پسند اور عوام دوست قوتوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے قلم میں نئی زندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور عوام دشمن بادشاہ' آمر' اور مطلق العنان شخصیتیں اپنے گھناؤنے اور مکروہ چہروں کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر ابھرتی ہیں۔ درباری مورخ کے ہاں یہی مطلق العنان شخصیتیں مہربان و سخی اور بہادر و شجاع بن جاتی ہیں اور ہر عوامی تحریک بغاوت' سرکشی اور شورش ہوجاتی ہے۔ تاریخ میں واقعات کبھی نہیں بدلتے' جو ہوا تھا وہ بدلا نہیں جاسکتا مگر ان واقعات کو بیان کرنے کا نقطہ نظر' عہد اور ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے' مثلاً" یہ ایک واقعہ ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کئے تھے' اب اس واقعہ کو ایک مسلمان مورخ جب مذہب کے نقطہ نظر سے لکھتا ہے تو اس کو یہ حملے مذہب کی تبلیغ اور جہاد نظر آتے ہیں۔ اور وہ انہیں اسلام کی خدمت قرار دیتا ہے۔ ہندو مورخ انہیں محض لوٹ مار سمجھتا ہے' سیکولر ذہن رکھنے والا مورخ ان حالات کا تجزیہ کرتا ہے کہ جن کی وجہ سے یہ حملے ہوئے اس لیے تاریخی کی تعبیر و تفسیر حالات و نظریات کے تحت بدلتی رہتی ہے' انسان کو جیسے جیسے نئے نئے تجربات

ہوتے رہتے ہیں وہ ان کی روشنی میں ماضی کے واقعات کا جائزہ لیتا ہے اس وجہ سے تاریخ کو برابر نئے نظریات کی روشنی میں لکھتے رہنا چاہئے تاکہ بدلتے ہوئے حالات میں اس کی افادیت قائم رہے۔

جدید تاریخ نویسی پر یورپ کا گہرا اثر ہے' یورپ نے دنیا کی تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھا اور یورپ کو عالمی تاریخی مرکز بنا لیا۔ اسی لیے جب یورپی اقوام نے بحری راستے دریافت کیے۔ امریکہ کو دریافت کیا تو انہوں نے ان واقعات کو اس طرح سے پیش کیا کہ دنیا میں پہلی مرتبہ یہ دریافتیں ان کی کوششوں سے ہوئیں' حالانکہ قدیم زمانہ میں دوسری اقوام بھی تھیں جو ان بحری راستوں سے واقف تھیں' اور ایشیا و افریقہ کے براعظم' ان کے دریا اور پہاڑ ان کے لیے نئے نہیں تھے' مگر یورپی تاریخ نویسی میں یہ تمام دریافتیں اس نقطہ نظر سے پیش کی گئیں کہ اہل یورپ نے انہیں پہلی بار پایا ہے ورنہ یہ سب نامعلوم تھیں۔ ایک عرصہ تک ان کا یہ نقطہ نظر لوگوں کے ذہن پر غالب رہا۔ مگر اب ایشیا' افریقہ کے مورخین نے عالمی تاریخ کو یورپ کے مرکز سے نکال کر اس کی تعبیر اپنے نقطہ نظر سے کرنا شروع کر دی ہے۔

اسی طرح سے انہوں نے تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے قدیم' عہد وسطی اور جدید میں تقسیم کیا اور ان اصطلاحوں سے انہوں نے اپنی تہذیبی و تمدنی ترقی کو ناپا مگر دنیا کی دوسری تہذیبوں پر تاریخ کی یہ تقسیم صادق نہیں آتی ہے۔

یورپ میں جدید تاریخ نویسی اس وقت میں تشکیل ہوئی جب کہ یورپ کی اقوام نو آبادیاتی نظام کی بنیاد ڈال رہی تھیں' اس لیے ان کی تاریخ میں سامراجی' نسلی اور قومی نقطہ نظر آگیا ہے' نو آبادیاتی ملکوں میں آزادی کی تحریکوں' اور دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی نے تاریخ نویسی میں تبدیلیاں کیں اور انہوں نے اپنی تاریخ کو نئی اصطلاحوں اور نئے نقطہ نظر سے لکھنا شروع کردیا' تاکہ نو آبادیاتی دور کے تمام اثرات کو ختم کیا جاسکے۔

تاریخ نویسی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے' اس لیے تاریخ لکھنے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہئے کہ اس سے عوام میں شعور پیدا ہوا' وہ اپنے حقوق سے واقف ہوں' اور ماضی میں جن شخصیتوں اور طبقوں نے ان کے حقوق غصب کیے تھے' اور ان پر ظلم و ستم کیے تھے ان کی اصل حقیقت سب کے سامنے واضح ہو کر آئے تاکہ آئندہ وہ ان کے دھوکہ میں نہیں آئیں' اور باشعور ہو کر اپنی تقدیر خود بنائیں اور یہ کام دوسروں کے حوالے نہیں کریں۔

باب نمبر3

مسلمانوں کی تاریخ نویسی

تاریخ نویسی کی ابتدا اور ارتقا

چونکہ تاریخ کا تعلق معاشرہ کی ساخت' ہیئت اور اس کے عمل و کردار سے ہوتا ہے اس لیے تاریخ نویسی بھی معاشرہ کے ارتقاء اور تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے ابتداء میں عرب معاشرہ قبائل کی شکل میں آباد تھا۔ ان کی نہ تو کوئی مرکزی سلطنت و حکومت ہوا کرتی تھی اور نہ ہی سیاسی ادارے' قانون اور ضابطے جو ان قبائل میں یکساں طور پر نافذ ہوں' موجود تھے۔ یہ قبائل ایک جغرافیائی علاقہ میں محدود زندگی گزارتے تھے اس لیے ان کی زندگی میں کوئی سیاسی سماجی و معاشی تبدیلیاں تیزی کے ساتھ نہیں آتی تھیں۔ ان کے ہاں اہم واقعات فطری آفات' قبائلی جنگیں' شعراء کے قصائد اور نظمیں اور وقتاً" فوقتاً" ہونے والے بازار ہوا کرتے تھے لہٰذا اس محدود زندگی میں تاریخ کے لیے ایسے واقعات کم ہوتے تھے کہ جنہیں محفوظ کیا جاسکے۔ عرب قبائل کے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے قبیلہ کی روایات یاد رکھیں۔ یہ روایات "ایام" کہلاتی تھیں اور خاص طور سے شمالی عرب قبائل کی قدیم تاریخ کی بنیاد یہی ایام تھے۔ ان کا تعلق قبائل کی آپس کی جنگوں سے ہوا کرتا تھا۔ واقعات کے بیان میں زور و جذبہ پیدا کرنے کے لیے انہیں اشعار میں بیان کیا جاتا تھا۔ یہ ادب اسلام کے ابتدائی دور تک مقبول رہا' اور اسلام لانے کے بعد بھی عرب قبائل نے اس ذخیرہ کو محفوظ رکھا۔ کوفہ اور بصرہ کی فوجی چھاؤنیوں میں ایام میں بیان کیے ہوئے قصے، کہانیوں کے ذریعہ مختلف قبائل نے اپنی عظمت و برتری کو قائم رکھنے کی کوشش کی' بلکہ اسلام کے بعد ان قبائل نے جنگوں میں جو کارنامے سرانجام دیئے تھے ان کو بھی انہوں نے اسلام سے قبل کے کارناموں سے ملا کر ایک سلسلہ میں ملا دیا۔ چونکہ ان واقعات کا اظہار شاعری کے ذریعہ ہوا کرتا تھا اس لیے یہ نہ صرف حافظہ میں محفوظ ہو

جاتے تھے بلکہ ان کے بیان سے دلوں میں جوش و گرمی اور جذبہ پیدا ہوجاتا تھا۔

اسلام سے پہلے قدیم یمن میں کہ جن کا معاشرہ تہذیبی طور پر ترقی یافتہ تھا اور جہاں حکومت کے ادارے اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھے وہاں کچھ روایات تھیں جو زبانی تاریخ کی شکل میں موجود تھیں' ان روایات کو پہلی صدی ہجری میں مورخوں نے تحریری شکل میں بیان کیا جس کے بعد سے یہ عرب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن گئیں۔

اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کا ایک اہم پہلو علم نسب ہوا کرتا تھا جس کے ذریعہ ہر عرب قبیلہ اپنے آباؤ اجداد کے ناموں کو یاد رکھتا تھا' نسب کی اہمیت کی وجہ سے ہر قبیلہ میں راوی اور نساب ہوا کرتے تھے جو خاندانی شجروں کو یاد رکھتے تھے اور قبیلہ کے اہم واقعات کو یادداشت میں محفوظ کرلیتے تھے' یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی قائم رہا۔

تاریخ کا مادہ "ورخ" ہے اور س کے معنی مہینہ کے تعین کرنے کے ہیں۔ تاریخ کا لفظ نہ تو قرآن میں استعمال ہوا ہے اور نہ حدیث میں' ماضی کے واقعات بیان کرنے کے معنوں میں یہ اصطلاح 9 صدی عیسوی میں استعمال ہوئی ورنہ اس سے پہلے اس کے معنی چاند کے مہینے کے تھے اور اس تعلق سے تاریخ (date) اور عصر (Era) کے معنی بنے۔ کیونکہ دن اور مہینے کو کاغذات میں بطور تاریخ (date) لکھا جاتا تھا' اس کے بعد سال کے اہم واقعات کو دن اور مہینہ میں لکھا جانے لگا اس لیے تاریخ کا مفہوم یہ ہوا کہ کسی واقعہ کے زمانہ کا تعین کرے' واقعہ کی تاریخ (date) اور عصر (Era) کو بتائے اور واقعات کو تقویم (Chronology) کی ترتیب کے ساتھ بیان کرے۔

2 صدی ہجری میں تاریخ کا لفظ ایسی کتابوں کے لیے استعمال ہوا کہ جن میں تاریخ (dtae) ہوتی تھی اور وہ کتابیں جن میں واقعہ کی تاریخ بیان نہیں کی جاتی تھی وہ تاریخ نہیں کہلاتی تھیں۔ ابتدائی تاریخ کی کتابیں سوانح عمریاں ہوا کرتی تھیں ان میں کسی شخص کی پیدائش اور موت کی تاریخ کو لکھنا کافی سمجھا جاتا تھا۔

750ء سے پہلے کی لکھی ہوئی تاریخی کتابیں اب موجود نہیں۔ ابتدائی تاریخ لکھنے والوں میں تین نام ملتے ہیں۔ عروہ الزبیر (وفات 14-711) محمد بن سالم بن شہاب الزہری (وفات 43-740) اور موسیٰ بن عقبہ (وفات 9-758) مگر ان کی کتابیں اصلی شکل میں موجود نہیں' بعد میں جب تاریخ کا شوق پیدا ہوا تو ان کے شاگردوں اور مداحوں نے ان کتابوں کو اپنے طور پر لکھ کر لوگوں میں پھیلایا' عباسی دور میں جب کہ تاریخ کو لکھنے کا

سلسلہ شروع ہوا ہے تو امیہ دور کی کتابیں ضائع ہوچکی تھیں' اس لیے یہ شک ہوتا ہے کہ یا تو انہیں عباسی دور میں تباہ کردیا گیا یا ان کی کاپیاں زیادہ تعداد میں نہ ہونے کی وجہ سے وقت کے ہاتھوں ختم ہوگئیں۔

اسلامی تاریخ نویسی کے موضوعات عربوں کی فتوحات اور ان کی سیاسی و سماجی و معاشی زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بڑھتے رہے۔ جب تک عرب اپنے علاقوں میں محدود تھے ان کی زندگی میں بھی کوئی تنوع نہیں تھا۔ لیکن جب فتوحات کے کے ذریعہ انہوں نے شام' عراق' اور ایران فتح کیے اور ان کا قبائلی معاشرہ تبدیل ہو کر جاگیردارانہ معاشرہ میں بدلا تو عربوں کے ساتھ ساتھ دوسری قومیں بھی مسلمان ہو کر اسلامی امت میں شامل ہوئیں تو اس کے ساتھ تاریخ نویسی کی ہیئت اور ساخت میں بھی تبدیلی آئی۔

قدیم عربوں میں ماضی کی معلومات بیان کرنے کے لیے "خبر" کا لفظ استعمال ہوتا تھا جس کے ذریعہ اہم واقعات کو بیان کیا جاتا تھا۔ اس کو بیان کرنے والا "اخباری" یا "راوی" کہلاتا تھا۔ عام طور سے ہر قبیلہ کا ایک اخباری اور راوی ہوا کرتا تھا جو اس قبیلہ کے اہم واقعات کو یاد رکھتا تھا اور انہیں بیان کرتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی واقعات کو بیان کرنے کے لیے خبر کے طریقہ کو استعمال کیا گیا۔ اس میں مختصراً" کسی واقعہ کو بیان کیا جاتا تھا اور ایسے اشخاص کے بارے میں معلومات جمع کی جاتی تھیں جو کسی خاص صلاحیت کے حامل ہوتے تھے۔ اخباری مورخوں میں ابو مخنف (وفات 774) اعوانہ بن الحکم (وفات 764) سیف بن عمر (وفات 796) اور المدائنی (وفات 831) مشہور ہوئے ہیں۔ ان مورخوں کی کتابیں تلف ہوگئیں' المدائنی کی ایک کتاب جو ملی ہے اس کا نام ہے "ان قریشی عورتوں پر جن کے کئی شوہر تھے"

ان اخباری تاریخوں میں اب ایک قبیلہ کے بجائے پوری امت کی تاریخ ہوتی تھی جن میں ہم عصر مذہبی تنازعات' سیاسی بحران اور نظریاتی کش مکش اہم موضوعات تھے۔ مثلاً" قدر کا مسئلہ جسے بنو امیہ نے اپنے مفادات کے تحت فروغ دیا' امام کی ذات اور حیثیت' حضرت علیؓ و معاویہؓ کے درمیان جھگڑے' اور مختلف قبیلوں کی باہمی چپقلش' شعوبیہ (قومیت) کی تحریک کے زیر اثر اخباریوں نے عرب کی قدیم تاریخ کا مواد بھی جمع کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ عرب تہذیب و تمدن کی برتری کو غیر عرب قوموں پر ثابت کریں' خصوصیت سے ایرانیوں پر کہ جن سے اس تحریک کا تعلق تھا۔

جب وقت کے ساتھ ساتھ اہم واقعات بڑھتے چلے گئے اور ان واقعات کو خبر کے ذریعہ بیان کرنا ممکن نہیں رہا تو وقت کے تقاضوں کے تحت وقائع نگاری (Annals.) کے ذریعہ واقعات کو بیان کرنے کا طریقہ شروع ہوا۔ اس طریقہ میں سال بھر کے واقعات کو لکھا جاتا تھا اور یہ وہ واقعات ہوتے تھے جو سیاسی و سماجی اور معاشی طور پر اہم ہوا کرتے تھے۔ ان واقعات کا ایک دوسرے کے ساتھ تسلسل برقرار رکھا جاتا تھا۔ اہم موضوعات جو بیان کیے جاتے تھے وہ حکمرانوں کے دور حکومت' علماء و صوفیاء کی زندگی کے حالات اور فطری آفات ہوا کرتے تھے۔

اس قسم کی تاریخ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف ان واقعات کو بیان کیا جاتا تھا جو ہم عصر مورخوں نے بیان کیے ہوں' ان واقعات کے صحیح ہونے یا درست کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی ان کا تجزیہ کیا جاتا تھا۔ بعد میں آنے والے مورخ جب ماضی کی تاریخ لکھتے تھے تو ان ہی واقعات کو نقل کردیتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات وہی رہے صرف ان کو بیان کرنے کا انداز اور زبان بدل گئی۔ اس لیے مورخ کی تاریخ کا صرف وہ حصہ اہم ہوتا تھا جس میں وہ ہم عصر تاریخ لکھتا تھا۔

خبر اور وقائع نگاری میں جو فرق تھا وہ یہ کہ خبر میں تمام واقعات کو ملا کر ایک جگہ بیان کیا جاتا تھا' جب کہ وقائع نگاری میں ان واقعات کو تاریخ اور سنہ کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔

جب تاریخ میں واقعات کا زیادہ ذخیرہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس میں زیادہ پھیلاؤ آگیا۔ ابن خلدون نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ ان واقعات کا نام ہے جو کہ کسی خاص قوم اور ملک کے لیے عجیب و غریب ہوں' مقریزی کے مطابق یہ علم ان معلومات کی اطلاع دیتا ہے جو کہ ماضی میں واقع ہوچکی ہیں' اور السخاوی کی تعریف کے تحت تاریخ کا موضوع انسان اور وقت ہے۔

لہٰذا جب واقعات زیادہ ہونے لگے تو تاریخ میں ان واقعات کو سال کے بجائے مہینہ اور دن کے حساب سے لکھا جانے لگا۔ اس کے بعد تاریخ کو "دس سال" کے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھا گیا اور اس کا نام "طبقہ" رکھ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی "صدی" یا "قرن" کے حالات و واقعات کو بھی ایک ساتھ بیان کیا جانے لگا جیسے "آٹھویں صدی کے شعرا" یا "چوتھی صدی کے علماء" وغیرہ۔

طبقہ کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ ایک نسل کا ذہن ایک مدت میں ختم ہو جاتا ہے اور دوسری نسل اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ بعض نے اس مدت کو بیس سال قرار دیا ہے اور بعض نے دس سال۔ اس کے علاوہ طبقات میں معاشرہ کے سماجی و سیاسی اور معاشی بنیادوں پر جو تقسیم ہے اس کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جیسے علماء' امراء' حفاظ اور شعراء اس لیے طبقات اس کی تعریف کو ذہن میں رکھ کر مورخوں نے اپنی تاریخ کا نام "طبقات" رکھا اور بعد میں طبقوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی وضاحت کی۔

اسلام کے ابتدائی دور تک عرب قبائل اپنے تشخص کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اپنے حسب و نسب کو خاندانی شجروں کے ذریعہ محفوظ کرنا چاہتے تھے' اس کے نتیجہ میں خاندانوں کی تاریخ کی بنیاد پڑی۔ البلاذری (وفات- 892) نے "الانساب". تصنیف کی جو نسب کے دائرہ کی ایک اہم تصنیف ہے۔ لیکن وقت کے بدلنے کے ساتھ اور قبائل کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یہ مشکل ہوگیا کہ وہ اپنی شکل اور ساخت برقرار رکھ سکیں' اس لیے قبائلی نظام کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی شجروں ور حسب نسب کی بنیاد پر لکھی جانے والی تاریخ بھی ختم ہوگئی۔ صرف شمالی افریقہ میں جہاں بربر اور عرب قبائل میں تصادم رہا وہاں ضرور انساب پر تاریخیں لکھی گئیں۔

تاریخ کی ساخت میں اس وقت اور تبدیلی آئی جب کہ اسلام میں ملوکیت آئی اور حکمرانی خاندان میں موروثی ہوگئی۔ اس لیے بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ اس انداز پر لکھی گئی کہ ہر انفرادی خلیفہ کے دور حکومت کو تاریخ کا ایک دور سمجھا گیا اور اس میں ہونے والی جنگیں' اہم سیاسی و سماجی اور فطری حادثات کو اس کے دور میں بیان کیا گیا۔

جب بنو عباس کے زوال کے ساتھ سلطنت کے مشرقی علاقوں میں خود مختار بادشاہتیں قائم ہوئیں تو ان شاہی خاندانوں کی تاریخ لکھی جانے لگی' یہ تاریخ حکمرانوں کی تخت نشینی سے شروع ہو کر ان کی وفات تک بیان کی جاتی تھی۔ اس میں اس کے عہد کے اہم واقعات کے ساتھ حکمران کی شخصیت' اس کی جسمانی شکل و صورت' اس کے کردار کی خوبیاں اور اس کی بیویوں و بچوں کی تفصیل ہوتی تھی۔ ساتھ میں اس عہد کی مشہور شخصیتوں اور انتظام سلطنت کا ذکر ہوتا تھا۔

تاریخ میں مزید وسعت اس وقت آئی جب اس میں جغرافیائی معلومات کا اضافہ ہوا فتوحات اور تجارت نے مسلمانوں کے جغرافیائی معلومات میں اضافہ کیا جیسے جیسے نئے علاقہ

فتح ہوتے گئے ان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان ملکوں کی جغرافیائی معلومات کو بھی جمع کیا جاتا رہا' جو ملک ان کے ہمسایہ تھے ان کے بارے میں سیاحوں اور تاجروں نے معلومات فراہم کیں' اس لیے یعقوبی (وفات 892) اور مسعودی (وفات 956) نے تاریخ میں جغرافیائی معلومات فراہم کرکے اسے اور زیادہ وسعت دی۔

مسلمانوں میں تاریخ نویسی کا ابتدائی اہم موضوع رسول اللہ کی سوانح حیات تھا۔ مسلمانوں کے لیے رسول اللہ کی شخصیت اور آپ کے حالات وہ اہم واقعات تھے کہ جنہوں نے تاریخ کو بدل ڈالا تھا۔ اس لیے آپ کی ذات ان کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی تھی کہ جس کے گرد ابتدائی اسلامی عہد کے اہم واقعات واقع ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کی ذات سے جو محبت اور لگاؤ تھا اس کی وجہ سے وہ آپ کے بارے میں تمام معلومات اکٹھی کرکے انہیں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں پہلے احادیث کو جمع کیا گیا' اور احادیث کے صحیح یا غلط ہونے کے معیار مقرر کرکے انہیں منتخب کیا گیا' اسناد کی اس تحقیق سے تاریخ نویسی کو فائدہ ہوا اور اس سے اس کی ساخت میں مدد ملی۔ اس لحاظ سے حدیث اور تاریخ نویسی میں قریبی تعلق ہے مگر بعد میں حدیث موضوع کے اعتبار سے محدود رہی جب کہ تاریخ نویسی کا دائرہ برابر بڑھتا گیا۔

سیرت کے مواد کو مورخوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا: حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت اسماعیلؑ تک' حضرت اسماعیلؑ سے رسول اللہ تک' اور رسول اللہ کا عہد آپ کی وفات تک۔ تاریخ کا یہ مواد توریت' انجیل' عرب قبیلوں کے نسب ناموں اور قرآن و حدیث سے لیا گیا۔

ابن اسحاق (وفات 768) پہلا مورخ تھا جس نے سیرت رسول اللہ لکھی' یہ تین حصوں میں تقسیم ہے: ابتداء یعنی اسلام سے پہلے عرب کی تاریخ' مبعث' رسول اللہ کی زندگی ہجرت تک' المغازی' رسول اللہ کی وفات' تک بدقسمتی سے اصل کتاب وقت کے ہاتھوں ضائع ہوگئی اور اس کے اقتباسات جو بعد کے مورخوں نے نقل کیے تھے وہ محفوظ رہ گئے۔ ابن ہشام (وفات 833) کی ترتیب دی ہوئی کتاب اس وقت موجود ہے مگر اس میں اس نے بہت سا مواد نکال دیا۔ ابن اسحاق کی سیرت کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ کی زندگی کے واقعات کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی میں آپ کے اور اسلام کے دشمنوں کی بہادری اور جرات کی بھی تعریف کی ہے۔ ابن ہشام نے اس تاریخ کو اس

طرح سے مسخ کیا کہ بہت سے ایسے واقعات جو اسے پسند نہیں تھے یا جن سے اس کے خیال میں اسلام کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ انہیں اس میں سے نکال دیا جس کی وجہ سے اصل کتاب کی بنیادی خصوصیت ختم ہو گئی۔

اسلامی تاریخ نویسی کا دوسرا درجہ جب آتا ہے جب محمد بن عمر الاوا قدی (وفات 833) نے مغازی کے نام سے اسلام کی ابتدائی جنگوں کے حالات لکھے۔ اس کے علاوہ اس نے اسلامی تاریخ کو ہارون الرشید کے عہد تک لکھا۔ ابن سعد (وفات 45- 844) نے جب اسلامی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کرکے طبقات کے نام سے تاریخ لکھی تو یہ بھی تاریخ نویسی میں اہم اضافہ تھی۔ اس نے پہلے طبقہ میں سیرت رسول اللہ' دوسرے میں صحابہ کرام کے حالات اور تیسرے میں تابعین کے حالات میں جمع کیے۔ اس طرح سے تاریخ کی تقسیم نے تاریخ کو سمجھنے میں مدد دی۔ رسول اللہ کے حالات زندگی میں مزید اضافی مواد کو شامل کیا گیا جس میں آپ کے احکامات' خطوط' اور تحریری دستاویزات شامل تھیں۔ سیرت میں رسول اللہ کی عادت صفات' اخلاق' اور علامات نبوت کو شامل کیا گیا۔ اس نے سیرت کو بیان کرنے کی ایک نئی شکل دی اور بعد میں آنے والے مورخوں نے اسی کو اختیار کیا۔

سیرت اور مغازی کے بعد' تیسرا اہم موضوع جسے منتخب کیا گیا وہ اسلام کا آفاقی مشن تھا کہ جس کے زیر اثر مسلمانوں نے شام' عراق' ایران' مصر اور سندھ کو فتح کیا۔ اس مشن کو جن شخصیتوں نے پایہ تکمیل تک پہنچایا ان کے کارناموں کو تاریخ میں محفوظ کرنا بھی ضروری تھا۔ وقت کی اس ضرورت کو البلا ذری نے دو کتابیں لکھ کر پورا کیا۔ فتوح البلدان میں اس نے اسلام کی ابتدائی فتوحات کی تاریخ بیان کی ہے اور ان مسائل کی نشان دہی کی ہے جو نئے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کو پیش آئے تھے الانساب میں اس نے ان عرب شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اسلام کی خدمت کرتے ہوئے نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔

نئے علاقوں کی فتح اور غیر عرب باشندوں کے قبول اسلام کے ساتھ ہی تاریخ نویسی میں تبدیلی آئی۔ اب تک تاریخ نویسی میں دور جاہلیت اور اسلام کی آمد کے بعد کے زمانہ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے دیکھا جاتا تھا' ادھر جب نئے ملکوں کی فتوحات کے بعد ان ملکوں کا ماضی بھی ان کے ورثہ میں آیا تو مقامی باشندوں نے جو مسلمان ہو گئے تھے مگر اپنے ماضی سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی قدیم شان و شوکت اور عظمت کو

باقی رکھیں' اس نے عرب و عجم کے درمیان نظریاتی جنگ کی ابتداء کی جو اس عہد کی شعوبیہ (قومیت) کی تحریک میں ملتی ہے۔ اس میں ایران اور عرب دونوں اپنی تہذیبی اور ثقافتی برتری کو ایک دوسرے پر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں دونوں طرف سے تاریخ کے ذریعہ مدد لی گئی۔ اس کے نتیجہ میں دور جاہلیت کی تاریخ کہ جس کو اب تک زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ شعوبیہ تحریک کے رد عمل کے طور پر نیہ دور جاہلیت بھی ان کے لیے اہم ہوگیا' اور ایام و اخبار کے ذریعہ قدیم عرب کی تاریخ کو اسلام سے ملا کر ایک تسلسل میں بیان کیا اور یہ ثابت کیا کہ عرب ابتداء ہی سے برتر افضل قوم رہی ہے' اور انہوں نے ہمیشہ تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف شعوبیوں نے اپنی قومی تاریخ کو نئے سرے سے تشکیل کرنا شروع کیا۔

نویں صدی عیسوی تک تاریخ کو محدثین اور علماء لکھتے تھے مگر جب حکومت کی ساخت بدلی' خلیفہ مطلق العنان ہوا۔ ایرانی رسومات دربار میں روشناس ہوئیں' اور دربار و انتظامیہ کے عہدے داروں کا اقتدار بڑھا تو اس کے ساتھ ہی محدثین و علماء کا اثر بھی گھٹ گیا اور یہ لوگ پس منظر میں چلے گئے اوران کی جگہ درباری عہدے داروں نے لے لی' اور تاریخ نویسی کا کام ان کے ہاتھوں میں آگیا۔ اس سے تاریخ نویسی کی ساخت و شکل میں تبدیلی آئی کیونکہ ان عہدے داروں کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ سیاسی واقعات کو جمع کرلیں اور سرکاری کاغذات و دستاویزات کے ذریعہ مواد حاصل کرلیں اس وجہ سے تاریخ نویسی میں اسناد کا حوالہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا اور اس کی جگہ مورخ کی اپنی شہادت نے لے لی۔ چونکہ ان عہدے داروں کا تعلق دربار اور حکومت سے تھا۔ اس لیے ان کے موضوعات بھی اس حد تک محدود تھے۔ لیکن اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ تاریخ نویسی سے مذہبی اثرات ختم ہوگئے اور اسے سیکولر علم کا درجہ مل گیا۔ مذہبی لوگوں نے اس کے بعد سے سیاسی تاریخ کو حکومت کے عہدے داروں کے لیے چھوڑ دیا اور خود انہوں نے مذہبی تاریخ لکھنی شروع کردی' جس میں علماء و فقہا صوفیا اور محدثین کی سوانح عمریاں ہوتی تھیں' ان کے نزدیک یہی تاریخ مسلم امہ کی حقیقی تاریخ تھی۔

فتوحات' تجارت اور سیاحت نے عربوں کے سیاسی افق کو وسیع کیا اور اس کے ساتھ ہی تاریخ نویسی کے موضوعات بھی بڑھے اور پس منظر میں عالمی تاریخ لکھنے کی ابتدا ہوئی اور دسویں صدی میں اس قسم کی تین عالمی تاریخیں لکھی گئیں اس کو شروع کرنے والا یعقوبی

تھا۔ جس نے اپنی تاریخ کی ابتداء تخلیق کائنات سے کی اور اسلام سے قبل کی تاریخ کو بیان کیا اس کا مواد اس نے انجیل سے لیا' اس کی تاریخ میں غیر مسلم اقوام کے تذکرے ہیں لیکن ان کی تاریخی اہمیت کو اسلام کے ربط سے واضح نہیں کیا گیا ہے' اگرچہ اس نے ان اقوام کی علمی و ثقافتی کارناموں کو واضح کیا ہے اور اس کی اہمیت بتائی ہے کہ ترقی کے لیے ان کے علمی کارناموں سے مدد لینی چاہیے۔

طبری (وفات: 923) نے اسلام سے قبل عرب اور ایران کی تاریخ کو لکھا ہے اور ایک ہی قسم کے واقعات کے بارے میں مختلف بیانات کو ایک جگہ جمع کردیا ہے مگر ان واقعات کی چھان بین اور تجزیہ نہیں کیا ہے۔ طبری نے ایران کے علاوہ دوسری اقوام پر اس لیے نہیں لکھا کہ ان میں اسے بادشاہت کا تسلسل نہیں ملا۔ اور اس وجہ سے اس کے بنائے ہوئے خاکہ میں ان کی تاریخ نہیں سمائی۔ اس کی تاریخ کا موضوع رسول اور ملوک ہیں اور انہیں مرکز بنا کر ان کے تعلق سے وہ تاریخ بیان کرتا ہے۔

تیسری عالمی تاریخ المسعودی کی ہے جسے اس نے مروج الذہب کے نام سے موسوم کیا ہے' اس میں تخلیق کائنات' دنیا کی طبعی خصوصیات' اسلام سے قبل عربوں کی ثقافتی زندگی اور ان اقوام کا ذکر جن سے وہ دسویں صدی تک واقف ہوچکے تھے ہر خلیفہ کا دور حکومت اور اس کے عہد کے دلچسپ واقعات۔

ان تینوں مورخوں نے تاریخ نویسی کی ساخت و ہیئت میں بنیادی تبدیلیاں کیں مثلاً" یعقوبی نے ساسانی عہد کے بہت سے تاریخی مفروضوں کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے اپنے سفر کے تجربات سے فائدہ اٹھایا اور وہ جن جن ملکوں میں گیا ان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا مشاہدہ کیا اس لیے اس کا ذاتی مشاہدہ اس کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ شیعہ ہونے کی وجہ سے اس کا تاریخ میں نقطہ نظر اس مسلک کے نظریات سے اثر انداز ہوا ہے طبری نے تاریخ واقعات کو حدیث کی طرز پر اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے اور ایک ہی واقعہ پر مختلف شہادتوں کو جمع کردیا ہے۔ مسعودی کے ہاں نہ صرف اس کے سفر کے تجربات ہیں بلکہ اس کے ہاں تاریخ کے موضوعات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وہ سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس کے ہاں فلسفہ تاریخ کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جب وہ فطری ماحول اور انسانی تعلقات' زندگی اور موت کی گردش اور فطرت سے اس کی مماثلت جیسے موضوعات پر بحث کرتا ہے۔

ان تین کے علاوہ دوسرے مورخوں نے بھی تاریخ کو عالمی تناظر اور پس منظر میں دیکھا اور لکھا' الدینوری (وفات: 897) نے اخبار الطوال میں ایران کی تاریخ کو تفصیل سے لکھا ہے اور چینی و ہندوستان کی تاریخ کو مواد کی کمی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ ابن مسکویہ نے تاریخ کو سیکولر نقطہ نظر دیا' اس نے تاریخ سے خرافات نکال کر ایسے واقعات دیئے کہ جن سے لوگ سبق سیکھ سکیں۔

ایرانی قوم پرست ہونے کی وجہ سے اس نے ایران کے بادشاہوں کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جبکہ پیغمبروں کی تاریخ کو اس نے مختصراً" بیان کیا ہے کیونکہ مذہبی عقائد کے تحت پیغمبروں کی ذات تنقید سے بالاتر ہے اور انسانی فہم سے ماورا ہے اس لیے اس نے ان کی تاریخ لکھتے ہوئے صرف اہم واقعات کو لکھا' اور اس نقطہ نظر کو واضح کیا کہ انسانی تاریخ انسان کے تجربات پر مبنی ہے لہٰذا اس لئے تاریخ کو زیادہ اہمیت دینی چاہئے اس کی کتاب کا نام بھی "تجارب الامم" ہے۔

حمزہ الاصفہانی نے اپنی تاریخ میں خاص طور سے مختلف اقوام میں مروجہ سنوں کو دیا ہے' ابن قتیبہ (وفات: 882) کی تاریخ انتظامیہ کے عہدے داروں کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کی تھی' اس نے اپنی تاریخ میں ایام اور عالمی تاریخ کو ملا کر ایک نئی شکل دی۔ اس ضمن میں مشہور عالم و فلسفی اور مورخ البیرونی (وفات: 1048) کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس نے تاریخ میں فلسفہ' سائنس اور لسانیات کو شامل کر کے اس کے دائرہ کو وسیع تر کیا۔ اس نے واقعات کا تجزیہ کیا اور پھر اپنا فیصلہ اور رائے دی۔

عالمی تاریخ تخلیق آدم سے شروع ہوئی تھی اور اسلام کی آمد تک اس کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ مگر یہ دنیا کی مکمل تاریخ نہیں تھی صرف اس قدر تھی کہ جس سے مسلمان واقف تھے' اس لیے اس میں یہودیوں' عیسائیوں' اور ایرانیوں کی تاریخ تو ہے مگر یونانیوں' ہندوستانیوں اور چینیوں کی تاریخ نہیں ہے۔

اگرچہ بعد میں آنے والوں نے ان اقوام پر بھی لکھا مگر زیادہ توجہ انہوں نے ان کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ دی۔ مثلاً" یونانیوں کی تاریخ کو نظر انداز کر کے یعقوبی نے صرف ان کے علمی کارناموں کو بیان کیا۔ اس طرح جب ہندوستانیوں اور چینیوں سے سیاحت اور تجارت کے ذریعہ ربط ہوا تو ان کے بھی صرف علمی کارنامے ان کی نظر میں آئے۔

عالمی تاریخ کے مواد کی بنیاد انجیل اور قرآن تھے۔ ان مذہبی کتابوں کی اسناد پر انہوں

نے کائنات کی تخلیق اور نسل انسانی کے بارے میں لکھا ہے۔ لہٰذا وہ دنیا کی تاریخ کی ابتداء اس طرح سے بیان کرتے تھے کہ طوفان نوح کے بعد یہ تمام دنیا تباہ ہوگئی تھی اس لیے نسل انسانی اس کے بعد نوح اور اس کے تین بیٹیوں اور بیویوں سے آگے پھیلی اس لحاظ سے تمام اقوام کا تعلق نوح کی نسل سے ہے۔ا

بہت سی ایسی اقوام بھی تھیں جو طوفان نوح کے واقعہ کو تسلیم نہیں کرتی تھیں' مثلاً" ایرانی کہتے تھے کہ کیمورث حضرت آدم تھے اور نسل آدم کا سلسلہ اس سے چلا اس لیے طوفان نوح آیا ہی نہیں یا ایران تک نہیں آیا۔

مسلمان مورخوں کے لیے اسلام سے قبل تاریخ لکھنا ایک اہم مسئلہ تھا' کیونکہ سوال یہ تھا کہ اسلام سے پہلے کی اقوام یا ہم عصر قوموں کی شاندار تاریخ کو کس طرح بیان کیا جائے کہ اس سے اسلام کا کردار بھی متاثر نہ ہو اور واقعات کو بھی بیان کیا جاسکے۔ اور اس کو کس طرح سے حل کیا جائے کہ ان قوموں کی ترقی اسلامی اصولوں کے بغیر ہوئی۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر اسلام کی کیا ضرورت اور اہمیت رہ جاتی ہے؟ ابن المقفع (وفات: 756) اور جاحظ (وفات: 769) نے اسلام سے قبل کی اقوام کی دانش مندی اور تہذیبی کردار کو اجاگر کیا ہے اور ابدی دانش کا خیال پیش کیا ہے کہ جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے ابن مسکویہ نے قوموں کے تجربوں کو ان کے کارناموں کی صورت میں پیش کیا اور ابن خلدون نے روحانی اور دنیاوی تاریخ میں تفریق کی' اس طرح سے انہوں نے غیر مسلم اقوام کے کارناموں اور ان کی شانداری ثقافتی زندگی کو بیان کیا اور کوشش کی کہ اس نقطہ نظر سے اسلام کسی طرح سے متاثر نہ ہو۔

اسلام سے قبل کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے مورخوں نے ان پیغمبروں کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے انہیں ابتدائی مسلمان بتایا ہے اور غیر مسلمان بادشاہوں کی زبان سے اسلامی اقوال کہلوائے ہیں۔ المسعودی نے اس مسئلہ کو اس طرح سے حل کیا چونکہ عقل یا دلیل خدا کی جانب لے جاتی ہے اور اس سے انسانی فرائض کی تشکیل میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے غیر مسلم مفکرین کو اس کی روشنی میں دیکھنا چاہئے اور ان کی علمیت کو تسلیم کرلینا چاہئے مسعودی غیر مسلم مفکرین کو ابتدائی مسلمان تو نہیں کہتا مگر وہ قدیم اقوام کی تاریخ اور مذہب پر تحقیق کرتے ہوئے ان کے ساتھ انصاف کرتا ہے اور ان کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

قدیم تاریخ کو لکھتے ہوئے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ واقعات کا کس طرح وقت کے ساتھ تعین کریں' کیونکہ اس وقت تک ہجرت سے پہلے کے واقعات کو بیان کرنے کا کا کوئی سن دریافت نہیں ہوا تھا۔ (ق۔ م کا استعمال یورپ میں اٹھارویں صدی عیسوی میں شروع ہوا) اس لیے یہ تمام تاریخیں وقت کی قید سے آزاد ہیں۔

نویں اور دسویں صدی عیسوی میں معتزلہ تحریک نے عقلی رجحانات کو فروغ دیا' سائنس اور فلسفہ نے تشکیک کو پیدا کیا جس کے تحت قوانین فطرت اور انسان اقدار و روایات کو جوں کا توں تسلیم کرنے کے بجائے ان کا تجزیہ کرنے کے بعد انہیں قبول کرنے کا رجحان ہوا معتزلہ نظریہ کے تحت ہر شے کی ایک خاص فطرت ہے جو خدا نے اسے دی ہے اور ہر شے اپنی فطرت کے تحت عمل کرتی ہے۔ اس کے زیر اثر تاریخ نویسی میں بھی واقعات کو پرکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی مثال المسعودی کی ہے جس نے واقعات کو عقل کی بنیادوں پر پرکھا اور تاریخ میں تحقیق و جستجو کا عنصر شامل کیا۔ اس طرح مسعودی نے تاریخ کو ایک وسیع کینوس پر پیش کیا۔ اس کے نزدیک تاریخ انسان کے کارناموں کا خزانہ ہے جس میں سیاست ہی نہیں بلکہ فکری اور ثقافتی کارنامے بھی ہیں۔ تاریخ نویسی کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان کارناموں کو محفوظ کرے اگر انہیں محفوظ نہیں کیا گیا تو انسان کا تعلق تمام علوم و افکار سے کٹ جائے گا۔ تاریخ قانون' فصاحت و بلاغت' مذہب' فکر' اخلاق سیاست اور جنگ سب کی بنیاد ہے۔ تاریخ کے عمل کو اگر بغور دیکھا جائے تو اس میں حکمت نظر آتی ہے اور یہ حکمت انسانی فہم و تجربہ کو بڑھاتی ہے۔

معتزلہ نظریات کے تحت تاریخ نویسی میں صحت مند تبدیلیاں آئیں' واقعات کو تحقیق و تنقید کے بعد عقل کی بنیادوں پر پرکھا گیا اور تاریخ کو مذہبی عقائد سے نکال کر اسے سیکولر درجہ دیا گیا' لیکن عشریوں کی تحریک نے اس عقلی اور سیکولر رجحان کو ختم کردیا کیونکہ ان کے عقائد کے تحت حادثات خود بخود وقوع پذیر ہوتے ہیں اس لیے ان کے تجزیہ اور شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی' چونکہ عشری عقلیت کے زبردست مخالفوں میں سے تھے اس لیے انہوں نے تاریخ کے سیکولر نقطہ نظر کو ختم کرکے اسے پھر سے مذہب کے تابع کردیا۔

بارھویں صدی میں شیعہ اور اسماعیلی فرقوں کے خلاف نظام الملک طوسی (وفات: 1092ء) نے مدرسہ کا ایک نظام شروع کردیا تاکہ ان مدرسوں میں سنی راسخ العقیدہ علماء کو تیار کیا جائے جو ان فرقوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو روک سکیں اس کے نتیجہ میں معاشرہ میں

بنیاد پرستی کی جڑیں اور مضبوط ہوگئیں اور دوسرے تمام علوم پر مذہبی اثرات غالب آگئے۔ تاریخ نویسی بھی اس سے نہیں بچ سکی اور تعلیمی نصاب میں اس کی اہمیت گھٹ گئی کیونکہ اسلام سے قبل کی تاریخ مذہب کے لیے مفید نہیں تھی اور اس سے مذہبی امور میں مدد نہیں ملتی تھی۔ اس لیے اس سے دلچسپی ختم ہوگئی اور اس عہد میں لکھی جانے والی تاریخیں ہجرت سے شروع ہوئیں۔ واقعات کی تعبیر و تفسیر کے بجائے انھیں محض سنہ وار لکھ کر بیان کردیا گیا۔

تاریخ نویسی کو مزید صدمہ اس وقت ہوا جب زنگیوں اور ایوبی دور حکومت میں (1227- 1250) فاطمی حکومت کے خاتمہ کے بعد سنی عقیدہ دوبارہ سے مستحکم ہوگیا اور تاریخ کو نظام تعلیم میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور اسے محض قصے و افسانے کے طور پر لیا گیا اور زیادہ توجہ قرآن و حدیث پر دی جانے لگی۔

تاریخ کی قسمیں

پچھلے صفحات میں تاریخ نویسی کے ارتقاء پر بحث کی گئی کہ کس طرح مسلمان معاشرہ کی تبدیلیوں کا اثر تاریخ نویسی پر ہوا اور تاریخ نویسی سیرت صحابہ' تبع تابعین اسلامی فتوحات سے عالمی تاریخ تک کن کن مراحل سے گزر کر پہنچی۔ جب عباسی خلافت کو زوال ہونا شروع ہوا اور خود مختار سلطنتیں ابھرنا شروع ہوئیں تو اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں اہم سیاسی و سماجی طبقات بھی پیدا ہوئے اور اس کے نتیجہ میں تاریخ نویسی کی مختلف قسمیں وجود میں آئیں' جن میں عالمی تاریخ' علاقائی یا مقامی تاریخ' شہروں کی تاریخ' حکمران خاندانوں کی تاریخ' اہم سماجی طبقوں کی تاریخ' سوانح حیات' ذاتی یادداشتیں انتظامی امور اور دستور العمل شامل تھیں' اس کے علاوہ خاص اور اہم موضوعات پر بھی تاریخیں لکھی گئیں جیسے ادبی اور سائنسی موضوعات۔

عالمی تاریخ کی اہمیت اس وقت رہی جب تک کہ عباسی خلافت اپنے عروج پر تھی اور مسلمانوں کی سیاسی طاقت متحد تھی' مگر جب یہ طاقت ٹوٹی تو اس کے ساتھ ہی عالمی تاریخ کی اہمیت بھی کم ہوگئی اور خود مختار سلطنتوں کے عروج نے حکمران خاندانوں کی تاریخ کو رواج دیا۔ ان حکمرانوں نے اپنے خاندان کی تاریخ لکھوانے کی غرض سے دربار میں

مورخوں کو ملازم رکھنا شروع کردیا اور یہ مورخ خوشامدانہ طور پر بادشاہ کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے لگے جس کی وجہ سے تاریخ نویسی میں سچائی اور صداقت کا عنصر کم ہوگیا۔ مورخ کی مجبوری یہ تھی کہ اکثر حکمران تاریخ کے مواد کو خود دیکھتے یا وہ جو لکھتا اسے سنتے تھے اس لیے مورخ کے لیے سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ اس کی تعریف و توصیف کرے۔

سیاسی تبدیلی کی وجہ سے لوگوں کی وفاداری عباسی خلافت کے کمزور ہونے کے بعد اپنے حکمرانوں سے ہوئی اوراس سے بھی گھٹ کر ان کا تعلق اور لگاؤ ان شہروں سے ہوگیا کہ جہاں وہ پیدا ہوتے اور زندگی گزارتے تھے' اس لیے سیاسی زوال کے بعد علاقائی اور شہری تاریخ لکھنے کا رواج ہوا۔ جن شہروں کی تاریخیں لکھی گئیں ان میں بغداد' موصل' اسکندریہ' بخارا' قم' اصفہان' طبرستان' واسط' ہرات' اور بیہق' شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مشہور افراد کی سوانح حیات لکھنے کا رواج ہوا۔ ان سوانح حیات کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو لکھتے وقت اسناد کو استعمال کیا گیا اور واقعات کو سنہ وار بیان کیا گیا' اور اس شخص کو کہ جس کی سوانح لکھی گئی اس کے حالات زندگی اس کی تصانیف اشعار اور اس سے متعلق اہم واقعات کو لکھا گیا۔ سوانح حیات کے ادب نے تاریخ نویسی میں اہم اضافہ کیا کیونکہ اس کے ذریعہ سے معاشرہ کی ثقافتی اورمعاشرتی تاریخ کو مواد ملا۔ اور تاریخ نویسی میں محض حکمران ہی شامل نہیں ہوئے بلکہ اس میں معاشرہ کے دوسرے طبقے بھی شامل ہوگئے۔ جن طبقوں کی سوانح حیات لکھی گئیں ان میں وزراء' امراء' محدثین' علماء' فقہا' صوفیاۃ' قضاۃ' شعرا' سائنس دان' مفکرین' عہدے دار' تاجر' حکماء' اساتذہ' مشہور خواتین اور شطرنج کے کھلاڑی وغیرہ شامل تھے' چنانچہ گیارھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک اس قسم کا ادب پیدا ہوا۔ ان میں مشہور مورخ الخطیب بغدادی' ابن خلکان' ابن الجوزی' الذہبی' بن حجر اور السخاوی شامل تھے۔ اس کی ابتداء عرب ملکوں میں ہوئی مگر بعد میں یہ ایران' ترکی' اور ہندوستان تک مقبول ہوا۔

اس ادب سے جو تاریخ نویسی میں پیدا ہوا خاص عہد کے سماجی' ثقافتی' ادبی اور سیاسی حالات کا پتہ چلتا ہے' اور معاشرہ کی ساخت' طبقاتی تقسیم' گروہ بندیاں اور ان کے سماجی رتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

فارسی تاریخ نویسی

مشرقی خلافت میں خود مختار سلطنتوں کے قیام کے بعد فارسی زبان و ادب کا احیاء ہوا اور ان کے درباروں میں تاریخ عربی کے بجائے فارسی میں لکھی جانے لگی۔ اس کی ابتداء بخارا کے ساسانی خاندان سے ہوئی' شروع شروع میں کچھ عربی تاریخ کی کتابوں کے فارسی میں ترجمہ ہوئے جن میں طبری کی تاریخ کا فارسی ترجمہ ہے جو بلعمی نے کیا۔ بعد میں ترکی حکمران خاندانوں نے جن میں غزنوی' سلجوقی اور خوارزم قابل ذکر ہیں' انہوں نے فارسی زبان کی سرپرستی کی۔

فارسی تاریخ نویسی کی یہ خصوصیت رہی کہ اس میں ابتداء ہی سے مقفیٰ و مسجع عبارت کو استعمال کیا گیا اور واقعات کو سادگی سے بیان کرنے کے بجائے عبارت آرائی کو اختیار کر کے پیچیدہ اور علامتوں و تشبیہات کے ذریعہ اظہار بیان کو اپنایا گیا۔ دقیقی اور فردوسی کی طویل نظموں کا بھی تاریخ نویسی پر اثر ہوا' خصوصیت سے فردوسی کا شاہنامہ' جس میں ایرانی جاگیردار دہقان طبقہ کی ثقافت کو دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے' اس لیے یہ اس طبقہ میں بڑا مقبول ہوا اور اسے انہوں نے ایرانی قومیت کے تحت قوم پرستی کی علامت بنا لیا۔

فارسی تاریخ نویسی میں اس وقت انقلابی تبدیلی آئی جب منگولوں نے اسلامی دنیا پر حملے کر کے انہیں تخت و تاراج کیا اور عباسی خلافت کا خاتمہ کر کے مسلمانوں کے مرکز کو توڑ دیا۔ اس کے نتیجہ میں عربی زبان اور عربی تاریخ نویسی کمزور ہوئی اور یہ گھٹ کر شام' مصر یا اسپین میں باقی رہ گئی وہ علاقے جنہیں منگولوں نے فتح کیا تھا وہاں فارسی زبان میں تاریخ لکھی جانے لگی۔

فارسی تاریخ نویسی سیاسی تبدیلی سے متاثر ہوئی۔ منگولوں کے حملے نے وسط ایشیا اور ایران کے سیاسی و تہذیبی اداروں کو ختم کر کے ان کی جگہ نئی روایات کی بنیاد ڈالی ان کے حملوں سے جاگیردار اور دہقان ختم ہوگیا اور ان کے ساتھ ہی وہ طبقے جو ایران کے قدیم کلچر کی حفاظت و سرپرستی کرتے تھے' وہ ختم ہوگئے' اور فردوسی کا شاہنامہ جو اس طبقہ کے کلچر کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کی اہمیت ختم ہوگئی اور معاشرتی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ہی تاریخ نویسی میں بنیادی تبدیلیاں آئیں' ایرانی قوم پرستی کے جذبات کمزور ہوئے اور اس کی جگہ منگول حکمران خاندان نے لے لی۔

منگول جو اپنی نسل اور قبیلہ پر فخر کرتے تھے انہوں نے فارسی میں اپنے بارے میں تاریخیں لکھوائیں۔ ان میں جوینی (وفات: 1283) کی تاریخ جہاں کشا اور رشید الدین (وفات: 1318) کی جوامع التاریخ قابل ذکر ہیں۔ جوامع التاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار غیر مسلم اقوام کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں' جن میں چینی' یہودی ہندو اور مغربی اقوام بھی شامل ہیں۔

منگولوں کے دور حکومت میں تاریخ نویسی مذہبی اثر سے آزاد ہوگئی اور اس میں سیکولر نقطہ نظر آگیا۔ لیکن جس چیز نے فارسی تاریخ نویسی کو متاثر کیا وہ اس کا محدود دائرہ اور موضوعات تھے۔ یہ محض حکمران خاندانوں کی قصیدہ خوانی کا ذریعہ بن کر رہ گئی اور اس نے معاشرہ کے دوسرے طبقوں سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ واقعات کو بیان کرنے کے لیے مشکل زبان کو استعمال کیا گیا جس کو سمجھنے والوں کا طبقہ محدود ہوتا تھا۔ اور عام پڑھا لکھا آدمی اس کے مفہوم تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ جن کی وجہ سے تاریخ نویسی محض حکمران طبقوں کی دلچسپی کا باعث بن کر رہ گئی۔ اور اس کی جڑیں عوام سے اور نچلے طبقوں سے کٹ گئیں۔

جب تیمور (1370 - 1405) برسر اقتدار آیا تو اس نے درباری مورخوں کو اپنے عہد کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا۔ یہ اپنی مہمات کی تاریخ خود لکھواتا اور پھر اسے سنتا تھا۔ اس وجہ سے مورخ صرف انہیں واقعات کو بیان کرتا کہ جس سے حکمران کو دلچسپی ہوتی اور ایسے تمام واقعات جن سے حکمران کی برائی یا کمزوری ظاہر ہوتی انہیں نظر انداز کردیا جاتا تھا۔ تیمور کے جانشینوں نے بھی تاریخ نویسی کی سرپرستی کی اور ہرات جو تاریخ نویس کا مرکز بنا' یہاں مورخوں نے درباری تاریخیں لکھیں ان میں حافظ آبرو' (وفات: 1430) میر خوند (وفات: 1498) اور اس کا پوتا خوند میر (وفات: 1535) قابل ذکر ہیں۔ خوند میر اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ ہرات کی تاریخ نویسی کی روایات کو مغلوں کی فتح کے بعد ہندوستان لایا اور مغلوں کے دور عہد میں تاریخ نویسی پر اثر انداز ہوا۔

تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ

مسلمان کی تاریخ نویسی میں تاریخ کے مختلف نظریات ملتے ہیں۔ چونکہ اسلامی تاریخ نویسی کی ابتداء سیرت سے ہوئی اور اس میں ابتدائی مسلمانوں کی فتوحات کا ذکر بھی شامل

ہے اس لیے تاریخ نویسی میں ایسے موضوعات آئے کہ جن کو بیان کرتے ہوئے مورخ ایک ڈرامائی طرز تحریر اختیار کرتا ہے۔ ان واقعات میں جب مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت کو بیان کیا جاتا ہے اور مشرکوں اور غیر مسلمانوں کی شکست کا ذکر آتا ہے تو مسلمان جذبہ ایمان سے معمور نظر آتے ہیں جو ایک مشن کی خاطر اپنی جان و مال قربان کرنے پر تیار تھے۔ شام' عراق اور ایران کی فتوحات میں عربوں کی برتری کا احساس موجود ہے کہ جنہوں نے فقر اور سادگی کے عالم میں بازنطینی و ایرانی شان و شوکت کا خاتمہ کردیا۔ ان فتوحات میں مال غنیمت کی فراوانی' دشمنوں کا ذلیل ہونا اور عربوں کی سلطنت کا وسیع ہونا شامل ہیں جو تاریخ کو نہ صرف دلچسپ بناتے ہیں بلکہ اس سے لوگوں میں جذبہ اور ولولہ بھی پیدا کرتے ہیں۔

سیرت لکھتے وقت مورخین کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی مشن تھا اور آپ کی پوری زندگی اس مشن کی تکمیل میں صرف ہوگئی' اس لیے سیرت نگاروں نے آپ کے کردار' عادات و خصائل اور کارناموں کو اس نقطہ نظر سے دیکھا' اور اس مواد کو صحت کے ساتھ محفوظ کیا تاکہ آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مذہبی طبقوں میں تاریخ اس وجہ سے اہم ہوئی کہ اس سے رسول اللہ اور صحابہ کی زندگی اورامت مسلمہ کے اجتماعی عمل کا پتہ چلتا ہے کہ جو خدا کے منصوبوں کو پورا کر رہی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ نویسی سے یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ پیغمبر خدا کے منصوبوں کو پورا کرتے ہیں' وہ قومیں جہاں پیغمبر نہیں آتے اور ان کے ذریعہ الہی قوانین نافذ نہیں ہوتے۔ ایسی قومیں بادشاہوں اور مفکرین کی عقل و دانش مندی سے راہنمائی حاصل کرتی ہیں' کیونکہ معاشرے کے لیے الہی یا بادشاہوں کے قوانین ضروری ہوتے ہیں۔ جو ان سے محروم رہتے ہیں وہ جاہلیت [illegible]

ایک نقطہ نظر [illegible] د چونکہ ایک مثالی عہد تھا اس لیے آپ کے زمانہ میں تاریخ کا [illegible] ے بعد تاریخ کے عمل نے کوئی اضافہ نہیں کیا چونکہ رسول اللہ [illegible] آپ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور نہ ہی الہی قوانین میں تغی[illegible] ے عمل سے ماورا ہیں' اس لیے تاریخ میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ اس اسا[illegible] ی تعلیمات پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ لیکن بعد میں روایات و اقدار اور معاشرتی تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرا نقطہ نظر اختیار کیا گیا کہ تاریخی عمل رسول اللہ پر آکر ختم نہیں ہوا' بلکہ مسلم امہ خدا کے منصوبوں کو مکمل

کررہی ہے' یہ سنی عقیدہ ہے کیونکہ سنی عقیدہ کے ماننے والے اکثریت میں ہیں' اور حکومت و اقتدار ان کے پاس رہا' اس لیے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ تاریخ رسول اللہ کے عہد میں آکر نہیں ٹھہرگئی بلکہ یہ ایک تسلسل ہے اور ان کی حکومت اس تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ ان کی حکومت کی قانونی و اخلاقی حیثیت اسی وقت مستحکم ہوتی جب کہ وہ تاریخ کے عمل اور اس کی حرکت کو ثابت کرتے' خلافت و ملوکیت کا قیام اور حکمران طبقوں کے مفاد کی خاطر نئے قوانین' ضابطے اور دستور اسی وقت جائز ہوسکتے تھے جب کہ تاریخ کے تسلسل' اور زمانہ کے ساتھ بدلتے ہوئے تقاضوں کو تسلیم کیا جاتا۔

شیعہ نقطہ نظر سے تاریخ نے ان کے لیے کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا' بلکہ تاریخی عمل ان کے خلاف رہا' کیونکہ بحیثیت اقلیت اور سنی العقیدہ جماعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان کی تحریک زمین دوز رہی اور علامتوں و کتابوں کے سہارے انہوں نے اپنی تحریک کو متحد رکھا' اس لیے ماضی ان کے لیے سوائے دکھوں تکلیفوں اور ناانصافیوں کے اور کچھ نہیں۔ ان کا سہارا مستقبل ہے کہ مہدی آئیں گے اور اپنی حکومت قائم کرکے دنیا میں عدل و انصاف قائم کریں گے۔

تاریخ کے مذہبی نقطہ نظر سے انسان دنیا میں خدا کے منصوبوں کی تکمیل کررہا ہے اور اس کا حساب جب ہوتا ہے کہ جب انسان قدیم اقوام کی کتابیں پڑھتا ہے اور ان کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس وقت اسے پتہ چلتا ہے کہ ہر قوم اپنے عمل سے خدا کے کسی نہ کسی منصوبہ کو پورا کررہی ہے۔ اسلام میں دوسرے اور سامی مذاہب کی طرح تاریخ کی ابتداء اور انتہا کا تصور موجود ہے۔ روز قیامت کا نقشہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ جیسے یہ واقع ہو چکا ہے اس عقیدہ کے تحت ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال کا حساب ہوگا۔ اس طرح یہ اعمال ہر فرد کی زندگی کا مستقل حصہ ہوگئے' اس احساس نے اسے اس پر مجبور کیا کہ اعمال کو لکھا جائے اور یاد رکھا جائے اس نے تاریخ کے شعور کو پیدا کیا۔

جب تاریخ نویسی میں ایرانی اثرات آئے تو اس کے ساتھ ہی ایرانی قصے' کہانیاں' حکایات' دیومالائی باتیں اور مبالغہ آمیز روایات بھی اس میں شامل ہوگئیں اور تاریخ کو اخلاقیات کا درس دینے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس مقصد کے تحت تاریخ کو مسخ بھی کیا گیا۔ تاکہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے نقطہ نظر کو صحیح ثابت کیا جاسکے۔ نظام الملک طوسی کا سیاست نامہ اس کی مثال ہے کہ جس نے غلط تاریخی واقعات سے اپنے نقطہ نظر کو صحیح

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ اور مسلم معاشرہ

اسلامی تاریخ کے طویل دور میں تاریخ نویسی میں مختلف مراحل پر بڑی تبدیلیاں آئیں اور معاشرتی سیاسی و معاشی ضرورتوں کے تحت تاریخی موضوعات پر بے انتہا تصانیف لکھی گئیں جس کی وجہ سے علم تاریخ کی ایک علیحدہ اور انفرادی حیثیت مستحکم ہوگئی اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ کو مسلمان معاشرہ میں اہمیت دی گئی اور کیا اس علم نے معاشرہ کے شعور میں کچھ اضافہ کیا؟ یا یہ علم محض قصے' کہانیوں اور واقعات کے بیان کا نام رہا اور اس کے کوئی گہرے اثر معاشرے پر نہیں ہوئے۔

ابتدائی دور میں چونکہ علم تاریخ کسی واضح شکل میں وجود میں نہیں آیا تھا اس لیے اس کی اہمیت کا بھی احساس نہیں تھا۔ عربوں کے لیے شاعری باعث افتخار تھی اس لیے اس کے مقابلہ میں وہ کسی دوسرے علم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے علوم کے بارے میں عربوں کی اطلاعات یونانی تراجم پر مبنی تھیں۔ چونکہ یونانیوں نے تاریخ کو اہم علوم میں شامل نہیں کیا اس وجہ سے عربوں کے ہاں بھی علوم کی تقسیم اسی حساب سے رہی اس وجہ سے کندی' ابن سینا' اور فارابی نے اپنی کتابوں میں تاریخ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بعد میں جب حالات بدلے اور تاریخ کا علم باقاعدہ شکل میں آیا اس وقت بھی اس کی حیثیت دوسرے علوم کے برابر نہیں ہوئی مشہور رسائل اخوان الصفا میں تاریخ کا ذکر سب سے آخر میں آیا ہے۔

اس وجہ سے تاریخ کے بارے میں علماء و مفکرین کا نقطہ نظر بڑا محدود تھا' اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسلام سے قبل کی تاریخ کا تعلق چونکہ دور جہالت سے ہے لہٰذا اس کے مطالعہ سے کوئی فائدہ نہیں' اس لیے صرف مسلمانوں کی تاریخ پڑھنا چاہئے کیونکہ اس تاریخ کی سچائی اور صداقت کی شہادتیں موجود ہیں۔

تاریخ کی کمتری کا احساس اس سے ہوتا ہے کہ اسے کسی نے بحیثیت پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ اکثر مورخ یا تو دربار کے عہدے دار ہوا کرتے تھے یا علماء و فقہاء جو اپنی روزی دوسرے ذرائع سے حاصل کرتے تھے اور ان کی اپنی شہرت بھی ان کے عہدوں یا پیشوں کی

وجہ سے تھی، مثلاً طبری کی شہرت اس کے اپنے وقت میں مورخ سے زیادہ مفسر اور عالم کی تھی یا ابن خلدون جو قاضی کے عہدوں پر فائز رہا۔

بعد میں جب خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں تو حکمرانوں نے دربار میں باقاعدہ مورخ ملازم رکھے جن کا کام حکمران کے عہد کے تاریخ لکھنا ہوتا تھا۔ لیکن یہ کام انہیں اپنے انتظامی عہد کے ساتھ اضافی طور پر ملتا تھا۔

اسلامی معاشرے میں مختلف فرقوں کے وجود میں آنے کے بعد انہوں نے تاریخ کے ذریعہ اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنا چاہا اور اس کے لیے انہوں نے تاریخ سے مدد لی۔ اس رجحان کی وجہ سے تاریخ پر مذہب کا غلبہ ہوگیا اور ابن حزم کے قول کے مطابق تاریخ کے ذریعہ مذہب کو سمجھا جانے لگا، اور یہ مذہب کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی۔ تاریخ پر مذہب کے اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ہیئت و ساخت بدل گئی اور ہر فرقہ نے اپنے عقائد کے مطابق واقعات کو مسخ کرنا شروع کردیا جس کی وجہ سے تاریخ کی صداقت و سچائی متاثر ہوئی اور اس کے زیر اثر تعصب و نفرت سے بالاتر ہو کر واقعات کی جانچ اور پرکھ ختم ہوگئی اور تاریخ یا تو عقیدت و ثواب کی خاطر لکھی جانے لگی یا اس میں نفرت و تعصب کے جذبات آگئے اور کسی مسلمان مورخ کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ واقعات کو مذہبی عقائد سے علیحدہ کرکے ان کی تاریخی حیثیت سے بحث کرسکے۔ مذہبی اثرات کے تحت لکھی جانے والی تاریخیں وعظ و اخلاق کا مجموعہ بن کر رہ گئیں اور اس سے مادی انسان اور اس کا دنیاوی عمل مفقود ہوگیا۔

شاہی خاندانوں اور حکمران طبقوں کی تاریخ لکھنے کی وجہ سے تاریخ کا ایک مقصد یہ ہوا کہ اس کے ذریعہ سے بادشاہوں، شہزادوں اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے داروں کی سیاسی تربیت ہو اس لیے تاریخ میں انہیں موضوعات کو لیا گیا جن سے ایک محدود طبقہ فائدہ اٹھائے، مثلاً جنگی حربے، فوج کی تنظیم، انتظام سلطنت، دربار کی رسومات، اور سازشیں و سیاسی چالیں وغیرہ، اس کی وجہ سے تاریخ محدود ہو کر صرف حکمران طبقوں کے لیے رہ گئی۔

لیکن عربی تاریخ نویسی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دائرہ وسیع رہا اس میں حکمرانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف طبقوں کی تاریخ بھی ہے، اور اس وجہ سے معاشرہ کو وسیع نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں فارسی تاریخ نویسی صرف بادشاہوں اور دربار تک محدود رہی اور دوسرے طبقوں کو بالکل نظر انداز کردیا،

اس لیے فارسی تاریخوں میں پورا معاشرہ اور اس کی سرگرمیاں نہیں صرف حکمران طبقے ہیں۔

جدید دور کی تاریخ نویسی

موجودہ زمانہ میں مختلف اسلامی ملکوں میں جو تاریخ لکھی جارہی ہے' اب وہ صرف اپنے اپنے ملکوں تک محدود ہے' یعنی مصری' شامی' عراقی' ترکی' اور ایرانی اپنے ملکوں کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ وطن پرستی' یا قوم پرستی کے تحت ان ملکوں نے اپنے ملکوں کے ماضی کی تاریخ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے' اس لیے مصری فراعنہ کی تہذیب پر فخر کرتے ہیں تو شامی و عراقی اسیری و سمیری تہذیب سے اپنی جڑیں ملاتے ہیں۔ تاریخ میں مذہب کے بجائے سیکولر نقطہ نظر غالب آگیا ہے۔ اس وجہ سے ان ملکوں میں لسانی اور ثقافتی اقلیتیں اس کا ایک حصہ بن گئی ہیں اور انہوں نے مل کر وطن اور قوم کی تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل شروع کردی ہے' مثلاً" لبنان کے عیسائیوں نے جدید تاریخ نویسی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اسلامی ملکوں میں اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی ہر ملک اپنی تاریخ و روایات کے تحت کررہا ہے یعنی مصر میں اسلام' یا ترکی میں اسلام' اور ان ملکوں میں اسلام نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے اس کا تجزیہ کیا جارہا ہے۔ نو آبادیاتی نظام' اس کے خلاف تحریک آزادی' اور دوسری جنگ عظیم کے بعد جو سیاسی تبدیلیاں آئیں ان سے جدید تاریخ نویسی متاثر ہوئی ہے اور اس کا حلقہ و دائرہ اب وسیع ہوگیا ہے۔

○

باب نمبر 4

برصغیر کی تاریخ نویسی

ہندوستان میں تاریخ نویسی کی روایات مسلمان اپنے ساتھ لائے جب تک مسلمانوں کا تعلق ہندوستان سے تجارتی رہا اس وقت تک انہیں اس ملک کے فلسفہ مذہب' طب نجوم اور علوم و فنون سے دلچسپی رہی اور ان کی سیاسی تاریخ کے بجائے ہندوؤں کی سماجی و معاشرتی زندگی کے بارے میں لکھا' لیکن جب انہوں نے یہاں سیاسی اقتدار حاصل کرلیاتو ان کے رویہ میں تبدیلی آگئی اور ان کی دلچسپی ان کی تاریخ اور علوم سے باقی نہیں رہی۔

محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سے سندھ میں عربوں کی حکومت قائم ہوگئی اور سندھ بنو امیہ کی خلافت کا ایک حصہ بن گیا' سندھ کی فتوحات کی معلومات عربی مورخوں کے ہاں ملتی ہیں' لیکن یہ معلومات اس لیے محدود رہیں کہ یہ مورخین سندھ کے بارے میں باہر رہتے ہوئے لکھ رہے تھے۔ سندھ کی تاریخ کے بارے میں پہلی کتاب چچ نامہ یا فتح نامہ ہے جسے علی کوفی نے ناصرالدین قباچہ (1206' 1228) کے زمانہ میں عربی سے فارسی میں ترجمہ کی۔ چونکہ اس کے عربی مصنف کا نام معلوم نہیں ہوسکا اور نہ ہی اس کتاب کا کوئی اور دوسرا نسخہ دستیاب ہوا' اس لیے نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کس حد تک حقیقی تصنیف ہے اور کس حد تک اس میں مترجم نے ترامیم کی ہیں۔ کتاب میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ایسے قصے اور کہانیاں بھی موجود ہیں کہ جو ناقابل یقین ہیں اور جن کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ اس نے چچ نامہ کو بحیثیت تاریخ کے ماخذ کے بڑا کمزور کردیا ہے۔ خصوصیت سے رائے اور برہمن خاندانوں کے بارے میں جو عربوں کی فتح سے پہلے سندھ کے حکمران تھے کوئی مصدق معلومات نہیں اور اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کے ماخذ کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ اس نے یہ معلومات کہاں سے فراہم کیں چچ نامہ کی اہمیت اس وقت ہوسکتی ہے جب کہ دیبل' اور برہمن آباد کے آثاروں کو دریافت کیا جائے اور وہاں سے جو معلومات ملیں ان کی بنیاد پر سندھ کی تاریخ کی تشکیل کی جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ نویسی کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب غزنویوں اور غوریوں نے ہندوستان پر حملے کیے اور ان کے درباری مورخوں نے ان حملوں اور ہندوستان میں ہونے والی جنگوں کے بارے میں لکھا۔ اس دور میں بھی مورخین کا مرکز غزنہ تھا۔ اور وہ وہاں سے بیٹھ کر ہندوستان کے بارے میں لکھ رہے تھے' چونکہ وہ درباری مورخ تھے اس لیے ان کا مرکز سلطان کی شخصیت تھی' دوسرے انہوں نے ہندوؤں کے نقطہ نظر کو بالکل نظرانداز کردیا۔

قطب الدین ایبک نے جب دہلی میں اپنی سلطنت قائم کرلی اس وقت بھی اس کی وفاداری کا مرکز غور اور غزنی رہا۔ یا خلیفہ کے نام کو خطبہ میں پڑھوا کر اس سے اظہار وفاداری کیا جاتا رہا۔ اس وجہ سے تاریخ نویسی کا مرکز مکمل طور پر ہندوستان میں قائم نہیں رہا اور مورخین ہندوستان کی تاریخ کو اسلامی تاریخ کے تسلسل میں لکھتے رہے۔ ان کی تاریخ نویسی کی روایات اسلامی ممالک کے مورخین کی تھیں' وہ تاریخ کی ابتداء تخلیق کائنات اور حضرت آدم سے شروع کرتے' اس کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ بیان کرتے' پھر مختلف علاقوں اور ملکوں میں مسلمانوں کی حکومتوں کا ذکر ہوتا اس کے بعد ہندوستان کی فتح اور یہاں مسلمان حکمران خاندانوں کے قیام اور ان کے حالات ہوتے' اس کی سب سے اچھی مثال منہاج سراج (70-1269) کی طبقات ناصری ہے کہ جس میں وسط ایشیا' ایران' اور افغانستان کے مقابلہ میں ہندوستان کی تاریخ کو مختصراً" بیان کیا گیا ہے۔ اس قسم کی تاریخ میں کہیں بھی قدیم ہندوستان کی تاریخ نہیں ہے اور نہ ہی ہندو مذہب' فلسفہ' اور ان کے علوم کے بارے میں کچھ لکھا گیا۔ تاریخ نویسی میں بھی برصغیر کے مسلمان معاشرہ کی جھلک ملتی ہے کہ اس نے اپنی وفاداری کے مرکز کو ہندوستان سے باہر رکھا اور خود کو امت مسلمہ کا ایک حصہ سمجھتا رہا اور ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے کے باوجود اس ملک کی قدیم تاریخ اور ثقافت میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

ہندوستان میں سلاطین کے سیاسی اقتدار قائم ہونے کے ساتھ ہی یہاں دربار میں ایرانی روایات اور ادارے قائم ہوئے۔ انہیں میں درباری مورخ کے تقرر کا بھی رواج تھا۔ چونکہ حکمران اپنی برتر حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ

اس کے دور حکومت کی اصلاحات اور کارنامے تاریخ میں محفوظ ہوں۔ یہ تاریخ لکھنے والے صرف درباری مورخ ہی نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ شاہی عہدے دار اور علماء بھی ہوا کرتے تھے' لیکن ان کا تعلق چونکہ حکمران طبقوں سے ہوا کرتا تھا اس لیے تاریخ لکھنے کا مقصد حکمران کی خوشنودی ہوا کرتا تھا۔

ان مورخین کے ہاں بھی اسلامی تاریخ نویسی کی تقلید نظر آتی ہے۔ یہ بھی اپنے عہد سے پہلے کی تاریخ لکھتے ہوئے ماخذوں پر بھروسہ کرتے تھے' اور بغیر تحقیق و تجزیہ کے ان ماخذوں کی روایات اور بیانات کو تسلیم کرلیتے تھے' اس لیے صرف ان واقعات کو جو معلوم ہوتے تھے انہیں بار بار دہرایا جاتا تھا' اور نئے مواد کی تلاش و جستجو نہیں کی جاتی تھی اور نہ موجودہ مواد میں اضافہ کا سوچا جاتا تھا' مورخ کا کام محض منشی کا تھا محقق کا نہیں وہ صرف ان معلوم واقعات کو یا تو بڑھا چڑھا کر بیان کردیتا تھا یا انہیں مختصر کردیتا تھا۔ ان واقعات کے بارے میں اس کی اپنی کوئی رائے یا فیصلہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس لیے ان کی تاریخ میں صرف اس حصہ کی اہمیت ہوتی تھی جو ان کے اپنے عہد کا ہوتا تھا' چونکہ ہم عصر تاریخ کی بنیاد اس کے مشاہدہ پر ہوتی تھی یا واقعات میں حصہ لینے افراد کی شہادتیں ہوتی تھیں' اور دربار کے مورخ کو شاہی فرامین' حکم نامے اور دستاویزات کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا اس لیے ہم عصر تاریخ کا بیان اہم ہوجاتا تھا حالانکہ اس میں بھی مورخ کی پسند و ناپسند اور اس کے ذاتی نقطہ نظر کی وجہ سے واقعات کے بیان میں جو تعصب آجاتا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سلاطین کے عہد میں جو تاریخ لکھی گئیں وہ موضوع کے اعتبار سے اپنے عہد کی عکاسی کرتی ہیں۔ کیونکہ اس پورے عہد میں سلاطین اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے جدوجہد کررہے تھے جس میں ہندو مسلم تصادم ایک اہم عنصر تھا۔ اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے انہیں مسلسل ہندو حکمرانوں سے جنگیں لڑنا پڑ رہی تھیں' خون ریز اور مزاحمتی جنگیں جو نہ صرف ان کی بقا کے لیے ضروری تھیں بلکہ ان مسلمانوں کے لیے بھی جنہوں نے ہندوستان میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ ان جنگوں میں فتوحات ہمیشہ انہیں اپنی برتری کا احساس دلاتی تھیں۔ اس لیے مسلمان مورخ صرف مسلمان حکمرانوں اور امراء کے کارنامے بیان کرتے ہیں اور جنگ میں ہندوؤں کی شکست اور ان کے مندروں کی تباہی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمان عوام میں اعتماد پیدا ہو اور ہندوؤں کا ڈر ان میں نہ رہے۔

عام طور سے ان فتوحات کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ فتح کی وجہ سے قوم کی بہادری اور ان کی اخلاقی برتری ہو۔ اس کے پس منظر میں مفتوح قوم کے معاشرہ اور ٹوٹ پھوٹ اور ان کی کمزوریوں کو بیان نہیں کیا جاتا اور یہ نہیں بتایا جاتا کہ مقابلہ برابر کے حریفوں میں نہیں بلکہ طاقت ور اور کمزور میں تھا' اور اس میں فتح یقیناً" طاقت ور کی ہوئی تھی۔

چونکہ یہ جنگیں ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی بقا کی جنگیں تھیں اس لیے جن افراد نے ان جنگوں میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے اور وہ تمام سلاطین جنہوں نے ہندوؤں کو مسلسل شکستیں دیں' وہ برصغیر میں مسلمان معاشرہ کے ہیرو ہوگئے۔ عہد سلاطین کی ابتدائی تاریخوں میں یہ تصادم اور جنگ و مزاحمت کا ڈرامہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ قطب الدین ایبک' التمش' بلبن' اور علاؤالدین انہی فتوحات کے نتیجہ میں اہم حکمران بن کر ابھرے۔

ان کے مقابلہ میں وہ حکمران جنہوں نے میدان جنگ کی بجائے محلات میں آرام و آرائش کی زندگی اختیار کی' وہ مسلمان جماعت کے لیے آئیڈیل نہیں بن سکے۔

کیقباد' جلال الدین خلجی اور فیروز شاہ تغلق کے ان پہلوؤں پر کہ انہوں نے جنگ میں کمزوری دکھائی اور نرمی برتی' مورخوں کے ہاں تنقید ملتی ہے۔

اس دور کی تاریخ نویسی کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بادشاہ اور حکمران کی شخصیت معاشرہ کی حفاظت کے لیے انتہائی ضروری نظر آتی ہے۔ اس لیے بادشاہ کی ذات صرف خوبیوں اور نیکیوں کا مرقع ہے' یہاں تک کہ اس کی کمزوری میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی پنہاں ہے۔ تاریخ میں ان کی تعریف و توصیف مبالغہ کی حد تک ہوتی ہے اس کی مثال شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی' اور نہ معلوم مصنف کی سیرت فیروز شاہی میں ہے۔ چونکہ بادشاہ کی ذات پر پورے تاریخی عمل کی بنیاد رکھی جاتی تھی' اس لیے کوئی ایک عہد اس لیے اچھا تھا' کہ بادشاہ اچھا تھا' اور ایک عہد اس لیے خراب تھا کہ اس میں بادشاہ خراب تھا۔ ان حکمرانوں کا ذکر تاریخ میں اس طرح سے کیا گیا ہے کہ وہ مکمل انسان تھے اور انہوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے نہ کہ معاشرہ کی وجہ سے مثلاً" علاؤالدین کی معاشی اصلاحات کو برنی نے اس طرح سے لکھا ہے کہ جیسے وہ اس کی ذاتی خواہشات اور مرضی سے عمل میں آتی ہوں اور ان کی کامیابی میں نہ تو عوام نے کوئی حصہ لیا ہو' اور نہ حالات نے معاشرہ اور عوام کا کردار ان تاریخوں میں خاموش تماشائی کا ہے جو

جذبہ' جوش اور ولولہ سے محروم ہے اور جو بھی حکمرانوں کی طرف سے آتا ہے اسے قبول کرلیتا ہے۔

عہد سلاطین کی تاریخ میں ایک اہم موضوع صوفیا اور ان کا کردار ہے چونکہ عہد سلاطین میں صوفیاء کی معاشرہ میں اہم حیثیت تھی اور مسلمان اگر ایک طرف سلطان کی جانب سیاسی پناہ کی غرض سے دیکھتا تھا تو دوسری جانب صوفیاء اس کے لیے روحانی راہ نما تھے اس طرح سے سلطان اور صوفی کی شخصیتیں مسلمان معاشرہ کی اجتماعی ہیئت کو برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ جہاں سلطان ناکام ہوجاتا تھا وہاں صوفی روحانی طاقت کے ذریعہ مسلمان معاشرہ کا دفاع کرتا تھا۔ لہٰذا اس پورے عہد میں تاریخ نویسی میں صوفی دشمن سے دفاع کرنے' جنگ میں فتح دلانے' اور معاشرہ میں خوش حالی قائم رکھے نظر آتا ہے۔ ضیاء الدین برنی کی تاریخ میں نظام الدین اولیاء اگر ایک طرف منگولوں کے حملے سے دہلی کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری جانب ان کی شخصیت کی وجہ سے ملک میں خوش حالی کا دور دورہ ہے۔

سلطان اور صوفی کی شخصیتوں کے درمیان عوام کا کوئی کردار تاریخ نویسی میں ابھر کر نہیں آتا۔ عوام خاموش' ساکت' منجمد' بے عمل' اور بیکار افراد کا جم غفیر ہے جنہیں سلطان اور صوفی کی شخصیتیں ہدایت دیتی ہیں۔ احکامات جاری کرتی ہیں اور انہیں ہر مصیبت سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ سلطان کی فیاضی' مہربانی ہے کہ وہ رعیت کو انصاف فراہم کرتا ہے۔ صوفی کی نیکی اور تقویٰ ہے کہ وہ انہیں برائی سے بچا کر اچھائی کی جانب لے جاتا ہے' عوام کا اپنا کوئی شعور سوچ اور فکر نہیں۔

سلطان کے راہنمائی کے کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے مورخ جگہ جگہ اس کو نصیحت کرتا ہے' یہ نصیحت سیاست نامہ اور قابوس نامہ کے طرز کی ہے۔ ضیاء الدین برنی کی تاریخ جو 1357ء میں لکھی گئی وہ نہ صرف مسلمان حکمران طبقوں کے ذہن کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ اس میں ان طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے وہ سلطان کو برابر نصیحتیں بھی کرتا ہے اور اس بات کو بار بار دہراتا ہے کہ حکومت میں اعلیٰ عہدے صرف اعلیٰ اور شریف افراد کو دیئے جائیں' مذہبی لوگوں کی سرپرستی کی جائے' ذلیل و کمینہ افراد کو دور رکھا جائے۔ مذہبی امور کی حفاظت کی جائے اور شریعت کو نافذ کیا جائے' بادشاہت کا وقار طاقت و قوت' فیاضی اور سخاوت میں ہے' لہٰذا ان خوبیوں کو برقرار رکھا جائے۔ برنی اور سلاطین کی

تعریف کرتا ہے جنہوں نے طبقہ اعلیٰ کے مفادات کا تحفظ کیا جیسے بلبن اور التمش' وہ محمد تغلق کا اس وجہ سے سخت مخالف ہے کہ اس نے ان روایات کو توڑا اور اسی وجہ سے وہ بحیثیت حکمران کے ناکام ہوا۔

برنی سخت مذہبی ہونے کی وجہ سے تمام سیکولر ذہن کے افراد کے خلاف ہے اس کی تاریخ میں اس کے مذہبی عقائد کی چھاپ ہے' سزا و جزاء' شاہی حکمران خاندانوں کا عروج و زوال اور ہندو مسلم تصادم اس کی تاریخ کے ڈرامائی عناصر ہیں جنہیں وہ بڑی خوبصورتی اور آہنگ کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کے ہاں صوفی کی شخصیت سلطان سے بڑھ جاتی ہے' جلال الدین خلجی کے دربار میں سیدی مولا کے قتل کو بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے اور بالاخر اس کی سزا جلال الدین کو ملی۔ نظام الدین اولیاء کا ہنوز دلی دور است والا واقعہ صوفی کو سلطان پر افضل کردیتا ہے۔

صوفیاء کے کردار کو مزید ان کے مکتوبات' ملفوظات اور اقوال کے ذریعہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ امیر حسن سجزی کی فوائد الفواد' امیر خورد کی سیر الاولیاء حمید قلندر کی خیر المجالس اور سید جلال الدین بخاری کی جوامع العلوم ان چند کتابوں میں سے ہیں جن میں ان کی کرامات اور مافوق الفطرت کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ بہت سے جدید مورخوں نے ان ماخذوں کی شہادتوں کو تو بغیر کسی تحقیق و تجزیہ کے تسلیم کرلیا ہے اور صوفیوں کے محیر العقول واقعات اور ناقابل فہم قصے و کہانیاں تاریخ میں شامل کرکے ان کی شخصیتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے جس کی وجہ سے تاریخ نویسی بے انتہاء متاثر ہوئی۔

سلطان اور صوفی کے بعد تاریخ میں امراء اور علماء کا تذکرہ ہے۔ وہ امراء جو سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور حکومت کے اداروں میں باعمل تھے یہ رعیت اور سلطان کے درمیان بطور رابطہ کام کرتے تھے۔ علماء و فقہا سلطنت کے امور میں بطور قاضی' صدر' شیخ الاسلام اور مفتی کے شرکت کرتے تھے' اس لیے تاریخ نویسی سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ تاریخی عمل شخصیتوں کی وجہ سے حرکت کرتا ہے اور یہی واقعات و حالات کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔ حالات کے پس منظر میں سماجی و معاشی اور سیاسی قوتوں کا کوئی ذکر نہیں۔

اس تاریخ نویسی سے مورخوں کے اپنے مفادات ظاہر ہوتے ہیں' کیونکہ ان میں سے اکثر کا تعلق طبقہ اعلیٰ سے تھا۔ اس لیے ان کی ہمدردیاں اسی طبقہ سے تھیں اور تاریخ نویسی کے ذریعہ وہ حکومتی ڈھانچہ کو اسی حالت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے' حکومت و سلطنت کے

خلاف بغاوت ان کے نزدیک سخت جرم تھا۔ اس لیے انہوں نے باغیوں کے لیے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں' اور ان کی بغاوت کے پس منظریا ان کے مطالبات کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے۔

عہد مغلیہ میں تاریخ نویسی

ہندوستان میں مغل حکومت قائم ہونے کے ساتھ ہی تاریخ نویسی میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ سب سے بڑی تبدیلی تو یہ تھی کہ اب تاریخ محض ہندو مسلم تصادم و کش مکش کا بیان نہیں رہی کیونکہ مغلوں نے ہندوستان مسلمان حکمران سے لڑ کر فتح کیا تھا' اور بعد میں بھی انہوں نے جو جنگیں لڑیں وہ ہندوؤں اور مسلمان دونوں سے تھیں۔ اگرچہ مورخین جو جنگیں ہندوؤں سے ہوئیں انہیں جہاد ثابت کرتے رہے مگر دوسری طرف مسلمانوں سے تصادم کو وہ واضح طور پر بیان نہیں کرسکے اور اسے بغاوت و سرکشی سے تعبیر کرتے رہے۔

مغل تاریخ نویسی کی دوسری خصوصیت مغل امپریل ازم کی حمایت ہے اکبر کے دور سے جو مغل سلطنت کو وسعت ہوئی اور صوبائی سلطنتوں کو فتح کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو مورخوں نے ان کے حکمرانوں اور ان کی سلطنتوں کی خرابیاں بیان کرنا شروع کردیں اور مغل فتوحات اور ان علاقوں پر ان کے قبضے کو جائز قرار دیتے رہے۔ وہ مغل فتوحات کو رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

چونکہ مغل حکمران فتوحات اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے بہت طاقت ور ہوگیا تھا اور اس کی عظمت بہت بڑھ گئی تھی' اس لیے وہ ہندوستان میں خود کو خلیفہ سمجھتا تھا اور عثمانیوں کے حق کو تسلیم نہیں کرتا تھا' ہندوستان میں مسلمان معاشرہ مغل بادشاہ کو اپنا محافظ سمجھتا تھا اور اپنی حفاظت کے لیے باہر کی جانب نہیں دیکھتا تھا' اس حیثیت میں مغل بادشاہ سیاسی اور روحانی طور پر طاقت ور بن کر ابھرا۔ اسی لیے مورخین نے اس کی ذات کے ساتھ کراماتیں منسوب کردیں۔

بادشاہ کی سیاسی اور روحانی طاقت کی وجہ سے اس عہد کی تاریخ نویسی میں صوفیاء کا کردار گھٹ گیا اور تاریخی عمل میں ان کی شرکت کم ہوگئی۔ جس طرح وہ عہد سلاطین میں

حکمرانوں پر حاوی تھے اور فتح و شکست کے ذمہ دار تھے، عہد مغلیہ میں ان کی وہ حیثیت نہیں رہی اور وہ ایک محدود دائرے میں مصروف عمل رہے جہاں اکثر انہیں مغل بادشاہوں کی سرپرستی کی ضرورت ہوتی اور ان سے مدد معاش کے متوقع ہوتے تھے۔

سلطنت کی وسعت اور طاقت کے ساتھ مغل امراء کی طاقت اور شان و شوکت بھی بہت بڑھ گئی تھی اور وہ اکثر صوبائی حکمرانوں سے زیادہ مال و دولت کے مالک ہوتے تھے اور اکثر مورخوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس لیے مغل عہد کی تاریخ میں ان امراء کی بہادری، شجاعت، فیاضی اور سخاوت کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان امراء کے تذکرے علیحدہ بھی لکھے گئے جیسے ذخیرۃ الخوانین، تذکرۃ الامراء اور ماثر الامراء، یا ان کے خاندانوں پر علیحدہ سے کتابیں لکھی گئیں جیسے عبدالباقی نہوندی نے عبدالرحیم خان خاناں کے خاندان پر ماثر رحیمی لکھی یا نعمت اللہ ہروی نے نے خان جہاں پر تذکرہ خان جہان لکھا۔

اکبر کا عہد اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ ایک مسلمان بادشاہ نے یہ کوشش کی ہندو مسلم اتحاد کو فروغ ملے اور طاقت و اقتدار کی بنیاد ہندوستانی روایات پر ہو۔ لہٰذا اس دور کی تاریخ نویسی میں بھی سیکولر رجحانات نظر آتے ہیں۔

ان رجحانات کی نمائندگی ابوالفضل (وفات: 1602) نے بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے اس کے ہاں انسان برادری کا نقطہ نظر ہے کہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ثقافتی رشتوں میں منسلک ہیں اور مذہبی اختلافات کے باوجود معاشرتی یک جہتی اور ہم آہنگی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی تاریخ میں ہندو اور مسلمان تصادم نہیں، بلکہ انتشار اور استحکام کے درمیان ایک کش مکش ہے، مغل حکومت استحکام کی علامت ہے جب کہ اس کے مخالفین انتشار، کے اس لیے اس نے مغل فوجیوں کے لیے "مجاہدین اقبال" اور "غازیان دولت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور انہیں غازیاں اسلام یا مجاہدین اسلام نہیں کہا۔ ابوالفضل اپنے پیش مورخوں کی طرح صرف مسلمان بادشاہوں کے کارنامے بیان نہیں کرتا، بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ اور ان کے فلسفہ کو جاننا انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔ ابوالفضل کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ہم عصر تاریخ لکھتے وقت سرکاری دستاویزات اور کاغذات کے ساتھ ساتھ زبانی تاریخ سے بھی مدد لی ہے۔

اس نے تاریخ کے دائرہ کو وسعت دی اور سیاست کے ساتھ ساتھ سماجی، انتظامی، ثقافتی اور معاشی پہلوؤں پر بھی لکھا ہے۔

تاریخ نویسی کی ایک اور اہم تبدیلی نظام الدین احمد بخشی کی طبقات اکبری ہے اس نے صرف ہندوستان کی تاریخ لکھی اور پچھلے مورخین کی پیروی نہیں کی کہ جو اسلامی تاریخ کو نقل کر دیتے تھے۔ یہ بھی اکبر کے عہد کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنی جڑیں یہیں پیوست کرنی چاہئیں اور باہر اسلامی ملکوں کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے ان کی وفاداری کا مرکز ہندوستان ہونا چاہیے عالم اسلام نہیں۔ اکبر ہی کے عہد میں عبدالقادر بدایونی (وفات: 1540) اس مذہبی گروہ کی نمائندگی کر رہا تھا جو حکومت کی سرپرستی سے محروم مذہبی اثر اور غلبہ کو ختم ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے اس کی تاریخ مذہبی اقدار کے زوال کا مرثیہ ہے' اس نے جہاں ضروری سمجھا اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے واقعات کو مسخ بھی کر دیا۔

جہاں گیرو شاہ جہاں کے عہد میں تاریخ نویسی ایک بار پھر روایاتی بنیادوں پر آگئی۔ اس دور کی اکثر تاریخیں درباری مورخوں نے لکھیں۔ عالم گیر نے گیارہ سال تک محمد کاظم سے عالمگیر نامہ لکھوایا اور اس کے بعد دربار سے تاریخ نویسی کو ختم کر دیا۔ جادو ناتھ سرکار کے مطابق اس حکم کے پس منظر میں اس کی مالی مشکلات تھیں مگر اس سے زیادہ اس کے عہد کا سیاسی انتشار اور سماجی و معاشرتی عدم استحکام تھا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ دربار کی سازشیں امراء کی کمزوریاں اور حکومت کی بدعنوانیاں تاریخ میں محفوظ ہوں' اور شاید وہ تاریخ سے اس لیے بھی خوف زدہ ہو کہ اس نے بھائیوں اور باپ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہو جائے گا اور تاریخ کا فیصلہ یقیناً" اس کے خلاف ہو گا۔

اس پورے عہد کی تاریخ نویسی کی یہ خصوصیت رہی کہ مورخوں نے انتہائی مشکل ادق اور پیچیدہ زبان کو استعمال کیا ہے اور واقعات کو صاف لکھنے کے بجائے علامتوں تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ زبان' محاورے اور عبارت آرائی پر زیادہ زور دیا گیا ہے جس نے عبارت کو مشکل بنا کر بعض اوقات بے معنی کر دیا ہے خصوصیت سے ابوالفضل کی زبان و عبارت انتہائی پیچیدہ ہے' بعد کے مورخین نے اس کی پیروی کی اور تاریخ نویسی کو مشکل بنا دیا۔

ان تاریخوں میں محض واقعات کو بیان کیا گیا ہے' ان کا تجزیہ نہیں کیا' معاشرہ کے ثقافتی و سماجی پہلوؤں پر کم توجہ دی زیادہ تر سیاست پر لکھا اور اس میں بھی تاریخی عمل کو متحرک رکھنے میں شخصیتیں باعمل ہیں' عوام محض خاموش تماشائی ہیں۔

آخری عہد مغلیہ میں تاریخ نویسی

آخری عہد مغلیہ کا انتشار سیاسی بے چینی، عدم استحکام، تحفظ کا فقدان اور لاقانونیت اس عہد کی تاریخ نویسی میں بھی نظر آتی ہے۔ عہد سلاطین اور مغل عہد تک تاریخ نویسی پر شخصیتیں چھائی ہوئی تھیں، لیکن آخری عہد مغلیہ میں ایک طرف تو بادشاہ سیاسی طور پر کمزور ہوا تو دوسری طرف امراء سیاسی بحرانوں اور انتشار پر قابو نہیں پاسکے تو تیسری طرف صوفیاء اور علماء کا طبقہ معاشرے کے زوال کے عمل کو نہیں روک سکا۔ اس لیے اب تک جو شخصیتیں تاریخ ساز سمجھی جاتی تھیں وہ بحرانوں کے سامنے بے بس ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا سحر اور جادو ٹوٹ گیا، وہ مافوق الفطرت ہستیوں سے تبدیل ہو کر عام انسانوں میں شامل ہوگئیں۔ اب تک ان کی ذات تنقید سے بالا تر تھی مگر اب ان کے ہر عمل اور حرکت پر تنقید ہونے لگی اور صرف تنقید ہی نہیں بلکہ وہ طنز و استہزا کا بھی شکار ہونے لگیں۔

بادشاہ جو اب تک سیاسی و روحانی طور پر مطلق العنان تھا وہ اس دور انتشار میں امراء سے تصادم کے نتیجہ میں اپنی برتری ختم کر بیٹھا۔ اب اس کی مالی حالت بھی اس قابل نہیں تھی کہ وہ درباری مورخوں کی سرپرستی کرسکتا لہٰذا مورخ دربار سے آزاد ہو کر بادشاہ اور اس کے امراء پر تنقید کرنے لگے اور انہیں موجودہ مسائل پر مورد الزام ٹھہرانے لگے یہاں تک کہ ان کی نجی زندگی بھی ان کی تنقید سے نہیں بچ سکی۔

دربار کے اثر و رسوخ سے آزاد ہونے کے بعد اس کی عہد کی تاریخ اب محض سیاسی واقعات کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ جب مورخ دربار سے نکلا اور تلاش معاش میں در بدر مارا مارا پھرنے لگا تو اس وجہ سے اس کا مشاہدہ وسیع ہوا اور وہ مراعات یافتہ طبقہ سے نکل کر عوام کی سطح پر آگیا۔ اس لیے اب اس نے جو تاریخ لکھی اس میں سیاسی واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سماجی و معاشرتی اور معاشی زندگی بھی ہے اس کی مثال مرشد قلی خاں کی مرقع دلی سے دی جاسکتی ہے کہ جس میں اس نے محمد شاہ کے زمانہ کی دہلی اس کی زندگی اور اس کی ثقافت کی بڑی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔

مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مرہٹہ' جاٹ' سکھ اور راجپوت اقوام قومی جذبہ کے ساتھ ابھریں اور انہوں نے اپنی اپنی قوموں کی قدیم اور ہم عصر تاریخ کی تشکیل کی طرف توجہ دی جس کے نتیجہ میں تاریخ نویسی میں ایک اہم تبدیلی آئی اور اس میں قومی جذبہ و فخر کا عنصر شامل ہوگیا اس زمرے میں خود مختار ریاستیں بھی آجاتی ہیں جیسے اودھ' رامپور' اور میسور وغیرہ کہ جن کے نوابوں اور راجاؤں نے اپنی ریاستوں کی تاریخ اپنی سر پرستی میں لکھوائی۔

اس سیاسی انتشار کے زمانہ میں لوگوں کی وفاداریاں مرکز سے ٹوٹ کر اپنے اپنے علاقوں میں محدود ہوگئیں' مغل بادشاہوں اور اس کی سلطنت ان کے لیے اب باعث فخر نہیں رہی بلکہ ان کے علاقے اور اس کا حکمران ان کے لیے پناہ گاہیں بن گئی اور وہ جہاں پیدا ہوئے تھے اور جہاں ان کی رہائش تھی' ان کا وہ وطن اور آبائی شہر ان کی توجہ کا مرکز بن گیا' اس لیے اس عہد میں مقامی علاقوں اور شہروں کی تاریخیں لکھی گئیں۔

اس کے ساتھ ہی مراعات یافتہ طبقہ جو اپنی قدیم حیثیت کو کھو رہا تھا اور اسے یہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے تشخص کو کھو کر عوام میں خلط ملط ہو جائے گا انہیں احساس ہوا کہ اپنے خاندانوں کی تاریخ لکھ کر اپنی انفرادی اور خصوصی حیثیت کو برقرار رکھیں' ان میں خصوصیت سے اہل سادات قابل ذکر ہیں جو اپنی مراعات کی وجہ سے اپنے حسب و نسب کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

اس عہد کی تاریخ نویسی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متوسط طبقے کے لوگوں نے تاریخ لکھنی شروع کی جیسے کھتری' صراف' اور منشی' اس وجہ سے اب تک تاریخ پر جو طبقہ اعلیٰ کا قبضہ تھا وہ ٹوٹ گیا اور متوسط طبقے نے اپنے نقطہ نظر سے تاریخ کو جانچنا اور پرکھنا شروع کردیا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ نویسی کی زبان سادہ ہوگئی عبارت آرائی اور پیچیدگی جو پہلے کے مورخوں کی خصوصیات تھیں وہ ختم ہوگئیں اس عہد میں مورخوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا' کیونکہ زوال کے دور میں دلوں پر جو مایوسی طاری تھی اور معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ سے جس سے لوگ متاثر ہورہے تھے اس وجہ سے لوگ تاریخ نویسی کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف موضوعات کو اپنایا' چونکہ ان کی اکثریت دربار سے وابستہ نہیں تھی اس لیے ان کی تحریر میں آزادی' تنقید اور بے باکی ہے وہ صاف اور واضح الفاظ میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔

چونکہ اس عہد میں ہندو مورخوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس لیے انہوں نے تاریخ کے روایتی خاکہ کو بدل ڈالا۔ مثلاً" وہ تاریخ کی ابتداء قدیم ہندوستان سے کرتے اور پھر اسے تسلسل کے ساتھ عربوں و ترکوں کی ہندوستان کی فتح سے ملا دیتے' جیسے سبحان رائے (وفات: 96- 1695ء) کی خلاصتہ التواریخ ہے کہ جس میں ہندوستان کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔

آخری عہد مغلیہ کے مورخ مجموعی طور پر مغل سلطنت کے زوال' حکومتی اداروں کی ٹوٹ پھوٹ' لاقانونیت اور عدم تحفظ کی وجہ سے پریشان تھے۔ ان کی تاریخوں میں اس دور کے بحران اور مستقبل کے بارے میں سوالات ملتے ہیں۔ اس کا احساس اس سے ہوتا ہے کہ اکثر مورخین نے اپنی تاریخوں کے نام "عبرت نامہ" رکھا۔ مثلاً" فقیر خیر الدین محمد الہ آبادی' محمد قاسم لاہوری' اور مرزا محمد وغیرہ۔ ان تاریخوں میں بادشاہ کی مظلومیت امراء کی سازشیں' قدیم و جدید امراء کے درمیان کش مکش اور حکومت کی بے بسی کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں تاریخ ایک المیہ بن جاتی ہے اور بادشاہ و شاہی خاندان کے افراد مظلومیت کا پیکر بن کر ابھرتے ہیں لیکن ان میں کوئی مورخ مغل سلطنت کے زوال' اور معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ کا تجزیہ نہیں کرسکا۔ اس کے ہاں مایوسی' عبرت اور مظلومیت کا احساس ہے جسے وہ وقت کے ساتھ منسوب کردیتا ہے اور قدرت کی جانب سے پیش ہونے والے حادثات کہہ کر ان کا تجزیہ کیے بغیر خاموش ہوجاتا ہے۔

اس دور میں مرہٹوں' سکھوں' راجپوتوں اور جاٹوں کے ساتھ مغلوں کی جو جنگیں ہوئیں اسے مورخ مرکز کے ساتھ بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے پس منظر میں ان کے قومی جذبات کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک یہ بغاوتیں اور شورشیں تھیں کہ جنہوں نے مغل سلطنت کو زوال پذیر کردیا۔

اس دور کی تاریخ نویسی کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مذہبی تعصب اور نفرت نہیں کیونکہ آخری عہد مغلیہ میں مسلمان اور ہندوؤں کے اشتراک سے ایک متحد ثقافت ابھر رہی تھی' اس کی عکاسی بھی تاریخ نویسی میں نظر آتی ہے' ان واقعات کو مذہبی نقطہ نظر سے زیادہ سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

آخری عہد مغلیہ کی تاریخ نویسی اس لیے اہم ہے کہ اس میں صرف سیاسی واقعات ہی کا بیان نہیں بلکہ اس میں پورا معاشرہ مکمل رنگوں اور جوش و ولولہ کے ساتھ متحرک نظر

آتا ہے۔ اس عہد کی ثقافتی و تہذیبی تاریخ نویسی میں موجود ہے اور اس مواد کی وجہ سے جدید دور کے مورخ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس عہد کی سماجی و معاشرتی تاریخ کی تشکیل کر سکے۔

عہد برطانیہ میں تاریخ نویسی

جیسے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار ہندوستان میں بڑھتا گیا اسی طرح انگریزوں کی دلچسپی ہندوستان کی تاریخ' اداروں اور روایات سے بڑھتی گئی۔ سیاسی اقتدار کے ساتھ ان کی انتظامی ضروریات بھی بڑھیں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تاریخ وہ ماخذ تھی جس کی مدد سے وہ اس ملک کے ماضی' یہاں کے باشندوں کے عادات و اطوار و نفسیات اور حکومتی سیاسی اداروں سے واقف ہوسکتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی ریاستوں پر ایک ایک کرکے قبضہ کررہی تھی' لہٰذا اس قبضہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے مقامی حکمرانوں کی بدعنوانیاں تاریخ نویسی کے ذریعہ بیان کی گئیں اس مقصد کے لیے انگریز منتظمین اور ہندوستانی مورخوں سے اس قسم کی تاریخیں لکھوائی گئیں کہ جن میں برطانوی اقتدار کو جائز ثابت کیا جائے اور اس کی برکتوں کی نشان دہی کی جائے غلام حسین طباطبائی کی سیر المتاخرین کمپنی کے نقطہ نظر سے لکھی ہوئی تاریخ ہے' اسی قسم کی تاریخیں اودھ' بنگال' اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں لکھوائی گئیں' کمال الدین زائر کی قیصر التواریخ کو بھی اس زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں جدید تاریخ نویسی کی ابتداء انگریزوں نے کی کہ جنہوں نے تاریخ کے ماخذوں کی مدد سے جدید تاریخ تشکیل کی۔ یہ تاریخ قدیم' عہد وسطیٰ' اور جدید ہندوستان کے حالات پر مبنی تھی' اس طرح سے صرف ہندوستان کی تاریخ لکھی گئی اور مختلف ادوار میں تقسیم کرکے اس کے تسلسل کو باقی رکھا گیا۔

ابتدائی دور میں جب تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار مکمل طور پر مستحکم نہیں ہوا تھا۔ اس کے منتظمین کا رویہ ہندوستان اور اس کی تاریخ کے سلسلہ میں رومانوی تھا' وہ یہاں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی' رسم و رواج' روایات و اقدار سے متاثر تھے۔ اور مغل حکومتی

ڈھانچہ اور دربار کی رسومات کو معمولی ردو بدل کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ یہاں کی زبان اور کلچر کو انہوں نے اختیار کرلیا تھا۔ اس لیے اس دور میں انگریزوں نے جو تاریخ لکھی اس میں ان کا نقطہ نظر رومانوی اور ہمدردانہ تھا۔ لیکن جیسے جیسے ان کی سیاسی طاقت بڑھتی گئی اس کے ساتھ ان کا رویہ بھی تبدیل ہوتا چلا گیا اور ان میں اپنی نسلی برتری اور قومی افضلیت کا جذبہ آگیا' ہندوستان و اہل ہندوستان کے لیے حقارت کے جذبات پیدا ہوئے اس نے تاریخ نویسی میں بھی ان کے نقطہ نظر کو تبدیل کردیا۔

برطانوی مورخین نے برطانوی حکومت کو ہندوستان کے لیے باعث رحمت قرار دیا کیونکہ ہندوستان جو اب تک خانہ جنگیوں اور بدامنی میں الجھا ہوا تھا' انگریزی حکومت کے قائم ہونے کے بعد اسے اس سے نجات ملی اور یہاں امن و امان قائم ہوا۔ کمپنی کی حکومت نے اصلاحات کے ذریعہ یہاں سے ظالمانہ رسومات کا خاتمہ کیا جیسے ستی وغیرہ۔ انہوں نے ڈارون کے اس نظریہ کے تحت صرف طاقت ور اپنی قوت کے بل بوتے پر زندہ رہتا ہے' اس تصور کو لیا کہ طاقت ور کا حکومت کرنا جائز ہے۔ اسی طرح نظریہ افادیت کے تحت انہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کو جائز قرار دیا کیونکہ انہوں نے ہندوستان کے معاشرہ کو خوشی و مسرت دی اور اسے جہالت سے نکال کر تعلیم عام کی۔

انگریزوں نے تاریخ نویسی میں اس خیال کو بھی مقبول بنایا کہ ہندوستان پر ہمیشہ سے غیر ملکی اقوام حکومت کرتی آئی ہیں' مثلاً" آریہ' عرب' ترک' افغان اور مغل اس لیے انگریز بھی غیر ملکی ہیں اور تاریخ کے تسلسل کی ایک کڑی ہیں۔ اس سے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کے مقامی باشندے حکومت کرنے کے اہل نہیں اسی وجہ سے یہاں غیر ملکیوں کو حکومت کے مواقع ملتے رہے ہیں۔

انہوں نے تاریخ نویسی میں اس نظریہ کو پیش کیا کہ چونکہ انگریز نسلی اعتبار سے افضل اور برتر ہیں اور عیسائی و یورپی تہذیب کے وارث ہیں اس لیے یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہندوستان کو قدامت و جہالت سے نکال کر اسے مہذب بنائیں۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں اولین اہم کتاب جیمس مل کی "ہسٹری آف برٹش انڈیا" ہے۔ مل ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھا اور نظریہ افادیت کا پیروکار اور انگریزوں کی نسلی و تہذیبی برتری کا مبلغ' جس وقت اس نے ہندوستان کی تاریخ لکھی اس وقت انگریزی طبقے میں ہندوستان کے بارے میں دو قسم کے خیالات تھے ایک تو یہ کہ ہندوستان نے ماضی

میں عظیم تہذیب تخلیق کی ہے' اور دوسرا یہ کہ اہل ہندوستان تہذیبی لحاظ سے پس ماندہ ہیں ہندوستان کی تاریخ سے رومانوی لگاؤ رکھنے والوں میں ہاسٹنگ' جونز' الفنسٹن' منرو اور ما لکم تھے' جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر اس کی تہذیب کا مطالعہ کیا تھا۔ دوسری جماعت میں قدامت پرست مذہبی آتے تھے جن میں شور' اور گرانٹ شامل تھے۔ جیمس مل ان عقل پرست اور افادیت پرست طبقہ سے تعلق رکھتا تھا جو خود کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا' مگر وہ ہندوستان کے معاشرہ کو بربریت کے دور میں سمجھتا تھا' اور ہندو و مسلم تہذیبوں کے خلاف تھا۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ لکھتے وقت ان شہادتوں کو جمع کیا جن سے اس کا نقطہ نظر صحیح ثابت ہوتا تھا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ رہی کہ 25 سال تک اس موضوع پر اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور یہ 1820ء' 1826ء اور 1840ء میں بار بار چھپی۔ اس لیے اس کتاب کا اثر ہندوستانی منتظمین پر بڑا گہرا ہوا اور وہ اسی کے نقطہ نظر سے ہندوستان کی تاریخ کو دیکھنے لگے۔ ان کے دلوں میں اہل ہندوستان کے لیے حقارت کے جذبات پیدا ہوئے اور خود کو وہ نسلی طور پر برتر سمجھتے رہے۔ 1848ء میں "ہے من ولسن" نے مل کی تاریخ کو درست کیا' لیکن یہ تصحیح اس نے فٹ نوٹس میں کی اور اصل کتاب میں 1803ء سے 1834ء تک کے حالات کا اضافہ کیا اس کی وجہ سے مل کی تاریخ کو نئی زندگی مل گئی۔ چونکہ قارئین کے لیے فٹ نوٹس میں تصحیح پڑھنا مشکل تھا اس لیے اکثریت صرف متن پڑھتی رہی اور اس وجہ سے متن میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا اس کے اثرات باقی رہے' اور یہ خیالات انیسویں صدی تک انگریزوں کو متاثر کرتے رہے۔

مل ہی نے ہندوستان کی تاریخ کو سب سے پہلے ہندو اور مسلم ادوار میں تقسیم کیا۔ اس کا رویہ قدیم ہندو تہذیب کے بارے میں بڑا متعصبانہ ہے اور وہ اس دور میں ہندو تہذیب میں کوئی مثبت پہلو نہیں دیکھتا۔ مسلمان دور سے پھر بھی اسے کچھ ہمدردی ہے اس نقطہ نظر کی وجہ سے وہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو جائز اور صحیح سمجھتا ہے۔

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لیے برطانوی مورخوں نے مختلف دلائل دیے۔ 1842ء میں جے۔ سی۔ مارشمن نے "اے ہسٹری آف انڈیا" لکھی اور اس میں اس کا پرچار کیا کہ ہندوستان کی فتح میں الہی اور پراسرار طاقت نے انگریزوں کی مدد کی۔ اسی خیال کو آر' کاڈویل نے 1881ء میں اپنی تاریخ میں دھرایا کہ ہندوستانیوں کے لیے برطانوی حکومت خدا کی جانب سے آئی ہے۔ جے۔ یو۔ پوپ نے "

"اے ٹیکسٹ بک آف انڈین ہسٹری" میں برطانوی حکومت کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندو اور مسلمان اپنا وقت پورا کر کے ختم ہوگئے اور اب دوبارہ سے ان میں توانائی نہیں آسکتی ہے اس لیے ہندوستان میں برطانوی اقتدار ہمیشہ قائم رہے گا۔

راپسن (RAPSON) نے اپنی کتاب "قدیم ہندوستان" میں ہندوستان کی ترقی اور امن کے لیے امپیریل طاقت کا ہونا لازمی قرار دیا کیونکہ صرف اسی ذریعہ سے ہندوستان متحد رہ سکتا ہے۔ اس لیے انگریز دراصل موریہ اور مغلوں کے جانشین ہیں۔ جو ہندوستان کو متحد رکھے ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں انگریز مورخین نے ہندوستان کی تاریخ کو سوانح حیات کی شکل میں پیش کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان شخصیتوں کو بطور ہیرو پیش کیا جائے کہ' جنہوں نے ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے استحکام اور اقتدار کے لیے جدوجہد کی۔ اس ذریعہ سے نہ صرف برطانوی امپیریل ازم کو صحیح ثابت کرنا تھا' بلکہ ان شخصیتوں کے ذریعہ برطانوی عوام میں اس کے لیے ایک ولولہ اور جوش پیدا کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں میکالے نے پیش قدمی کی اور کلائیو کی سوانح حیات لکھی۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ برطانوی فتوحات ایک شخص کی جرات اور دیانت کا نتیجہ تھیں۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں جو تصادم ہوا اس میں انگریزوں نے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا جب کہ ہندوستانی بے ترتیبی اور انتشار کا شکار تھے اور اس میں کوئی اعلیٰ اخلاق اقدار نہیں تھیں اور یہی وجہ ان کی شکست کا باعث بنی۔ اس سوانح حیات نے برطانوی معاشرہ میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔ اور وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ڈبلوہنٹر نے 1899ء میں روز آف انڈیا کے نام سے ایک سیریز شروع کی جس میں ہندوستان اور یورپی شخصیتیں شامل تھیں۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کو شخصیتوں کے پس منظر میں بیان کیا جائے۔

اس سیریز میں جن شخصیتوں کو منتخب کیا گیا ان میں برطانوی شخصیتیں زیادہ تھیں اور یہ ان لوگوں سے لکھوائیں جو ہندوستان میں فوجی اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں سے ریٹائر ہوچکے تھے اور ہندوستان کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر کے حامی تھے ان شخصیتوں کی تاریخ میں جنگیں' معاہدے اور فتوحات اہم موضوعات ہیں اور انہیں کے گرد تاریخی واقعات و حالات گھومتے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی یا معاشی عوامل کو تاریخی عمل میں دیکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ان تاریخوں میں مورخوں نے ناصحانہ رنگ اختیار کیا ہے اور

منتظمین نے اپنے تجربات کی روشنی میں مشورے دیئے ہیں کہ اہل برطانیہ کو چاہئے کہ وہ ان خوبیوں کی حفاظت کریں کہ جن کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان میں اپنے اقتدار کو قائم رکھا ہے۔ ان تاریخوں کا مقصد آنے والی نسل کو برطانوی امپریل ازم کے استحکام اور وسعت کے لیے استعمال کرنا تھا۔ تاریخ کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنا نہیں تھا۔

اسی عہد میں سیاسی تبدیلیوں اور وقت کے تقاضوں کے تحت برطانوی تاریخ نویسی میں مختلف رجحانات پیدا ہوئے' ان میں سے ایک جماعت ان مورخوں کی تھی کہ جو چاہتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت باقی رہے اور اس حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک نہیں کیا جائے۔ یہ یورپی کلچر کو ہندوستانی کلچر سے اعلیٰ و برتر سمجھتے تھے۔ دوسرے گروہ میں وہ مورخ شامل تھے۔ جنہیں ہندوستان کی ثقافت' تہذیب و تمدن اور سیاست سے دلچسپی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو حکومت میں شریک کرکے سیاست کے دائرہ کو وسیع کیا جائے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اسے تنگ دائرہ میں محدود رکھا گیا تو یہ سکڑ کر ختم ہوجائے گی' تیسرے وہ مورخ تھے جنہوں نے ابتدائی برطانوی دور کی تاریخ پر تنقید کی اور خصوصیت سے کلائیو' وارن' ہسٹنگ اور دوسرے برطانوی منتظمین و فاتحین پر سخت اعتراضات کئے اور ان کی بدعنوانیوں کو ظاہر کیا جس پر ان مورخوں نے جو امپریل ازم کے حامی تھے ان کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دلیل دی کہ اگر ان شخصیتوں کی بدعنوانیاں پیش کی جائیں گی تو اس سے نوجوان نسل کے تاثرات ان کے بارے میں غلط ہوجائیں گے' اس لیے انہوں نے ان کی کمزوریوں اور سازشوں کو نظر انداز کرکے صرف ان کی تعریف و توصیف کی۔

الفرڈلوئل اور ڈبلوہنٹر نے ہندوستان میں برطانوی تاریخ نویسی کی ایک نیا رخ دیا اگرچہ وہ حکومت و سیاست میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کے حق میں تھے مگر ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ برطانوی اقتدار کی ایسی پالیسی کا تعین کریں کہ جس کی بنیاد پر اس کی جڑیں مستقبل میں گہری اور مضبوط ہوجائیں چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اس نقطہ نظر کو ختم کیا کہ ابتدائی انگریز فاتحین لالچی' بدعنوان' راشی اور دھوکہ باز تھے۔ انہوں نے اس دلیل کا جواب دیا کہ برطانوی فتوحات اچانک اور معجزانہ طور پر نہیں ہوئیں بلکہ یہ فتوحات ایک منصوبہ کے تحت آہستہ آہستہ ہوئیں اور اس کے پس منظر میں یورپ میں ہونے والی سیاسی سماجی' اور معاشی تبدیلیوں کا دخل ہے اس طرح انہوں نے تاریخی عمل کو وسعت

دے کر اس میں شخصیتوں کے کردار کو کم کیا۔

ہندوستان میں برطانوی تاریخ نویسی کا ایک اہم پہلو علاقائی تاریخ نویسی کا تھا۔ اس کام کو بھی انگریز منتظمین نے کیا جو کہ ملک کے مختلف علاقوں میں انتظامی عہدوں پر فائز تھے اس تاریخ نویسی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں قومی احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہندو مسلم تصادم کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اس تاریخ نویسی کے ذریعہ دو قسم کے جذبات پیدا ہوئے۔ علاقائی قوم پرستی کی ابتداء اور فرقہ واریت' اس قسم کی تاریخ نویسی کی مثال گرانٹ ڈف کی "اے ہسٹری آف مرہٹہ" اور جیمس ٹاڈ کی راجپوتانہ کی تاریخ ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دور میں یہ تاریخیں قوم پرستی اور فرقہ واریت کی بنیاد بنیں۔

ابتدائی دور میں برطانوی مورخین نے ہندوستان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اور جو نظریات یہاں کی تاریخ کے بارے میں تشکیل دیئے وہ ایک عرصہ تک بغیر کسی رد عمل کے قائم رہے اور یہ کتابیں ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں بطور نصاب کے پڑھائی جاتی رہیں اور علمی دنیا پر ان کا غلبہ بغیر کسی چیلنج کے رہا' مگر انیسویں صدی کے آخر میں جب ہندوستانیوں میں مغربی تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا اور ان میں قومیت کے جذبات ابھرنا شروع ہوئے تو جہاں انہوں نے برطانوی حکومت کی پالیسیوں پر تنقید شروع کی وہاں انہوں نے تاریخ نویسی میں بھی برطانوی مورخوں کے اعتراضات کا جواب دینا شروع کیا اور ان کے قائم کیے ہوئے مفروضوں کو رد کرنا شروع کردیا۔ اس سلسلہ میں جہاں انہوں نے قدیم اور عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق کی اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان میں برطانوی حکومت اور اس کی فتوحات و اصلاحات کا جائزہ لیا۔

اگرچہ قوم پرستی کے جذبہ کے تحت لکھی جانے والی تاریخ کئی کمزوریوں کا شکار تھی اور اس وجہ سے انہوں نے تاریخ میں اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرنے کے بجائے دوسروں کو مورد الزام ٹھہرایا' واقعات کو مسخ کرکے مبالغہ آمیزی اور زبان و بیان کے زور سے جذبات کو ابھارا گیا۔ اس تاریخ نویسی کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ برطانوی مورخین نے جن منفی اثرات کو پیدا کیا تھا اور ہندوستانیوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا' انہوں نے رد عمل کے طور پر ہندوستان کی ماضی کے لیے فخر اور عظمت کے جذبات پیدا کئے وہ ہندوستانی مورخ جنہوں نے تاریخ نویسی میں قوم پرستی کے نظریہ کے تحت واقعات کو پیش کیا ان میں

کے نہ ہونے کو دہراتے رہے۔ دوسرے اس دور میں تاریخ نویسی پہ صرف سیاسی پہلو چھایا ہوا تھا جس میں شاہی خاندانوں' جنگوں و فتوحات اور سیاسیات کا ذکر ہوتا تھا' اس کے مقابلہ میں معاشرہ کی ثقافتی و تہذیبی تاریخ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی' ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی غیر موجودگی میں مغربی مورخوں کو قدیم ہندوستان کی تاریخ میں کوئی سنسنی خیز مواد نہیں ملا۔

لیکن آگے چل کر تحریری تاریخ کی غیر موجودگی ہی قدیم ہندوستان کی نئی تاریخ کی تشکیل میں ایک نعمت ثابت ہوئی' کیونکہ تحریری تاریخ کی موجودگی میں محض ماخذوں کی شہادت پر ایک محدود تاریخ تشکیل ہوتی ہے اور صرف انہیں پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے جو ان تاریخوں میں ہوتے ہیں۔ چونکہ ان ماخذوں کی وجہ سے مورخ کو آسانی سے مواد مل جاتا ہے اس لیے دوسرے مواد کی تلاش اور اس کے استعمال کی کوشش نہیں کی جاتی' اور پھر یہ تحریری تاریخ صرف سیاسی واقعات پر مبنی ہوتی تھیں اس لیے ان کا دائرہ محدود رہتا تھا۔ اس پس منظر میں جب جدید دور میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل ہوئی جو سیاسی تاریخ سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھی۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں برطانوی مورخین نے بھی حصہ لیا اور انہوں نے اس تاریخ کو نو آبادیاتی نقطہ نظر سے لکھا تاکہ ان کی حکومت کا جواز ثابت ہو اور ہندوستان میں جو قومی تحریکیں شروع ہوئی تھیں' انہیں کمزور کیا جاسکے۔ لیکن ان کے رد عمل کے طور پر ہندوستانی مورخین بھی مغربی تحقیقی فن سے مسلح ہو کر ان کا مقابلہ کررہے تھے' اس لیے ہندوستان میں آزادی کی جنگ صرف سیاسی میدان ہی میں نہیں لڑی گئی بلکہ یہ جنگ تاریخ نویسی کے میدان میں بھی تھی جہاں نو آبادیاتی اور قومی نظریات میں زبردست تصادم کی ابتدا ہوچکی تھی۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ کے سلسلہ میں یورپی مورخوں کا استدلال یہ تھا کہ انہوں نے ہر چیز دوسری قوموں سے سیکھی ہے جیسے یونانی' مصری یا سمیری' اس کے مقابلہ میں دوسری اقوام نے ان سے کچھ نہیں سیکھا۔ وہ قدیم ہندوستان کے طرز حکومت کو مشرقی مطلق العنانیت کہتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں وہ اپنے جمہوری اداروں اور نظام حکومت کی تعریف کرتے تھے اس وجہ سے ان کی دلچسپی سیاسی تاریخ سے زیادہ تھی کیونکہ اس پہلو میں وہ اپنی برتری ثابت کرسکتے تھے۔ ہندوستانی معاشرہ ان کے نزدیک ٹھہرا ہوا اور منجمد تھا' اور

اس کی وجہ سے وہ قدیم ہندوستان کی روایات کو برقرار دیتے تھے۔ 1857ء کے بعد سے انہوں نے ذات پات کے مسئلہ کو بھی زیادہ ابھارا تاکہ ہندوستانی معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاسکے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں آریاؤں کی آمد کے مسئلہ نے ایک متضاد شکل اختیار کرلی ہے ابتداء ہی سے اس مفروضہ کو پیش کیا گیا کہ آریہ وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اہل ہندوستان پر ہمیشہ غیرملکیوں نے حکومت کی اور غیر ملکی ہمیشہ ترقی پذیر تہذیب ہندوستان میں لے کر آئے۔ اور باہر سے آنے والے نسلی اعتبار سے مقامی باشندوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس استدلال کے ساتھ انگریزوں کا بحیثیت غیر ملکی قوم کے ہندوستان پر حکومت کرنا اور اپنی نسلی برتری کو ثابت کرنا صحیح ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ انڈو آرین اور یورپی نسل کے ایک ہونے کا استدلال دیا گیا' اور بی ہیول کی کتاب "ہسٹری آف آرین رول ان انڈیا" جو 1918ء میں چھپی خاصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں آریہ تہذیب کی برتری کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کی برطانوی تہذیب سے مماثلت بتائی گئی ہے' وہ ہندوستانیوں کی تاج برطانیہ سے وفاداری کی وجہ یہ بتایا ہے کہ چونکہ دونوں تہذیبیں ایک ہیں اس لیے دونوں قومیں ذہنی طور پر ہم آہنگ ہیں۔

ہندومسلم نفرت کو پیدا کرنے کی غرض سے یہ الزام لگایا گیا ہے کہ آریہ تہذیب کے تسلسل کو روکنے والے مسلمان فاتحین تھے جنہوں نے اس تہذیب کی ترقی کو روک دیا۔ اس نظریہ کے تحت وہ ہندوؤں کی حمایت حاصل کرکے برطانوی اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کی قومی تحریک کو ہندو مسلم تصادم کے ذریعہ کمزور کرنا تھا۔

آریاؤں کی آمد کے نظریہ کو ہندوستانی مورخوں کے چیلنج کیا ہے کہ ایسی کوئی ناقابل تردید شہادتیں نہیں کہ جس سے ثابت کیا جاسکے کہ آریہ باہر سے آئے تھے کیونکہ ان کی پہلی کتاب رگ وید میں ان کے قدیم وطن یا قدیم روایات کے بارے میں کوئی ذکر نہیں جو کہ ہمیشہ ان قوموں میں ہوتے ہیں۔ جو کہ ہجرت کرکے دوسری سرزمین میں آباد ہوجاتی ہیں وہ صدیوں میں اپنے قدیم وطن کی یاد سے چھٹکارا نہیں پاسکتی ہیں اس لیے ان کا استدلال یہ ہے کہ آریہ باہر سے نہیں آئے تھے بلکہ وہ ہندوستان کے باشندے تھے ان کے باہر سے آنے کے نظریہ سے چونکہ اہل برطانیہ کو فائدہ پہنچا تھا۔ اس لیے انہوں سے تقویت دی اسی سلسلہ میں میں ان مورخوں کا یہ استدلال ہے کہ موئن جو دڑو کی کھدائی

کے بعد اسے جان مارشل نے دراوڑی تہذیب قرار دیا' حالانکہ اس کے پاس اس کے کوئی شواہد نہیں تھے مگر اس ذریعہ سے وہ آریہ اور دراوڑی نسلوں کے تصور کو ابھار کر ان میں تفریق پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ پرونسنٹ اسمتھ کی تاریخ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کو جو 1919ء میں چھپی بڑی اہمیت حاصل ہے' یہ کتاب برطانوی دور حکومت اور اس کے بعد بھی ہندوستان کے بارے میں جو نظریات پیش کئے گئے ہیں وہ اس عہد کے برطانوی حکمران طبقوں کے ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب کہ قومی تحریکیں زور پر تھیں اور برطانوی حکومت ان کے خلاف ہر قسم کے ہتھیار استعمال کر رہی تھیں۔ تاریخ نویسی میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسمتھ کے مطابق ہندوستان میں ہمیشہ مطلق العنان حکومتیں رہیں ہیں۔ اور یہاں امن و امان اور قانون کی بالا دستی کو محض طاقت کے ذریعہ قائم کیا جاسکا ہے۔ اس لیے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے مضبوط مرکزی حکومت کا ہونا بہت ضروری ہے اور رعایا کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ حکومت کی وفادار رہے۔ اس سے اسمتھ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستانیوں کو کسی قسم کے حقوق یا قوانین کی ضرورت نہیں' برطانیہ کے جمہوری طرز حکومت اور ہندوستان کی اقوام میں صرف تاج کی وفاداری کے ذریعہ اتحاد ہوسکتا ہے' ہندوستان میں کسی قسم کے "ہوم رول" کی گنجائش نہیں اور نہ ہی ہندوستان میں دستوری اصلاحات اور نمائندہ اداروں کی ضرورت ہے۔

اسمتھ نے ہندوستان کی تاریخ کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی' مثلاً" اس کی دلیل یہ ہے کہ موریہ سلطنت محض اس لیے قائم رہ سکی کہ اس کی بنیاد جاسوسوں اور مخبروں پر تھی' اس نے سکندر کی ہندوستانی فتوحات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور اس کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کو نظر انداز کردیا ہے' اس سلسلہ میں اس کا تمام مواد یونان اور رومی مورخوں سے کیا ہوا ہے اس سے اسمتھ نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اہل ہندوستان کبھی بھی اس قابل نہیں رہے کہ وہ غیر ملکی حملہ آوروں سے اپنا دفاع کرسکیں' اس لیے ان کی کمزوریاں فطری کمزوریاں ہیں جو دور نہیں ہوسکتی ہیں۔

1905ء میں جب ارتھ شاستر چھپی تو اس نے قدیم ہندوستان کی تاریخ نویسی میں

بڑی انقلابی تبدیلیاں کیں اور ہندوستانی مورخوں نے اس کی مدد سے قدیم ہندوستان کی سیاست' حکومت دستوری ساخت و ہیئت' ثقافتی و معاشی اور معاشی زندگی کو دوبارہ سے تشکیل کیا اور برطانوی مورخوں کے اس نظریہ کو رد کردیا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں' یا اس کا کوئی تہذیبی کارنامہ نہیں۔ ارتھ شاستر کی مدد سے خاص طور پر قدیم ہندوستان کے دستوری ڈھانچہ کو اجاگر کیا گیا تاکہ یہ واضح کیا جائے کہ ہندوستانی ماضی میں بھی اس قابل تھے کہ حکومت کرسکیں اور آج بھی حکومت کو چلانے کے اہل ہیں۔ بیسویں صدی کے درمیان جب سیاسی اور دستوری جنگ جیت لی گئی تو ارتھ شاستر کے ذریعہ سوشل ازم اور فلاح ریاست کے تصور کو اجاگر کیا گیا اور اس میں سے آزاد تجارت کے نظریہ کو ڈھونڈ کر نکالا گیا۔

ہندو مورخوں نے آثار قدیمہ کی دریافت کے بعد ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا دفاع کیا۔ آر۔ سی۔ دت کی قدیم ہندو تہذیب پر پہلی کتاب ہے جس میں ہندو تہذیب کی شان و شوکت کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اس بات کے حوالے دیئے گئے ہیں کہ قدیم ہندوستان فنی و سائنسی ایجادات جدید یورپ سے بڑھا ہوا تھا یہاں تک کہ انہیں ہوائی جہاز کے بارے میں بھی معلومات تھیں۔

ہندوستانی مورخوں نے ان مفروضوں کو رد کرنے کی کوشش کی کہ جن کے تحت ہندوستان کی حکومت کو مطلق العنان ثابت کیا گیا تھا' اس کے معاشرے کو منجمد قرار دیا گیا تھا اس میں بسنے والی قوموں کو یک جہتی و اتحاد سے محروم بتایا گیا تھا' اور انہیں تاریخ و سیاست سے نابلد قرار دیا گیا تھا۔ انہوں نے قوم پرستی کے جذبہ سے لکھی گئی تاریخوں کے ذریعہ ہندوستان کے معاشرہ کا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ سے دیا' انہیں ماضی کے بارے میں بلندی و عظمت کا احساس دلایا۔ اگرچہ قوم پرستی کے تحت لکھی جانے والی تاریخ میں بہت کمزوریاں ہیں' لیکن تحریک آزادی کے دوران انہوں نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا' اب موجودہ دور میں تاریخ نویسی کی ان کمزوریوں کو دور کیا جارہا ہے' کیونکہ اب وہ وقت ہے کہ تاریخ کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

دادا بھائی نوروجی، آر، دت، میجر باسو، ساور کر اور تلک قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی مورخین نے جب اپنی تاریخ کی تشکیل کا کام سنبھالا تو برطانوی مورخ اپنے دفاع میں آگئے اور ان کا اثر آہستہ آہستہ ہندوستان کی تاریخ نویسی پر کم ہوتا چلا گیا۔

قدیم ہندوستان

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے استحکام کے لیے یہ ضروری تھا کہ اہل ہندوستان کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ وہ تاریخی طور پر کم تر اقوام میں سے ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کے قدیم ماضی کی کوئی تاریخ نہیں، تاریخ ان اقوام کی ہوتی ہے جنہوں نے تہذیب و تمدن میں کوئی نمایاں کارنامے سرانجام دیئے ہوں۔

قدیم ہندوستان کی کوئی تحریری تاریخ نہیں تھی بلکہ ان بھاٹوں کی نظمیں تھیں جو بادشاہوں اور امراء کے کارناموں کے سلسلوں میں منظوم کرکے انہیں سنایا کرتے تھے یہ سلسلہ بھی 3 یا 4 صدی تک رہا، اس کے بعد برہمنوں کے مذہبی فروغ کے بعد ان کی جگہ دعائیہ گیتوں اور بھجنوں نے لے لی اور بھاٹ اپنا پیشہ چھوڑ کر تجارت میں مشغول ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ راجستھان میں ظاہر ہوئے اور وہاں انہوں نے نظم و نثر میں حکمرانوں کے کارنامے بیان کرنا شروع کردیئے۔ لیکن ان کی یہ نظمیں تاریخ کے دائرے میں نہیں آتیں اور ان کی بنیاد پر کوئی تاریخ تشکیل نہیں دی جاسکتی ہے۔ ہندوستان میں تحریری تاریخ بارھویں صدی میں جا کر کلھن کی راج ترنگی کی صورت میں ملتی ہے۔

تحریری تاریخ کی غیر موجودگی کی وجہ سے یورپ کے اہل علم جن میں، ہیگل رانکے اور مارکس شامل ہیں۔ انہوں نے اس نظریہ کو تسلیم کرلیا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں، حالانکہ تاریخ صرف تحریری ہی نہیں ہوتی یہ تاریخ تو زمین، پہاڑوں، جنگلات، دریاؤں اور جھیلوں میں دفن ہوتی ہے اور قدیم عمارتیں اور آثار کسی بھی ملک کی قدیم تاریخ کی گواہی دیتے ہیں۔ ہر عہد کا مذہبی و ادبی، اور علمی ادب اس کی سماجی، معاشی اور سیاسی تاریخ کی عکاسی کرتا ہے مگر ایک عرصہ تک نہ تو ہندوستان کے آثار قدیمہ دریافت ہوئے تھے اور نہ ہندوستان کے قدیم علوم کی کتابیں چھپی تھیں اور نہ ہی ان کے مغربی زبانوں میں تراجم ہوئے تھے اس لیے اہل علم ان سے ناواقف تھے اور جس وجہ سے وہ ہندوستان کی تاریخ

کے نہ ہونے کو دہراتے رہے۔ دوسرے اس دور میں تاریخ نویسی پے صرف سیاسی پہلو چھایا ہوا تھا جس میں شاہی خاندانوں' جنگوں و فتوحات اور سیاسیات کا ذکر ہوتا تھا' اس کے مقابلہ میں معاشرہ کی ثقافتی و تہذیبی تاریخ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی' ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی غیر موجودگی میں مغربی مورخوں کو قدیم ہندوستان کی تاریخ میں کوئی سنسنی خیز مواد نہیں ملا۔

لیکن آگے چل کر تحریری تاریخ کی غیر موجودگی ہی قدیم ہندوستان کی نئی تاریخ کی تشکیل میں ایک نعمت ثابت ہوئی' کیونکہ تحریری تاریخ کی موجودگی میں محض ماخذوں کی شہادت پر ایک محدود تاریخ تشکیل ہوتی ہے اور صرف انہیں پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے جو ان تاریخوں میں ہوتے ہیں۔ چونکہ ان ماخذوں کی وجہ سے مورخ کو آسانی سے مواد مل جاتا ہے اس لیے دوسرے مواد کی تلاش اور اس کے استعمال کی کوشش نہیں کی جاتی' اور پھر یہ تحریری تاریخ صرف سیاسی واقعات پر مبنی ہوتی تھیں اس لیے ان کا دائرہ محدود رہتا تھا۔ اس پس منظر میں جب جدید دور میں قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل ہوئی جو سیاسی تاریخ سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھی۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں برطانوی مورخین نے بھی حصہ لیا اور انہوں نے اس تاریخ کو نو آبادیاتی نقطہ نظر سے لکھا تاکہ ان کی حکومت کا جواز ثابت ہو اور ہندوستان میں جو قومی تحریکیں شروع ہوئی تھیں' انہیں کمزور کیا جاسکے۔ لیکن ان کے رد عمل کے طور پر ہندوستانی مورخین بھی مغربی تحقیقی فن سے مسلح ہو کر ان کا مقابلہ کررہے تھے' اس لیے ہندوستان میں آزادی کی جنگ صرف سیاسی میدان ہی میں نہیں لڑی گئی بلکہ یہ جنگ تاریخ نویسی کے میدان میں بھی تھی جہاں نو آبادیاتی اور قومی نظریات میں زبردست تصادم کی ابتدا ہو چکی تھی۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ کے سلسلہ میں یورپی مورخوں کا استدلال یہ تھا کہ انہوں نے ہر چیز دوسری قوموں سے سیکھی ہے جیسے یونانی' مصری یا سمیری' اس کے مقابلہ میں دوسری اقوام نے ان سے کچھ نہیں سیکھا۔ وہ قدیم ہندوستان کے طرز حکومت کو مشرقی مطلق العنانیت کہتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں وہ اپنے جمہوری اداروں اور نظام حکومت کی تعریف کرتے تھے اس وجہ سے ان کی دلچسپی سیاسی تاریخ سے زیادہ تھی کیونکہ اس پہلو میں وہ اپنی برتری ثابت کرسکتے تھے۔ ہندوستانی معاشرہ ان کے نزدیک ٹھہرا ہوا اور منجمد تھا' اور

اس کی وجہ سے وہ قدیم ہندوستان کی روایات کو برقرار دیتے تھے۔ 1857ء کے بعد سے انہوں نے ذات پات کے مسئلہ کو بھی زیادہ ابھارا تاکہ ہندوستانی معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاسکے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں آریاؤں کی آمد کے مسئلہ نے ایک متضاد شکل اختیار کرلی ہے ابتداء ہی سے اس مفروضہ کو پیش کیا گیا کہ آریہ وسط ایشیا سے ہندوستان میں آئے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اہل ہندوستان پر ہمیشہ غیر ملکیوں نے حکومت کی اور غیر ملکی ہمیشہ ترقی پذیر تہذیب ہندوستان میں لے کر آئے۔ اور باہر سے آنے والے نسلی اعتبار سے مقامی باشندوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس استدلال کے ساتھ انگریزوں کا بحیثیت غیر ملکی قوم کے ہندوستان پر حکومت کرنا اور اپنی نسلی برتری کو ثابت کرنا صحیح ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ انڈو آرین اور یورپی نسل کے ایک ہونے کا استدلال دیا گیا' اور بی ہیول کی کتاب "ہسٹری آف آرین رول ان انڈیا" جو 1918ء میں چھپی خاصی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں آریہ تہذیب کی برتری کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کی برطانوی تہذیب سے مماثلت بتائی گئی ہے' وہ ہندوستانیوں کی تاج برطانیہ سے وفاداری کی وجہ یہ بتایا ہے کہ چونکہ دونوں تہذ-یبیں ایک ہیں اس لیے دونوں قومیں ذہنی طور پر ہم آہنگ ہیں۔

ہندو مسلم نفرت کو پیدا کرنے کی غرض سے یہ الزام لگایا گیا ہے کہ آریہ تہذیب کے تسلسل کو روکنے والے مسلمان فاتحین تھے جنھوں نے اس تہذیب کی ترقی کو روک دیا۔ اس نظریہ کے تحت وہ ہندوؤں کی حمایت حاصل کرکے برطانوی اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کی قومی تحریک کو ہندو مسلم تصادم کے ذریعہ کمزور کرنا تھا۔

آریاؤں کی آمد کے نظریہ کو ہندوستانی مورخوں کے چیلنج کیا ہے کہ ایسی کوئی ناقابل تردید شہادتیں نہیں کہ جس سے ثابت کیا جاسکے کہ آریہ باہر سے آئے تھے کیونکہ ان کی پہلی کتاب رگ وید میں ان کے قدیم وطن یا قدیم روایات کے بارے میں کوئی ذکر نہیں جو کہ ہمیشہ ان قوموں میں ہوتے ہیں۔ جو کہ ہجرت کرکے دوسری سر زمین میں آباد ہوجاتی ہیں وہ صدیوں میں اپنے قدیم وطن کی یاد سے چھٹکارا نہیں پاسکتی ہیں اس لیے ان کا استدلال یہ ہے کہ آریہ باہر سے نہیں آئے تھے بلکہ وہ ہندوستان کے باشندے تھے ان کے باہر سے آنے کے نظریہ سے چونکہ اہل برطانیہ کو فائدہ پہنچا تھا۔ اس لیے انہوں سے تقویت دی اسی سلسلہ میں میں ان مورخوں کا یہ استدلال ہے کہ موئن جو دڑو کی کھدائی

کے بعد اسے جان مارشل نے دراوڑی تہذیب قرار دیا' حالانکہ اس کے پاس اس کے کوئی شواہد نہیں تھے مگر اس ذریعہ سے وہ آریہ اور دراوڑی نسلوں کے تصور کو ابھار کر ان میں تفریق پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ پرونسنٹ اسمتھ کی تاریخ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کو جو 1919ء میں چھپی بڑی اہمیت حاصل ہے' یہ کتاب برطانوی دور حکومت اور اس کے بعد بھی ہندوستان کے بارے میں جو نظریات پیش کئے گئے ہیں وہ اس عہد کے برطانوی حکمران طبقوں کے ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب کہ قومی تحریکیں زور پر تھیں اور برطانوی حکومت ان کے خلاف ہر قسم کے ہتھیار استعمال کر رہی تھیں۔ تاریخ نویسی میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسمتھ کے مطابق ہندوستان میں ہمیشہ مطلق العنان حکومتیں رہیں ہیں۔ اور یہاں امن و امان اور قانون کی بالا دستی کو محض طاقت کے ذریعہ قائم کیا جاسکا ہے۔ اس لیے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے مضبوط مرکزی حکومت کا ہونا بہت ضروری ہے اور رعایا کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ حکومت کی وفادا رہے۔ اس سے اسمتھ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستانیوں کو کسی قسم کے حقوق یا قوانین کی صرورت نہیں' برطانیہ کے جمہوری طرز حکومت اور ہندوستان کی اقوام میں صرف تاج کی وفاداری کے ذریعہ اتحاد ہوسکتا ہے' ہندوستان میں کسی قسم کے "ہوم رول" کی گنجائش نہیں اور نہ ہی ہندوستان میں دستوری اصلاحات اور نمائندہ اداروں کی ضرورت ہے۔

اسمتھ نے ہندوستان کی تاریخ کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی' مثلاً" اس کی دلیل یہ ہے کہ موریہ سلطنت محض اس لیے قائم رہ سکی کہ اس کی بنیاد جاسوسوں اور مخبروں پر تھی' اس نے سکندر کی ہندوستانی فتوحات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور اس کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کو نظر انداز کردیا ہے' اس سلسلہ میں اس کا تمام مواد یونان اور رومی مورخوں سے کیا ہوا ہے اس سے اسمتھ نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اہل ہندوستان کبھی بھی اس قابل نہیں رہے کہ وہ غیر ملکی حملہ آوروں سے اپنا دفاع کرسکیں' اس لیے ان کی کمزوریاں فطری کمزوریاں ہیں جو دور نہیں ہوسکتی ہیں۔

1905ء میں جب ارتھ شاستر چھپی تو اس نے قدیم ہندوستان کی تاریخ نویسی میں بڑی انقلابی تبدیلیاں کیں اور ہندوستانی مورخوں نے اس کی مدد سے قدیم ہندوستان کی سیاست' حکومت دستوری ساخت و ہیئت' ثقافتی و معاشی اور معاشی زندگی کو دوبارہ سے

تشکیل کیا اور برطانوی مورخوں کے اس نظریہ کو رد کردیا کہ ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں' یا اس کا کوئی تہذیبی کارنامہ نہیں۔ ارتھ شاستر کی مدد سے خاص طور پر قدیم ہندوستان کے دستوری ڈھانچہ کو اجاگر کیا گیا تاکہ یہ واضح کیا جائے کہ ہندوستانی ماضی میں بھی اس قابل تھے کہ حکومت کرسکیں اور آج بھی حکومت کو چلانے کے اہل ہیں۔ بیسویں صدی کے درمیان جب سیاسی اور دستوری جنگ جیت لی گئی تو ارتھ شاستر کے ذریعہ سوشل ازم اور فلاح ریاست کے تصور کو اجاگر کیا گیا اور اس میں سے آزاد تجارت کے نظریہ کو ڈھونڈ کر نکالا گیا۔

ہندو مورخوں نے آثار قدیمہ کی دریافت کے بعد ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا دفاع کیا۔ آر۔ سی۔ دت کی قدیم ہندو تہذیب پر پہلی کتاب ہے جس میں ہندو تہذیب کی شان و شوکت کو پیش کیا گیا ہے۔ اور اس بات کے حوالے دیئے گئے ہیں کہ قدیم ہندوستان فنی و سائنسی ایجادات جدید یورپ سے بڑھا ہوا تھا یہاں تک کہ انہیں ہوائی جہاز کے بارے میں بھی معلومات تھیں۔

ہندوستانی مورخوں نے ان مفروضوں کو رد کرنے کی کوشش کی کہ جن کے تحت ہندوستان کی حکومت کو مطلق العنان ثابت کیا گیا تھا' اس کے معاشرے کو منجمد قرار دیا گیا تھا اس میں بسنے والی قوموں کو یک جہتی و اتحاد سے محروم بتایا گیا تھا' اور انہیں تاریخ و سیاست سے نابلد قرار دیا گیا تھا۔ انہوں نے قوم پرستی کے جذبہ سے لکھی گئی تاریخوں کے ذریعہ ہندوستان کے معاشرہ کا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ سے دیا' انہیں ماضی کے بارے میں بلندی و عظمت کا احساس دلایا۔ اگرچہ قوم پرستی کے تحت لکھی جانے والی تاریخ میں بہت کمزوریاں ہیں' لیکن تحریک آزادی کے دوران انہوں نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا' اب موجودہ دور میں تاریخ نویسی کی ان کمزوریوں کو دور کیا جارہا ہے' کیونکہ اب وہ وقت ہے کہ تاریخ کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

عہد وسطی

عہد وسطی کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کی تشکیل کا کام بھی ابتداء میں انگریز

مورخوں نے کیا' سیاسی اقتدار کے بعد انہیں عہد وسطی کے تاریخ سیاسی اور انتظامی اداروں' روایات اور حالات سے اس لیے واقفیت کی ضرورت تھی تاکہ ان کی روشنی میں وہ اپنے انتظامی ڈھانچہ کو ڈھال سکیں۔ اور ان روایات و رسومات کو اپنائیں کہ جن کے ذریعہ مغل حکمرانوں نے اپنی رعیت کو وفادار بنا رکھا تھا اور ایک بڑی سلطنت کو قائم کر رکھا تھا۔

ابتدائی برطانوی مورخین جنھوں نے اس عہد کی تاریخ لکھی ان کا تعلق منتظمین کے طبقہ سے تھا اور وہ اپنی انتظامی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تاریخ پر مواد جمع کر کے مختلف موضوعات پر لکھتے بھی رہے' ان کی مدد اکثر ہندوستانی منشی کرتے تھے جو فارسی کی ہم عصر کتابوں سے ترجمہ کر کے انہیں مواد فراہم کرتے تھے۔ ان ابتدائی مورخین نے اس مواد کو استعمال کرتے ہوئے عہد وسطی کی تاریخ کو بیان کیا اور واقعات و حالات کا تجزیہ نہیں کیا۔ شروع شروع میں فرشتہ کی کتاب سے کہ جس میں عہد وسطی کے مسلمان شاہی خاندانوں کی تاریخ ہے اس سے جیمس مل' جی آر' گلانگ اور الفنٹن نے استفادہ کیا اور واقعات کی اسی طرح دہرایا' اس کتاب کی افادیت دیکھتے ہوئے اس کا ترجمہ ڈو اور پھر برگ نے کیا۔

عہد وسطی کی تاریخ پر کام کرنے والے انگریزوں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: اول وہ جو کہ روشن خیال تھے' ان میں اے' ڈو' جے اسکاٹ' اور جے برگ ہیں۔ دوم وہ کہ جنھوں نے مذہبی نقطہ نظر سے تاریخ لکھی ان میں سی۔ گرانٹ مارش من پیگس اور جے واہان تھے' تیسرے نظریہ افادیت کے تحت لکھنے والے مورخ تھے' جن میں جیمس مل' پی ٹامسن' ایچ۔ ایلیٹ' اور ایچ۔ جی کین تھے' چوتھے وہ مورخ جنھوں نے رومانوی نقطہ نظر سے تاریخ لکھی ان میں ڈی۔ پرنس' گلانگ' اور انفنسن تھے لیکن ان چاروں جماعتوں کے مورخ اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت مغلوں سے بہتر ہے اور یہ رعیت کے لیے فلاح و بہبود کا کام کر رہی ہے۔

ان مورخین نے انتظامی سلطنت' سماجی رسم و رواج' اور عقائد کو فارسی ماخذ' یورپی سیاحوں کے سفر ناموں' آثار قدیمہ کی شہادتوں اور ادبی روایات کی بنیاد پر لکھا۔ ابتدائی دور میں ان کا رویہ ہمدردانہ تھا کیونکہ اس وقت برطانوی اقتدار مستحکم نہیں ہوا تھا اور انتظامی ڈھانچہ میں وہ مغلوں کی روایات اور رسومات کو استعمال کر رہے تھے اور برطانوی حکمران طبقے نے مغل کلچر کو اختیار کر رکھا تھا اور اس ثقافت سے ان کا جذباتی لگاؤ ہوگیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ان کا سیاسی اقتدار مضبوط ہوتا گیا وہ مغل انتظام سلطنت کی جگہ اپنی اصلاحات کا نفاذ

کرنے لگے اور ہندوستان کے معاشرہ اور اس کی روایات سے دور ہوتے چلے گئے۔ ان میں فاتح اور مفتوح اور حکمران و رعیت کے درمیان واضح فرق قائم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا چلا گیا' اس کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں ان کے رجحانات بدلتے گئے۔ چنانچہ ایلیٹ کے زمانہ سے برطانوی تاریخ نویسی کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں عہد وسطیٰ کے دور حکومت کے لیے حقارت کے جذبات ہیں اور برطانوی نسل پرستی اور اس کی عظمت اس عہد کی تحریروں میں پوری طرح سے نظر آتی ہے۔

ایلیٹ کی مرتب کردہ کتاب "ہندوستان کی تاریخ' ہندوستانی مورخوں کی زبانی" طویل عرصہ تک تاریخ نویسی کو متاثر کیا۔ اس کتاب کو اس نے ایک خاص نقطہ نظر سے مرتب کیا تھا۔ اور ہم عصر تاریخوں کے ان اقتباسات کا ترجمہ دیا تھا کہ جس سے اس عہد کے منفی پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہندوستان میں شاہی خاندانوں کی حکومت مشرقی مطلق العنانیت کی بدترین مثال تھی کہ جس میں عوامی فلاح و بہبود کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس کے نظریہ کے مطابق پورے دور کی تاریخ ہندو مسلم تصادم اور آپس کی جنگوں کی تاریخ ہے۔ اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کے مقابلہ میں برطانوی حکومت اہل ہندوستان کے لیے باعث نعمت ہے اور اس کی وفاداری میں ان کی فلاح و بہبود ہے۔

تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک عرصہ تک انتہائی اہم رہی کیونکہ اس وقت تک فارسی کے تمام ماخذ شائع نہیں ہوئے تھے اور قلمی نسخے ہر ایک کی دسترس میں نہیں تھے' دوسرے وہ مورخ جو فارسی سے ناواقف تھے ان کے لیے ان تراجم نے آسانی پیدا کردی۔ اس لیے تمام کمزوریوں کے باوجود یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ کا مواد فراہم کرتی ہے اور آج بھی اس کی اہمیت کم ہونے کے باوجود برقرار ہے جس کا اندازہ اس کے نئے ایڈیشنوں سے ہوتا ہے جو ہندوستان' پاکستان' برطانیہ' اور امریکہ سے چھپ رہے ہیں۔

ہودی والا نے اپنے ہندوستانی تاریخ کے مطالعاتی مضامین میں ایلیٹ کی کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور جب کہ اکثر فارسی ماخذ شائع ہوچکے ہیں اور ان میں سے اکثر کے انگریزی ترجمے بھی ہوگئے ہیں۔ ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے جو ایلیٹ کی کتاب کا نعم البدل ہو۔

عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی اس وقت اضافہ ہوا جب کہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کی

جانب سے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر بنیادی ماخذوں کو چھاپنے کا کام ہوا اور یہ کتابیں مختلف مسودوں کے موازنہ کے بعد ایڈٹ کر کے چھاپی گئیں' اس نے مورخوں کی پہنچ بنیادی مواد تک پہنچا دی اور وہ اس قابل ہو گئے کہ اس مواد کی مدد سے تاریخ نویسی میں جو نئی تحریکیں چل رہی تھیں اور تحقیق کے جو نئے انداز استعمال کیے جا رہے تھے' ان سے فائدہ اٹھائیں

ہندوستانی مورخوں سے پہلے جن برطانوی مورخوں نے اس عہد پر جدید تحقیق کی روشنی میں کام کیا اور ان میں انفنسٹن' اسٹیلے لین پول' ولیم اروِن' ایچ۔ بیورج' ارسکن وولزے ہیگ' وی اسمتھ اور ڈبلو۔ ایچ۔ مور لینڈ تھے۔ ان کے موضوعات سیاسی تاریخ' انفرادی حکمرانوں کے دور حکومت کا احوال' ان کی انتظامی اور مذہبی پالیسی تک محدود ہیں' اس وقت تک اس عہد کی ثقافتی تاریخ میں کسی نے دلچسپی نہیں لی تھی۔

عہد وسطیٰ کی جدید تاریخ نویسی میں سرسید احمد خاں کا اہم کردار ہے۔ مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی انہوں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ حالات اب مغلوں کے خلاف ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں ابھرتی ہوئی طاقت ہے۔ ان کے خیالات میں مزید تبدیلی 1857ء کے بعد آئی جس میں ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر قتل و غارت گری اور خون ریزی سے گزرے اس کے بعد سے ان کی یہ کوشش رہی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی حکومت سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمان معاشرہ کی اس ذہنیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ ان کی مذہبی اور سیاسی، ،اداریاں ہندوستان سے باہر امت اسلامیہ اور خلیفہ کے ساتھ ہیں' اور جب تک یہ وفاداری ختم نہیں ہوگی اس وقت تک وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت سے وفادار نہیں رہیں گے۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کی تشکیل کی طرف توجہ دی تاکہ ہندوستان کے مسلمان اپنی تاریخ سے واقف ہو کر اس پر فخر کریں اور اپنی وفاداری کو باہر منتقل نہیں کریں۔ اگرچہ سرسید 1847ء میں آثار الصنادید لکھ چکے تھے۔ مگر 1857ء کے بعد انہوں نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے تین اہم بنیادی ماخذوں کو ایڈٹ کر کے چھاپا' یہ آئین اکبری تزک جہانگیری اور طبقات ناصری تھے۔

سرسید کے مقاصد کو بعد میں مولوی ذکاء اللہ نے آگے بڑھایا جنہوں نے تاریخ ہند کے نام سے عہد وسطیٰ کے مسلمان حکمران خاندانوں کی سیاسی تاریخ لکھی' ذکاء اللہ جدید تحقیق سے واقف نہیں تھے اس لیے انہوں نے تاریخ نویسی کے قدیم طریقہ کو اختیار کرتے

ہوئے محض ہم عصر ماخذوں کی مدد سے تاریخ کو بیان کیا۔ ان کے ہاں نہ تو تجزیہ ہے نہ تنقید وہ اپنی تاریخ میں مسلمان حکومت کے دوران جو قانون' اخلاق' ادب اور آرٹ میں ترقی ہوئی اسے بیان کرتے ہیں اور اس دور کے انتظام سلطنت کو رعایا کے لیے فلاح و بہبود کا باعث سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوؤں کے پاس کوئی تہذیب نہیں تھی۔ یہ کام مسلمانوں نے کیا کہ انہوں نے اہل ہند کو تہذیب سکھائی۔

عبدالحلیم شرر نے عہد وسطی کی تاریخ پر سندھ میں عربوں کی فتح کی تاریخ لکھی' مگر اس کتاب کی بنیاد بھی ماخذوں پر ہے اور انہوں نے بھی واقعات کو تجزیاتی طور پر نہیں دیکھا' ان کی کتاب "مشرقی تمدن کی آخری بہار" ہم عصر تاریخ ہے یہ لکھنؤ کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ ہے جس کے عینی شاہد وہ خود تھے' اس میں وہ اس نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں آخر وقت میں بھی لکھنؤ کے تمدن نے بڑے بڑے صاحب فن و ہنر پیدا کیے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمدن زوال پذیر نہیں بلکہ جاندار تھا' اس کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ تمدن تھا جو صرف حکمران طبقوں نے مشاغل کے طور پر پیدا کیا اور اسی لیے یہ معاشرہ میں کوئی ذہنی اور فکری تبدیلی نہیں لاسکا۔

ہندوستان کا معاشرہ 1857ء کے المیہ کے بعد جس مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا' اس کی وجہ سے مسلمان معاشرہ تاریخ سے اپنی دلچسپی کھو بیٹھا تھا۔ پیٹر ہارڈی نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ سے دوری کی ایک وجہ یہ تھی کہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا خاتمہ غدر' انگریزوں کی کامیابیاں اور معاشرتی انتشار نے انہیں مغل حکومت اور کلچر سے دور اور محروم کردیا تھا۔ اس وقت جب کہ مسلمانوں کی وفاداری مشکوک سمجھی جارہی تھی۔ اگر وہ مغل دور کی شان و شوکت بیان کرتے تو اس سے انگریز حکومت کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔ اس وجہ سے عہد وسطی کی تاریخ پر کام کرنے کا حوصلہ کسی کو نہیں ہوا' اور اس کے بجائے مسلمانوں مورخوں نے اسلامی تاریخ کی طرف توجہ دی ان میں شبلی اور عبدالرزاق کانپوری قابل ذکر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ کے مقابلہ میں عہد وسطی کی ہندوستانی تاریخ کی اہمیت گھٹ گئی اور پان اسلام ازم اور ترکی سے محبت کے جذبات بڑھ گئے' جس کی وجہ سے آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی قومی جنگ امت اسلامیہ کے مسائل پر لڑی۔

شبلی نے تاریخ نویسی کے سلسلہ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی' جہاں ہندوستان کی تاریخ پر جو کام ہوا اس کے اہم بنیادی عناصر مغرب سے مخالفت اور پان اسلام ازم تھے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ہندی مسلمان اور ان کا کلچر غیر ملکی ہیں۔ یہ ہندوستان میں چونکہ آکر بس گئے ہیں اس لیے ہندو تہذیب کو تسلیم تو کرنا چاہئے مگر اس سے کسی قسم کا اشتراک ممکن نہیں۔ انہوں نے بھی اس خیال کو دہرایا کہ مسلمان ہندوستان میں ایک ترقی یافتہ تہذیب اپنے ہاتھ لائے تھے جس نے ہندوستان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

انگریزی میں مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ نے 1920ء کی دھائی میں لکھنا شروع کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان کے مسلمان پان اسلام ازم اور خلافت کی تحریکوں میں والہانہ طور پر حصہ لے رہے تھے۔ ان مورخوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے' اول وہ جو دونوں مذہبی قوموں میں کسی اشتراک کو تسلیم نہیں کرتے تھے' دوسرے وہ جو قومیت کے نظریہ کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک عناصر کو ابھارنا چاہتے تھے' اور تیسرے گروہ میں وہ تھے جو اس مسئلہ پر خاموش تھے۔

وہ مسلمان مورخ جنہوں نے تاریخ کو مذہب کے زیر اثر لکھا اس میں مسلمانوں کو بحیثیت فاتح پیش کیا اور ہندوؤں کو شکست خوردہ' وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ اچھا سلوک کیا' ان کے مندروں کو نہیں ڈھایا اور جزیہ کا نفاذ کرکے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا انہوں نے اس نظریہ کے تحت اسلام کی آفاقیت اور رواداری کا پرچار کیا اور یہ ثابت کیا کہ مسلمان مساوات اور امن کے حامی ہیں۔ اشتیاق حسین قریشی کا تعلق اسی جماعت سے ہے انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت فلاحی حکومت ثابت کیا ہے کہ جس نے مذہبی رواداری اور تعصب کے بغیر عدل و انصاف کی بنیاد پر معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔

اس تاریخ نویسی نے ہندوستان میں فرقہ واریت کے بیج بوئے' اس کے رد عمل میں ہندو مورخوں نے عہد وسطی کے مسلمان دور حکومت پر اعتراضات شروع کردیئے کہ مسلمان حکمرانوں کی فتوحات نے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی ترقی کو روک دیا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ کی اور یہاں کے باشندوں کا قتل عام کیا' خود کو ہمیشہ غیر ملکی سمجھا اور یہاں کی تہذیب میں اپنے آپ کو نہیں ڈھالا۔ انہوں نے تاریخ میں ان پہلوؤں کی جانب توجہ دی جن میں ہندو مسلم تصادم شدید تھا اور جن میں ہندو مزاحمت

کامیاب ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں خصوصیت سے ٹاڈ کی راجپوتانہ کی تاریخ ایک نمونہ بنی اور مرہٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے اپنی فتوحات کو جو مسلمانوں کے خلاف ہوئیں تھیں انہیں خوب ابھارا۔ اس ذریعہ سے وہ برطانیہ کے اس دعویٰ کو بھی رد کرنا چاہتے تھے کہ ان میں اپنی دفاع کی صلاحیت نہیں اور وہ بغیر برطانیہ کے اپنا تحفظ نہیں کرسکیں گے، اور ساتھ ہی میں یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہندو بزدل اور ڈرپوک نہیں بلکہ بہادر اور جری ہے۔

جادوناتھ سرکار جب بحیثیت مورخ ہندوستان کی تاریخ کے کسی عہد پر کام کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے پہلے 1857ء اور ٹیپو سلطان پر کام کرنے کا ارادہ کیا، مگر انہیں فوراً" اس بات کا احساس ہوگیا کہ ان پر کام کرنے کے نتیجہ میں انگریزی حکومت کی ناراضگی مول لی جاسکتی ہے، اس لیے انہوں نے ان موضوعات کو چھوڑ کر مغلوں اور مرہٹوں کی تاریخ کو منتخب کیا۔ یہ وہ پہلو تھا کہ جس پر انگریز حکومت کو کوئی اعراض نہیں ہوسکتا تھا اور اس میں ہندو مسلم تصادم کی کہانی بیان کرکے قومی تحریک کو نقصان پہنچنا تھا، اس وجہ سے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں فرقہ وارانہ جذبات نے دونوں قوموں میں نفرت کے جذبات پیدا کئے، اور دونوں نے اپنے اپنے مذہبی ہیروز کو تاریخ میں تخلیق کیا اور ان سے جذباتی لگاؤ پیدا کرکے ایک دوسرے کے خلاف نفرت و تعصب کو ہوا دی۔ جو تاریخ فرقہ وارانہ نظریات کے تحت لکھی گئی اس میں واقعات کو مسخ کیا گیا اور تاریخ نویسی کو منفی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔

ہندوستان میں قومیت کی تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کردیا تھا۔ قومیت کے جذبہ کے تحت جو تاریخ لکھی گئی اس میں ہندو مسلم اشتراک نمایاں تھا۔ مورخین نے اس بات کی شعوری کوشش کی کہ ہندوستان کے ماضی کو شاندار طریقہ سے تشکیل دیں تاکہ لوگوں میں اعتماد پیدا ہو، احساس کمتری دور ہو اور وہ برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کرسکیں۔ اس مقصد کے لیے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں کافی مواد تھا، خصوصیت سے مغل عہد پر اس لیے ہندوستانی مورخوں نے جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی انہوں نے اس دور کی شان و شوکت اور عظمت کو ابھارا اور تاریخ نویسی کے ذریعہ ہندو مسلم اشتراک اور ہم آہنگی کو نمایاں کیا۔ ان کے نظریہ کے مطابق ہندو محض رعایا نہیں تھے بلکہ انہیں مساوی حقوق ملے ہوئے تھے اور حکومت میں ان کی شرکت ظاہر کرتی ہے کہ اقتدار میں یہ بھی شریک تھے۔ اس دور میں جو ثقافت ابھری اس کی ترقی میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ انہوں نے فرقہ پرستوں کے برخلاف رانا پرتاب اور شیوا جی کی بغاوتوں کو دو

زمینداروں کی بغاوت سے موسوم کیا کہ جنہوں نے بغاوت کر کے مغلوں کی اس جدوجہد اور کوشش میں رکاوٹ ڈالی کہ جس کے تحت وہ ہندوستان کو متحد کرنا چاہتے تھے اور اگر ان کی کوشش کامیاب ہوجاتی تو ان کے نتیجہ میں ایک متحدہ قوم ابھرتی۔ اس سلسلہ میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور ایشوری پرشاد' بینر جی اور سکینہ' نے عہد وسطی کی سیاسی تاریخ پر کام کیا' ان کے علاوہ قانون گو اور علی گڑھ کے پروفیسر محمد حبیب قابل ذکر ہیں کہ جنہوں نے تاریخ کو قومی اور سیکولر نقطہ نظر سے لکھا۔

مسلمان قوم پرست مورخوں کے لیے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ عہد وسطی کی تاریخ کے کس پہلو کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کریں' خصوصیت کے ساتھ وہ مورخ جو ترقی پسند یا مارکسی سوچ رکھتے تھے' اگر وہ بادشاہوں کی شخصیتوں کو بڑھاتے ہیں تو اس سے حکمران طبقوں اور اداروں کو تقویت پہنچتی تھی' اس لیے انہوں نے بادشاہوں کی سیاسی تاریخ کو نظر انداز کرکے عہد وسطی میں صوفیا کی زندگی اور ان کی تعلیمات پر تحقیق کی۔ اور ان پر لکھتے ہوئے انہوں نے صوفیا کی تعلیمات کے ذریعہ ہندو مسلم اشتراک اور ہم آہنگی کو اجاگر کیا اور ان کے عوام کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس اثر کو پیدا کیا کہ صوفیاء کا تعلق عوام سے رہا حکمرانوں سے نہیں۔ اس لیے ان کی شخصیات میں وہ اثر تھا کہ انہوں نے تمام طبقوں اور مذہبوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ اس کا مطالعہ علی گڑھ سے پروفیسر محمد حبیب نے کیا مگر وہ صوفیاء کی تعلیمات کے منفی اثرات کو نظر انداز کرگئے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ آج تک ترقی پسند خیالات رکھنے والے مورخ صوفیا کی شخصیتوں اور تعلیمات میں اشتراک اور آہنگی دیکھتے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ساتھ ہی میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام ان کی وجہ سے پھیلا۔ جب کوئی شخص ایک مرتبہ کسی عقیدہ کا مبلغ بن گیا تو پھر وہ کس طرح سے دوسروں کے لیے روا دار اور غیر متعصب ہوسکتا ہے۔ اور کس طرح سے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں ملا سکتا ہے۔

اس عہد کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ مغربی تحقیق سے مستفید ہو کر ہندوستانی مورخین نے ہم عصر ماخذوں کی غلطیاں نکال کر بہت سے تاریخی مفروضوں کو درست کیا' مثلاً" مہدی حسن نے محمد تغلق پر تحقیقی کام کیا اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں اس کی جو شخصیت ابھرتی تھی اور اسے مجموعہ اضداد کہہ کر اس کی اصلاحات اور منصوبوں کو ناقابل عمل بتایا گیا تھا' مہدی حسن نے دوسرے ہم عصر ماخذوں کی مدد سے اسے غلط

ثابت کیا اور کوشش کی کہ محمد تغلق کی متوازن شخصیت کو تشکیل دیں۔ اسی سلسلہ میں کے۔ ایس۔ لال کی کتاب ہسٹری آف دی خلجیز ہے۔ جس میں اس نے علاؤ الدین کی شخصیت اور اس کی اصلاحات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کی اصلاحات ہندو زمینداروں کے خلاف تھیں عام ہندوؤں کے نہیں۔

اس عہد کی تاریخ نویسی کے زیادہ موضوعات سیاسی تھے اور ان موضوعات کے ذریعہ مورخوں نے ہم عصر سیاسی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کیا اور ماضی کی بات کرکے حال کے مسائل کی ان میں عکاسی کی۔ اس کے علاوہ چونکہ سیاسی تاریخ کا مواد آسانی سے میسر آگیا جب کہ ثقافتی تاریخ کے لیے مواد اکٹھا کرنا مشکل تھا۔

جدید مورخین نے بھی ہم عصر مورخوں کی طرح حکمرانوں کی شخصیتوں اور کردار کو اپنا موضوع بنایا اور ان کی طاقت و قوت کی تعریف کی اس طرح انہوں نے تاریخی عمل کو حکمران کی مرضی قرار دیا۔ مثلاً" بلبن اس لیے مطلق العنان تھا کہ اس کے مزاج میں سختی تھی یا علاؤ الدین نے اس لیے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا کہ وہ ذاتی طور پر اس کا خواہش مند تھا اور اکبر نے آزادانہ پالیسی اس لیے شروع کی کہ وہ فطری طور پر صلح کل اور مذہبی تعصب سے آزاد تھا۔ انہوں نے تاریخ کے عمل اور اس کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ تاریخی تبدیلیاں محض ایک شخص کی وجہ سے نہیں آتی ہیں۔ بلکہ اس کے پس منظر میں پورے معاشرہ کا ذہن کام کرتا ہے۔ وقت کے تقاضے' مفادات اور حالات تاریخ کے عمل کو تبدیل کرتے ہیں۔

سیاسی موضوعات کے علاوہ انتظامی پہلوؤں پر آر۔ پی۔ ٹری پاٹھی' ابن حسن' اشتیاق حسین قریشی' اور مور لینڈ ہیں۔ آثار قدیمہ پر جنرل کننگھم اور جان مارشل علم کتبات پر جان موررووٹز' سکہ شناسی پر اسٹینلے لین پول' اور جے ٹیلیس رائٹ کا کام ہے۔ کنور اشرف نے عہد وسطیٰ کی سیاسی و معاشی اور معاشرتی تاریخ پر کام کیا۔ اس عہد کے ثقافتی اور معاشی پہلوؤں پر تقسیم کے بعد سے کام ہوا۔

برطانوی عہد اور قومی تحریکیں

برطانوی مورخ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی ہندوستان کی فتح میں ان کی

اخلاقی برتری کو دخل تھا۔ اور برطانوی اقتدار نے ہندوستان کو پہلی مرتبہ متحد کیا اور یہاں کی نسلی، لسانی اور جغرافیائی حدود کو ختم کیا۔

اس کے رد عمل کے طور پر ہندوستانی مورخ برطانوی فتوحات کو ان کی چالاکی، دھوکہ بازی اور ہندوستانیوں کی غداری قرار دیتے ہیں۔ ہر کامیابی کے پس منظر میں اہل برطانیہ کی سازش اور دھوکہ بازی نظر آتی ہے اور کہیں بھی ان کی اخلاقی برتری کا ثبوت نہیں ملتا۔ پلاسی کی جنگ، ٹیپو سلطان کی شکست، سکھوں کی ناکامی اور اہل سندھ کا مفتوح ہونا، یہ سب اخلاقی برتری کے ذریعہ نہیں بلکہ سیاسی جوڑ توڑ کے ذریعہ حاصل کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان تمام برطانوی شخصیتوں پر کہ جن کو بطور ہیرو پیش کیا گیا تھا سخت تنقید کی اور ان کی بدعنوانیوں کو ظاہر کیا ان میں کلائیو، وارن ہسٹنگ، اور ویلزلی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے مقابلہ میں وہ ہندوستانی جنہوں نے ان کے خلاف مزاحمت کی ان کو بطور ہیرو پیش کیا جیسے سراج الدولہ، میر قاسم اور ٹیپو سلطان وغیرہ۔

ہندوستانی مورخوں نے ان پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا جو کہ برطانوی اقتدار کے نتیجہ میں متاثر ہوئے تھے، برطانوی اقتدار نے ہندوستان کے معاشی اور سماجی نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اور اپنے مفادات کے تحت اس ملک کی صنعت و حرفت کو تباہ و برباد کر دیا تھا، چنانچہ اس کے نتیجہ میں زراعت، تعلیم اور تجارت سب متاثر ہوئیں۔ ان پہلوؤں کا تاریخی تجزیہ کرنے کے بعد مورخوں نے برطانوی تاریخ دانوں کے وہ تمام دلائل رد کر دیئے کہ جن کے تحت انہوں نے اپنی آمد اور اقتدار کو ہندوستان کے لیے باعث نعمت قرار دیا تھا۔ اور ہندوستان میں اپنی حکومت کو انسانیت اور تہذیب کی علامت ثابت کیا تھا۔ دادا بھائی نوروجی اور آر۔ سی۔ دت نے خصوصیت سے برطانوی معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کو اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا کہ کس طرح ہندوستان کی دولت یہاں سے برطانیہ منتقل ہوئی۔

ہندوستانی مورخوں نے برطانوی حکومت اور اس کے سیاسی اداروں پر بھی تنقید کی کہ اس کی بنیاد حکومت اور رعیت کے درمیان اچھے جذبات پر نہیں بلکہ ظلم و سختی، تشدد، مخبری اور جاسوسی کے ذریعہ ہے۔ حکومت کی اصلاحات کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دکھایا گیا اور اس کی اہمیت کو کم ثابت کیا، مثلاً" برطانوی نظام تعلیم کے بارے میں کہا گیا کہ اس نے محض کلرک پیدا کئے ہیں۔

قومیت کے زیر اثر ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل نئے سرے سے ہوئی۔ اس سلسلہ

میں ان تاریخی اصطلاحات کو بھی تبدیل کیا گیا جنہیں اب تک برطانوی مورخین استعمال کررہے تھے مثلاً" 1857ء کے ہنگامہ کو انگریز غدر کہتے تھے' ان کے خلاف جن شخصیتوں نے لمزاحمت کی تھی انہیں باغی اور مجرم گردانتے تھے۔ ان اصطلاحات کے خلاف رد عمل کا اظہار شدت کے ساتھ کیا گیا' وی' ڈی۔ ساورکر نے 1857ء کو جنگ آزادی کا نام دیا' اور برطانوی راج کی مخالف کرنے والے ہیرو اور مجاہدین بن گئے۔ تحریک آزادی کے دوران خصوصیت سے مزاحمتی تحریکوں پر تحقیق کی گئی اور ان کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔

جب ہندوستان میں قوم پرستی کی تحریکیں کامیاب ہوئیں اور عوام میں ان کی مقبولیت بڑھی تو برطانوی مورخین نے اپنے نقطہ نظر کو تبدیل کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قومی تحریکوں کی مقبولیت اور کامیابی کی وجہ مغربی تعلیم اور برطانوی لبرل ازم ہے۔ کیمرج ہسٹری آف انڈیا میں اس نقطہ نظر کی اس طرح سے وضاحت کی گئی کہ برطانوی اقتدار نے ایک بے ترتیب اور منتشر ملک کو متحد کرکے یہاں سے مطلق العنانیت کو ختم کیا اور قانون کی بالا دستی کو قائم کیا۔ اس لیے ہندوستان کے موجودہ سیاسی اداروں کی تشکیل میں قدیم ہندوستان کے ورثہ کو دخل نہیں۔ بلکہ یہ تمام روایات برطانیہ کی قائم کی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کا نیا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ جس نے قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ برطانوی نظام کی پیداوار ہے۔ اس لیے جب متوسط طبقہ نے سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا تو اس کے لیے انہوں نے قدیم ہندوستان کی طرف نہیں بلکہ مغرب کی طرف دیکھا۔ 1932ء میں اے۔ آر۔ جان میریوٹ نے لکھا کہ ہندوستانی قومیت برطانوی پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ اور انگریزی ہندوستان کی لنگوافرانکا بن گئی۔ جس نے ہندوستان کے متوسط طبقے کو آپس میں ملا دیا۔ ایل۔ ایس۔ او مولے نے اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا کہ برطانیہ نے ہندوستان کو بہترین طرز حکومت دیا اور پوری انیسوی صدی میں برطانوی حکومت ہندوستان کو انصاف فراہم کرتی رہی کرزن کے بعد ہندوستانیوں کو انتظامی امور میں تربیت دی جانے لگی۔ پروفیسر فلپ کی راہنمائی میں لندن یونیورسٹی میں ہندوستان کی تحقیق پر جو کام ہوا اس میں اسی نقطہ نظر کو پیش کیا گیا کہ ہندوستانی قومیت برطانوی پالیسی اور تعلیم کا نتیجہ تھی اور 1947ء کی آزادی برطانوی پالیسی کی انتہا تھی جو اس نے اپنے قیام سے شروع کی تھی۔

برطانوی مورخوں نے ہندوستان کی جدید تاریخ کو دستوری نقطہ نظر سے لکھا اور اس

کی بنیاد سرکاری دستاویزات' عہدے داروں اور حکومت کے درمیان خط و کتابت' اور نجی کاغذات تھے اس لیے ان کے موضوعات سیاسی رہے اور ان میں انتظامی امور' عہدے داروں کے اختلافات اور دارالعلوم میں مختلف جماعتوں کا کردار ہے۔ ان تاریخوں میں ہندوستانیوں کا کردار اور تاریخ کی تشکیل میں ان کے حصہ کا ذکر نہیں۔

دوسرا پہلو ان کی تاریخ نویسی کا یہ ہے کہ آج ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ برطانوی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی معاشرہ کی سماجی' معاشرتی اصلاحات برطانوی حکومت کا تحفہ ہیں۔ اس ضمن میں ان ہندوستانیوں کی کوششوں کا کوئی ذکر نہیں جو انہوں نے معاشرہ کی اصلاحات کے لیے کیں۔ مثلاً" یہ کہا گیا کہ ہندوستان سے ستی کی رسم کا خاتمہ لارڈ بینٹنک کی اصلاحات کے نتیجہ میں ہوا' اس سلسلہ میں راجہ رام موہن رائے کی ان کوششوں کو بیان نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ہندو معاشرہ ذہنی طور پر اس رسم کو ختم کرنے پر تیار ہوا۔ کوئی اصلاح محض حکومت کے اعلان سے کامیاب نہیں ہوتی جب تک کہ لوگوں کا ذہن تبدیل نہ ہو' ورنہ ستی کی رسم تو اکبر نے بھی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر لوگ چونکہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے محض شاہی حکم سے یہ ختم نہیں ہوئی۔

اسی عہد میں ہندوستان کی معاشی تاریخ پر بھی کام کی ابتدا ہوئی۔ مارکسی نقطہ نظریہ سے ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ لیا' گیا ان میں ایم۔ ان۔ رائے کی 1922ء میں لکھی گئی کتاب انڈیا ان ٹرانزیشن۔ 70 - 1926ء میں چھپنے والی پام دت کی کتاب ماڈرن انڈیا اور 1948ء میں ایس۔ اے۔ ڈانگے کی کتاب انڈیا فرام پری میٹیو کیمونزم ٹوسلیوری قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے بدلتے ہوئے رجحانات پر ڈبلیو سی۔ اسمتھ کی کتاب ماڈرن اسلام ان انڈیا' جو 1943ء میں چھپی اور جس پر ہندوستان میں پابندی لگا دی گئی' ایک اہم کتاب ہے۔

آزادی کے بعد

آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے مورخوں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ تاریخ نویسی کو نو آبادیاتی نظریات' روایات اور دائرہ سے آزاد کرکے اسے نئے حالات اور تقاضوں کے تحت تشکیل دیں۔ نو آبادیاتی دور میں تاریخ نویسی قوم پرستی فرقہ واریت اور

امپیریل ازم کے ہاتھوں جو مسخ ہوئی تھی اس سے اسے آزاد کرا کے' وسیع بنیادوں پر اس کی ساخت اور ہیئت کو بدلا جائے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد سے تاریخ نویسی میں بڑی تبدیلیاں آئیں اور وہاں قدیم ہندوستان' عہد وسطی' برطانوی دور اور تحریک آزادی پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے کام ہوا' خصوصیت سے قدیم ہندوستان پر کیونکہ ہندوستانی قوم اپنی شناخت کی تلاش میں ہے اور وہ اپنی تاریخی قدامت اور قدیم تہذیب کی برتری کو تسلیم کرانا چاہتی ہے۔ اس لیے سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سماجی' ثقافتی' معاشی اور ادبی تاریخ پر کام ہو رہا ہے۔ پرانے مفروضوں کو توڑا جا رہا ہے اور تاریخ کے نئے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ تاریخ کا نیا مواد سامنے آنے کے بعد بہت سے تاریخ نظریات کو تبدیل کرنا پڑا' ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی۔ آر۔ ایس۔ شرما اور رومیلا تھاپر نے قدیم ہندوستان کی تاریخ کو نئے انداز سے تشکیل دے کر اسے جاندار بنا دیا ہے۔

عہد وسطی کی تاریخ نویسی میں ہندوستانی مورخین بڑی تبدیلیاں لائے۔ خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی کا شعبہ تاریخ جو اس عہد کی تاریخ کا مرکز بن گیا۔عرفان حبیب' اطہر علی' نورالحسن' ستیش کمار' اقتدار عالم خان' اقتدار حسین صدیقی اور محمد ضمیر ملک نے سیاسی و ثقافتی اور معاشی موضوعات پر لکھا۔ عہد وسطی کی تاریخ کے بارے میں ان کے خاص خاص استدلال یہ ہیں: ہندوستان میں مسلمان حملہ آور محض لوٹ مار کی غرض سے آئے تھے اور فتوحات کے ذریعہ انہوں نے اپنی دنیاوی ضروریات کو پورا کیا اس سلسلہ میں نہ تو ان کا کوئی مذہبی مشن تھا اور نہ ہی وہ اسلام کی تبلیغ میں کوئی دلچسپی رکھتے تھے۔ صرف موقع پرستی کے تحت انہوں نے مذہبی نعروں کو استعمال کیا۔ عہد وسطی کے تمام مسلمان حکمرانوں کے لیے اپنی سلطنت و اقتدار کا استحکام زیادہ ضروری تھا' اور اس کی روشنی میں انہوں نے اپنے قوانین' ضابطے اور اداروں کی تشکیل کی۔ ان کا رعیت کے ساتھ رابطہ محض سیاسی ضروریات کے تحت تھا چونکہ تمام حکمران طبقے ظالم ہوتے ہیں اس لیے عہد وسطی کے حکمران طبقے بھی ظالم اور غاصب تھے۔ یہ مورخین عہد وسطی کی تاریخ کو ہم عصر تاریخی پس منظر میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ تاکہ اس عہد کے ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے تمدن اور ثقافت کا تقابلی جائزہ لیا جاسکے اور یہ دیکھا جاسکے کہ تاریخی عمل مختلف ملکوں میں کیوں

یکساں نہیں رہا۔

ہندوستان میں نو آبادیاتی دور پر بپن چندر، پٹن رائے چودھری اور دوسرے مورخ قابل ذکر ہیں۔

اس کے مقابلہ میں پاکستان میں قدیم پاکستان کی تاریخ پر بہت کم کام ہوا ہے۔ آثار قدیمہ کے سلسلہ میں ایف۔ اے خاں اور حسن دانی کے نام خاص طور سے لیے جاسکتے ہیں۔ عہد وسطی کی تاریخ میں اشتیاق حسین قریشی اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے تاریخ نویسی میں انتہا پسند مذہبی نقطہ نظر کو اختیار کیا ہے۔ وہ اکبر کو مغل سلطنت کے زوال کا اس لیے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ اس نے ہندوؤں کو اقتدار میں شریک کرکے ان کی طاقت کو مضبوط کیا۔ مغل سلطنت کو وہ ایک فلاحی ریاست سمجھتے ہیں تحریک آزادی کے سلسلہ میں وہ دو قومی نظریہ کے زبردست حامیوں میں سے ہیں۔ ان کے علاوہ ریاض الاسلام اور احمد بشیر نے عہد وسطی پر کام کیا۔ اس میں ریاض الاسلام نے عہد مغلیہ میں ہندوستان و ایران کے تعلقات پر لکھا ہے جب کہ احمد بشیر نے اکبر کی مذہبی پالیسی کو ہم عصر ماخذوں کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

پاکستان میں تحریک آزادی کی تاریخ کو دو قومی نقطہ نظر سے لکھا جارہا ہے اور احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور سرسید کے نظریات کو بنیاد بنا کر تاریخ کو اس خاکہ میں لکھا جارہا ہے۔ آزادی کی کامیابی کا سہرا صرف شخصیتوں کے سرباندھا جارہاہے اور اس میں سے عوامی جدوجہد کو بالکل خارج کردیا گیا ہے۔ پاکستان کی چالیس سالہ زندگی کی کوئی تاریخ نہیں۔ علاقائی تاریخ پر بھی زیادہ کام نہیں ہوا۔ سندھی ادبی بورڈ نے سندھ کی تاریخ کے ماخذ شائع کرکے مواد کو مورخوں کے لیے فراہم کردیا ہے۔ مگر سندھ کی مکمل تاریخ کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا وہ اب تک نامکمل ہے۔

برطانیہ میں آزادی کے بعد سے انگریز مورخین ہندوستان میں برطانوی دور حکومت کے فائدوں کو بیان کررہے ہیں ان کی دلچسپی آہستہ آہستہ عہد وسطی کی تاریخ سے کم ہوگئی ہے، لیکن برطانوی عہد اور تحریک آزادی پر وہ برطانوی دستاویزات نجی خط و کتابت اور یادداشتوں کی بنیاد پر تحقیق کررہے ہیں۔ خاص طور سے ان کی کوشش ہے کہ برطانوی سامراج کے اثرات کو کم سے کم کرکے بتائیں۔ اس سلسلہ میں کیمبرج اسکول نے جے، گالاگر کی راہنمائی میں امپیریل ازم کا جو نظریہ دیا ہے وہ اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ وہ

امپیریل ازم کو مقامی باشندوں کے تعاون کے ذریعہ کامیاب دکھاتا ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق ہندوستان میں انگریزوں نے نچلی سطح پر انتظام مقامی باشندوں پر چھوڑ دیا جو ریونیو جمع کرتے اور قانون کا نفاذ کرتے' اس سلسلہ میں جاگیرداروں اور ممتاز شخصیتوں سے تعاون حاصل کیا جاتا تھا ہندوستان میں راج کی یہ پالیسی تھی کہ کم سے کم معاملات میں دخل دیا جائے۔

یہ طریقہ اس وجہ سے ناکام ہوا اور زیادہ نہیں چلا کہ راج کے پاس ہمیشہ پیسہ کی کمی رہی' کیونکہ ہندوستان فطری طور پر غریب ملک رہا ہے' اس لیے انیسوی صدی کے آخر میں جب ملک کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی اور لندن سے مالی امداد کی امید نہیں رہی کیونکہ برطانوی حکومت ہندوستان سے پیسہ لینا چاہتی تھی دینا نہیں' اس لیے حکومت ہند کی یہ کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح مالی طور پر مستحکم ہوجائے اور یہ صرف اس صورت میں ہوسکتا تھا کہ ٹیکس کے نظام کو درست کیا جائے۔ اس ضرورت کی وجہ سے حکومت کو اپنے روایاتی نظام میں تبدیلی کرنی پڑتی' یعنی اقتدار میں ہندوستانیوں کو شریک کیا۔ اور ٹیکس جو اب تک کم شرح کے تھے ان میں اضافہ کر دیا۔ اس کا دباؤ اس مراعات یافتہ طبقہ پر ہوا کہ جس کا تعاون انہیں اب تک حاصل تھا۔ ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کونسل ایکٹس کے ذریعہ انہیں نمائندگی دی گئی اور اس طرح لوکل سیلف حکومت کی بنیاد پڑی۔ اس سے محدود الیکشن' سیاسی جماعتوں اور ووٹروں کے لیے کنویسنگ کی ابتدا ہوئی اور اس سے پرانے نظام کی جڑیں ہل گئیں۔

برطانوی مورخین اپنی تحقیق کے ذریعہ اس بات کی کوشش کررہے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی راج کی تمام غلطیوں سے اسے پاک کردیں۔ پیٹر ہارڈی کی کتاب ہندوستان مسلمان برطانوی دور میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنگ آزادی کے بعد برطانیہ نے مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں کئے بلکہ اس کے برعکس ان کی سرپرستی کی اور انہیں زمینیں و انعامات دیئے۔

برطانیہ کے مقابلہ میں یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں میں برصغیر کی تاریخ پر جو کام ہو رہا ہے اس میں چونکہ ان کا تعلق ہندوستان سے نو آبادیات کے طور پر نہیں تھا اس لیے وہ آزادانہ نقطہ نظر کو اختیار کرتے ہیں اگرچہ ان کا نقطہ نظر ان کے مفادات کو ظاہر کرتا ہے۔

○

باب نمبر 5

یورپی تاریخ نویسی

یورپی تاریخ نویسی کی ابتداء دوسرے علوم کی طرح یونان سے کی جاتی ہے اگرچہ یونان میں ہومر سے پہلے انتہائی ترقی یافتہ تہذیب رہ چکی تھی مگر اس کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں تھا۔ ان کا تاریخ کا علم ٹروجن جنگ سے شروع ہوا۔ چونکہ ان کے ہاں بادشاہوں کا وجود نہیں تھا کہ جو اپنے کارنامے بطور یادگار لکھواتے' اس لیے 5 صدی ق۔ م تک کا زمانہ یونان کی تاریخ کا وہ زمانہ ہے کہ جس کے بارے میں معلومات بڑی محدود ہیں۔

یونانی زبان میں نثر لکھنے کی ابتدا ایونیا سے ہوئی' اور تاریخ نویسی کا بھی آغاز اسی علاقہ سے ہوا۔ جب یونان میں شہری ریاستوں کا قیام عمل میں آیا تو اس کی وجہ سے عام لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا' اور اس شعور نے ان میں تاریخ سے دلچسپی پیدا کی۔یونانی تاریخ نویسی کا ابتدائی موضوع جنگ سے متعلق رہا' کیونکہ جنگ کے اثرات معاشرے کے ہر طبقے اور فرد پر پڑتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی تبدیلیاں انقلابی اور سنسنی خیز ہوتی ہیں' اس لیے مورخ کو جنگ کا ایک ایسا موضوع ملا کہ جس کے ذریعہ وہ ان تبدیلیوں اور اثرات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ جنگ میں شریک ہونے والوں کی بہادری اور شجاعت کو ڈرامائی انداز میں پیش کر کے اپنے ہم وطنوں میں جوش و جذبہ پیدا کر سکتا تھا' اور اگر مورخ کا ذہن وسیع ہوتا تو اس صورت میں وہ مخالف قوم کی تاریخ اور ان کے رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالتا تھا۔

اس وجہ سے یونان کے ابتدائی مورخوں نے جنگوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ہیروڈوٹس (وفات: 430- ق۔ م) نے یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ کو تھیوسی ڈائڈس (4 صدی ق م) نے پی لی پونیشن جنگ کو اپنا موضوع بنایا۔ ان دونوں مورخوں نے تاریخ کو ان جنگوں کے پس منظر کے وسیع تناظر میں دیکھا' مثلاً ہیرو ڈوٹس نے تاریخ کی تشکیل میں

آب و ہوا، جغرافیائی اور مافوق الفطرت اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ جب کہ تھیوسی ڈائڈس نے اس نظریہ کو پیش کیا کہ انسانی فطرت ہر حالت اور ہر ماحول میں ایک جیسی رہتی ہے چونکہ واقعات ایک جیسے حالات میں خود کو دہراتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان سے سبق سیکھا جاسکتا ہے۔ دونوں مورخوں نے تہذیبوں کے عروج و زوال کے عمل کا مشاہدہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہر تہذیب کو نئے سرے سے اپنی ابتداء کرنی پڑتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ثقافتی ماحول سے متاثر تھے اور دیوتاؤں کی طاقت کو مانتے تھے مگر انہوں نے واقعات کو محض دیوتاؤں کی تخلیق نہیں سمجھا اور ان کا تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ تاریخ ایک چکر میں گردش کرتی رہتی ہے اور ایک جیسے واقعات خود کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اس لیے تاریخ حکمران طبقوں کی تربیت کرسکتی ہے اور یہ لوگ تاریخ سے عملی سبق سیکھ سکتے ہیں۔

رومی سلطنت کی ابتداء اور اس کے سیاسی عروج نے تاریخ نویسی میں بڑی تبدیلیاں کیں، کیونکہ سلطنت کی توسیع میں حصہ لینے والے مختلف عناصر تھے جن میں بادشاہ امراء فوج کے سپہ سالار اور جنرل جنگوں میں حصہ لیتے تھے جب کہ منتظمین ریاست کے ڈھانچہ کو بناتے اور امن کے زمانہ میں انتظام کو موثر بناتے تھے۔ اس لیے تاریخ میں بھی وسعت آئی اور جنگ کے ساتھ ساتھ اس میں سیاسی اداروں اور روایات کو بھی شامل کرلیا گیا۔ ساتھ میں جو مختلف اقوام مفتوح ہوئیں اور ان کے علاقوں پر قبضہ کیا گیا اس کی وجہ سے ان کی زبان اور رسم و رواج سے واقفیت نے رومی معاشرہ کے تجربات میں اضافہ کیا۔

تاریخ نویسی کو اس وقت اور فروغ ملا جب کہ رومی امراء کے خاندان کو اپنی تاریخ سے دلچسپی ہوئی کیونکہ وہ اپنے خاندان کی مراعات کو قائم رکھنا چاہتے تھے اس تاریخ کے ذریعہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو محفوظ کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے خاندان کی عظمت معاشرہ میں مستحکم ہوجائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے خاندان کے کاغذات کی حفاظت کی اور ان دستاویزات کی بنیاد پر رومی امراء اور اعلیٰ شخصیتوں کی سوانح حیات لکھی گئی، لیکن ظاہر ہے کہ اس مواد کی بنیاد جانبدارانہ تھی۔

رومی مورخوں کے لیے بھی جنگیں اہم موضوع رہیں، ان جنگوں میں شریک ہونے والے سیاست دانوں اور جنرلوں نے اپنی یادداشتیں لکھیں تاکہ اس ذریعہ سے وہ اپنے کارناموں کو صحیح ثابت کرسکیں، اس سلسلہ میں جولیس سیزر (44 ق۔ م) کی یادداشتیں بہت مشہور رہیں۔

مشہور رومی مورخ پولی بئیس (198 ق۔ م) اور سالسٹ نے جب رومی سلطنت کے زوال کا تجزیہ کیا تو اخلاقی کمزوریوں کو اس کی وجہ بتایا۔ ایک اور رومی مورخ لیوی (17ء) نے رومی تاریخ پر 142 کتابیں لکھیں' وہ روم کی عظمت سے بے انتہاء متاثر تھا اس لیے اس نے اس کی حمایت میں واقعات کو مسخ کیا۔ ایک اور مورخ ٹے سی ٹس (120ء) نے تاریخی کرداروں پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کو پیش کیا کہ ان کے اچھے کارنامے یاد رکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ برے آدمیوں کے اعمال کو آنے والی نسلیں معاف نہیں کرتیں۔

رومی تاریخ چونکہ ایک امپائر کی تاریخ تھی اس لیے اس کی تاریخ نویسی میں اس کے وسیع تجربات آ گئے تھے' اگرچہ زیادہ زور سیاسی واقعات پر دیا گیا اور معاشرے کے دوسرے پہلوؤں کو اہمیت نہیں دی گئی۔

ابتدائی عیسائیت اور عہد وسطی

یونانی اور رومی تاریخ میں دنیاوی معاملات سے دلچسپی تھی اور واقعات کے پس منظر میں سماجی و معاشی اور وجوہات کو دیکھا جانے لگا تھا۔ مگر عیسائیت کے ابتدائی دور میں تاریخ نویسی مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوئی۔ اب واقعات کا تجزیہ کرنے کی کوئی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی کہ یہ مشیت الٰہی سے ہوتے تھے اور انسان کی عقل و فہم سے بالاتر تھے۔ انہیں اس دنیا کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ ان کے نزدیک یہ دنیا فانی تھی اور اس کا انجام قریب تھا اس لیے ان کی دلچسپی آخرت سے تھی۔ عیسائیت کے مذہبی نظریہ نے تاریخ میں گردش کے نظریہ کو ختم کرکے تاریخی عمل کو قیامت کے ذریعہ ایک انجام تک پہنچا دیا کہ جہاں جا کر تاریخ ختم ہو جائے گی اور اس دنیا کا کوئی وجود برقرار نہیں رہے گا۔

ابتدائی عیسائیت میں تاریخ کی بنیاد بائبل پر تھی کہ جس میں ابتدائی ریاست کی تشکیل قوموں اور زبانوں کی تقسیم' اور صنعت و حرفت کی ابتداء جیسے اہم موضوعات تھے ان کے علاوہ اولیاء کی سوانح حیات اور عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کو تاریخ میں محفوظ کیا گیا۔ چونکہ عیسائی مورخ اپنے مذہب کو سچا مانتے تھے اس لیے انہوں نے کافر اور مشرک اقوام کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا اور صرف عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے تاریخ کو

استعمال کیا۔ ان عیسائی مورخوں میں دو مشہور ہوئے: ایوسی بیس اور جیرم۔ جیرم نے ماضی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے تاریخ میں تقویم کو استعمال کیا تاکہ واقعات کا یقین ہو سکے۔

عہد وسطی میں بھی تاریخ نویسی پر مذہب کا غلبہ رہا کیونکہ اکثر مورخ عیسائی تھے۔ اس لیے وہ تاریخ کی تعبیر و تفسیر مذہبی نقطہ نظر سے کرتے تھے اور تاریخی واقعات کی اس طرح سے تشریح کرتے تھے کہ یہ سب خدا کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ انہوں نے مادی ارتقاء اور دنیاوی واقعات کی طرف کم توجہ دی۔ گریگوری آف ٹور نے فرانس کی تاریخ میں معجزے بیان کئے ہیں اور چرچ کی اہمیت کو بتایا ہے اس نے تاریخ کو پند و نصیحت کے طور پر استعمال کیا ہے بیڈ کی تاریخ کو جو اس نے انگلستان کے چرچ پر لکھی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تاریخی مواد کو اس میں جمع کردیا ہے کہ اور معجزوں کی اہمیت کم کردی ہے۔

اس عہد میں تاریخ نویسی میں مزید ترقی اس وجہ سے ہوئی کہ شارلمن نے اپنی سلطنت میں خانقاہوں کے لیے یہ فرمان جاری کیا کہ وہ اس کی حکومت میں ہونے والے واقعات کو لکھیں۔ اس فرمان کے تحت راہبوں نے سالانہ واقعات کو موسم اور مہینہ کے حساب سے لکھنا شروع کردیا اس وجہ سے اس کے عہد کے سیاسی و سماجی واقعات تاریخ میں محفوظ ہوگئے۔ اور اس کو جب وسعت دی گئی تو اس نے وقائع نگاری کی شکل اختیار کرلی کہ جس کے ذریعہ کسی خانقاہ یا شہر کی تاریخ لکھی جاتی تھی۔

اس عہد کی تاریخ نویسی کی خصوصیت یہ تھی کہ صرف ہم عصر تاریخ لکھی جاتی تھی اور ماضی کی تاریخ کو بیان کرنے یا اسے نئے سرے سے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ تاریخ کو بحیثیت مضمون کے کوئی اہمیت نہیں تھی اور اسے تعلیمی اداروں میں علیحدہ مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن حکمران طبقوں کو تاریخ سے اس لیے دلچسپی تھی کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے خاندانوں کی افضلیت کو قائم رکھنا چاہتے تھے' اس لیے انہوں نے سرکاری دستاویزات' کاغذات اور شاہی فرامین و حکم ناموں کی حفاظت کی کہ جن کے ذریعہ انہیں جاگیریں عہدے اور مراعات ملیں تھیں مگر یہ مواد آگے چل کر تاریخ نویسی کے لیے مفید ثابت ہوا۔

لیکن عہد وسطی میں تاریخ نویسی کئی لحاظ سے کمزوریوں کا شکار رہی۔ اس وقت تک چھاپہ خانہ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے کتابوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی مسودوں اور سرکاری دستاویزات و کاغذات کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا جاتا تھا۔ مسودوں کی

نقل کے وقت جو غلطیاں کاتب کرتے تھے انہیں کو مورخ بھی دہراتے تھے' جعلی فرامین' شجرے' اور کاغذات کی چھان بین کا کوئی طریقہ دریافت نہیں ہوا تھا اس لیے ماخذ میں بیان کئے ہوئے واقعات کو بلا کم و کاست تسلیم کرلیا جاتا تھا۔

نشاۃ ثانیہ

تحریک نشاۃ ثانیہ نے ابتدائی عیسائیت اور عہد وسطیٰ کے ذہن کی تبدیلی میں نمایاں حصہ لیا' خصوصیت سے مذہبی تعصب' تشدد' اور تنگ نظری کی جگہ وسعت نظری اور آزاد خیالی پیدا ہوئی۔ چرچ کی بدعنوانیوں نے لوگوں کو مذہبی غلبہ سے آزاد کرکے اس کی جگہ انسانیت سے محبت کے جذبات کو پیدا کیا۔ شہروں کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے معاشرہ کی ثقافتی و معاشرتی اور معاشی زندگی میں تبدیلیاں آئیں اور توہمات کی جگہ باعمل زندگی اور عقل پرستی نے لے لی۔ تجارتی سرگرمیوں نے دوسری اقوام سے تعلقات میں وسعت پیدا کی اور نفع و نقصان کے تصور نے اخلاقی اقدار کو تبدیل کر دیا۔ ذہنی و فکری ساخت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اس فکری آزادی نے معاشرہ کو انسانیت سے نجات دلائی اور روحانیت کی جگہ دنیاوی اور مادی ضروریات نے لے لی۔ اس کی وجہ سے انسان کا رشتہ اس دنیا اور اس سے سرزمین سے ہوا اور اس میں یہ شوق بڑھا کر وہ اس دنیا کے بارے میں معلومات اکٹھی کرکے نہ صرف یہ کہ وہ اس دنیا کی تخلیق کے بارے میں جانے بلکہ اس میں بسنے والی اقوام اور ان کی تاریخ سے بھی واقفیت حاصل کرے۔

اس پس منظر میں تاریخ نویسی میں اہم تبدیلیاں آئیں۔ تاریخی واقعات کا تجزیہ کرتے وقت اب ان میں روحانی اثرات کو نہیں ڈھونڈا جاتا تھا بلکہ ان میں فطری وجوہات کو دریافت کیا جاتا تھا۔ تاریخ جو اب تک ادب کا ایک حصہ تھی' اس کی علیحدہ علم کی حیثیت ہوئی اس عہد میں انسان کو ماضی جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ اب مورخ محض ہم عصر تاریخ نہیں لکھتا تھا بلکہ وہ ماضی کی تشکیل بھی کرنے لگا۔ خصوصیت کے ساتھ اس عہد میں یونان اور روم کی تاریخ سے دلچسپی ہوئی' ان ملکوں کی تاریخ میں جو عظمت تھی اسے نشاۃ ثانیہ کے معاشرے میں اہمیت دی گئی اور انہوں نے اپنی بنیادیں یونان اور روم سے ملانا شروع کردیں۔ اس مقصد کے لیے قدیم مسودوں کی تلاش شروع ہوئی۔ 1455ء میں نے سی لس

کی دو کتابیں گرمنی کا (Germanica) اور اگری کولا (Agricola) اور 1506ء میں انلز (Annals) دریافت ہوئے۔ مسودوں کو قسطنطنیہ سے ڈھونڈ کر لایا گیا اور ان کے لاطینی زبان میں ترجمے ہوئے۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد نے ان کتابوں کی چھپائی اور اشاعت میں انقلابی طور پر حصہ لیا جس کی وجہ سے مواد مورخوں کی دسترس میں آگیا۔

ہیومنسٹ (انسان دوستی) تحریک کے زیر اثر 1450ء سے 1550ء تک جو تاریخ لکھی گئی اس نے تاریخ نویسی کو ایک نیا موڑ دیا۔ میکاؤلی کی تاریخ فلورنس اور گوچار ڈینی کی تاریخ اٹلی" نے تاریخ نویسی میں سیکولر نقطہ نظر کو روشناس کرایا۔ ان دو مورخوں نے سیاسی تاریخ لکھنے کا ایک معیار مقرر کیا' اور تاریخ کو بحیثیت افادی علم کے پیش کیا کہ جو عملی طور پر سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے تاریخ کی اہمیت کو معاشرہ میں تسلیم کیا جانے لگا اور اسے حکمران طبقے سیاسی تربیت کے لیے ضروری خیال کرنے لگے۔

نشاۃ ثانیہ کے اثرات صرف اٹلی یا مغربی یورپ پر ہی نہیں ہوئے بلکہ اس سے مشرقی یورپ کے ملکوں میں بھی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مشرقی یورپ کے ممالک چونکہ اکثر جارحانہ جنگوں کا شکار رہے اور تقسیم و قبضہ کی صورت میں ان کی سرحدیں بدلتی رہیں اس لیے ان میں قومیت کا ایک زبردست جذبہ پیدا ہوا کہ خود کو متحد کرکے ایک قوم کی حیثیت سے دنیا میں اپنا مقام بنائیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تاریخ سے مدد لی اور قوم پرستی کے جذبہ کے تحت اپنی ماضی کی تشکیل کی جدوجہد شروع کی۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ خود کو یونانیوں اور رومیوں سے برتر ثابت کریں تاکہ یورپ کے وہ ممالک جو ان سے اپنا رشتہ ملاتے تھے اور ان کے خلاف جارحانہ اقدامات کرتے تھے ان سے وہ خود کو عظیم ثابت کر سکیں۔ جرمنی میں یہ جذبات شدت کے ساتھ ابھرے کیونکہ وہ متحد نہیں تھے وہ خصوصیت کے ساتھ فرانسیسیوں کے مقابلہ میں اپنی اہمیت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے دعوٰی کیا کہ ان کی امپائر یونان روم سے زیادہ قدیم اور تہذیبی لحاظ سے وہ ان سے برتر ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کی ان قومی تحریکوں نے تاریخ سے دلچسپی پیدا کی اور قوموں نے اپنی ابتداء اپنے نام اور تہذیبی و ثقافتی روایات کی تلاش میں شروع کی جس میں تاریخ نے ان کی مدد کی اور تاریخ کا اطلاق عملی سیاست پر ہونے لگا۔

تحریک اصلاح مذہب

نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں سیکولر تاریخ کی جو ابتداء ہوئی اور اس نے مذہبی اثرات سے خود کو آزاد کرا کے ایک خود مختار اور علیحدہ علم کی حیثیت سے تسلیم کرا لیا تھا۔ تحریک اصلاح مذہب نے تاریخ کی اس ترقی اور رفتار کو روک دیا ایکولر و ہیومنسٹ تحریکوں کو زبردست نقصان پہنچایا۔ خاص طور سے جرمنی میں جہاں سیکولر افکار پروان چڑھ رہے تھے ان کی جگہ ایک بار پھر مذہب کا غلبہ ہوگیا۔ اسی وجہ سے گوئٹے نے کہا تھا کہ "تحریک اصلاح مذہب نے یورپ کو سو سال پیچھے کردیا۔"

لوتھر نے چرچ اور یورپ پر جو حملے کیے تھے اس کے جواب میں کتھولک مسلک کے ماننے والوں نے بائبل اور تاریخ کے ذریعہ ان کا دفاع کیا۔ دونوں فرقوں کے دانشوروں نے ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے تاریخ کو استعمال کیا۔ پروٹسٹنٹ مورخوں نے پوپ اور چرچ کو عیسائیت کی تعلیم کے خلاف ثابت کیا تو کیتھولک چرچ نے ان حملوں کے خلاف اپنا دفاع کیا۔

اس نظریاتی جنگ میں دونوں طرف سے قدیم مسودے' دستاویزات اور کاغذات بطور شہادت استعمال ہوئے۔ پروٹسٹنٹ نقطہ نظر کو میگڈ بیرگ سینچریز کے ذریعہ۔(Centrueis Magdeburg) جسے فلاشیس نے ترتیب دیا تھا' چرچ پر حملے کئے اس کا مثبت نتیجہ یہ ہوا کہ کتب خانوں سے قدیم مسودات کو استعمال کی غرض سے نکالا گیا اور ایک دوسرے پر تنقید کی غرض سے حوالوں کو تلاش کیا گیا' اس نے چرچ کی تاریخ کو ایک بار پھر زندہ کردیا اور اس کے مثبت و منفی دونوں پہلو لوگوں کے سامنے آئے۔

تحریک اصلاح مذہب کے بعد تاریخ نویسی میں یہ تبدیلی آئی کہ مورخوں نے مسودوں کی تلاش کے بعد ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی انہیں کئی دوسرے مسودوں سے مقابلہ کے بعد نئے سرے سے ترتیب دے کر شائع کیا جس کی وجہ سے تاریخی مواد میں غلطیاں باقی نہیں رہیں۔ اس سلسلہ میں قانون دانوں کی محنت بھی کام میں آئی کہ جنہوں نے دستوری حقوق کی تلاش میں شہادتیں جمع کیں اور چارٹر' فرامین اور قانونی دستاویزات کو شائع کیا۔ اس کی وجہ سے یہ تبدیلی آئی کہ اب تک مورخ قدیم ماخذوں کو غلطی سے پاک سمجھ کر ان پر تنقید نہیں کرتے تھے اور ان کی شہادت کو بلا کم و کاست تسلیم کرلیتے تھے لیکن اب ان

کے تضادات کو دیکھا گیا اور ان میں جو مبالغہ آمیزی تھی اس کی جانب نشان دہی کی گئی۔ 1566ء میں جان بوڈن نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "تاریخ کو آسانی سے سمجھنے کے طریقے" اس کتاب میں اس نے تاریخ نویسی کے ضوابط اور قواعد کو مقرر کرنے کی کوشش کی اور ارسطو کے اس نظریہ کو پیش کیا کہ بہت قدیم اور جدید ماخذ ناقابل اعتبار ہوتے ہیں لیکن اگر ان میں تضاد ہو تو سب سے جدید کو قبول کیا جائے اور ایسی شہادت کو قبول کیا جائے کہ جس میں اعتدال ہو۔

اس دور کو علمیت کا زمانہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس عہد میں مسودوں اور مخطوطات کی اس قدر بہتات ہوئی مورخ کے لیے ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا' ان کا جائزہ لینا اور ان کی غلطیوں کی نشان دہی کرنا ضروری ہوگیا تھا' اس لیے تاریخ کے علم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔

عقلیت اور رومانویت

سولہویں و سترھویں صدی میں سائنس اور فلسفہ کے نئے نئے نظریات نے یورپی معاشرے میں ذہنی و فکری ترقی کو آگے بڑھایا۔ جغرافیائی دریافتوں نے دنیا کی قدیم اقوام اور دور دراز کے ملکوں کے بارے میں نئی نئی معلومات فراہم کیں۔ نیوٹن اور گلیلیو کے افکار نے اس کائنات کے بارے میں تمام قدیم نظریات کو تبدیل کردیا۔ ڈیکارٹ نے سماجی علوم میں اپنے نظریات سے نئی سوچ اور فکر دی کہ جس کی وجہ سے انسان اب ہر نئی چیز پر شبہ کرنے لگا۔ اس لیے اس کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوئے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اور انسان کے حالات و معاشرہ کے واقعات کو کون تبدیل کرتا ہے؟ اور آب و ہوا اور جغرافیائی ماحول کا سیاسی و سماجی اداروں پر کیا اثر ہوتا ہے؟ ان تمام سوالات کے جواب کے لیے تاریخ سے مدد لی گئی۔

اسی زمانہ میں ایک ولندیزی مورخ سیلاریس نے تاریخ کو قدیم عہد وسطی اور جدید ادوار میں تقسیم کیا۔ تاریخ کے سمجھنے میں اسو وقت مزید وسعت آئی جب والٹیر نے تاریخ میں مذہبی نقطہ نظر کی جگہ سیکولر نقطہ نظر کو رواج دیا' اور تاریخ کا دائرہ سیاست سے بڑھا کے اس میں آرٹ' ادب' معاشیات اور سماجیات کو شامل کرلیا۔ اس کے نزدیک تاریخ

دراصل انسانی ذہن کے ارتقاء کی تاریخ ہے اور اس کا مطالعہ یہ سمجھنے میں مدد کرتا کہ ہے کہ انسانی معاشرہ دور وحشت سے تمدن کے عہد میں کس طرح اور کس عمل سے تبدیل ہوا؟ سائنسی نظریات و ایجادات کا یہ اثر ہوا کہ اب تخلیق کائنات کو مذہبی نقطہ نظر کے بجائے سائنسی نقطہ نظر سے بیان کیا جانے لگا۔ اور عالمی تاریخ لکھنے کا رواج ہوا کہ جس میں ہندوستان' چین اور دوسرے ممالک کے بارے میں مواد جمع کیا گیا۔

عقلیت کے خلاف رد عمل کے طور پر رومانوی تحریک شروع ہوئی' عقلیت کے زیر اثر ماضی کو تاریک اور دور جاہلیت سمجھا جاتا تھا جبکہ رومانوی مورخ اس میں حسن اور دمک دیکھتے تھے اور یہ استدلال دیتے تھے کہ ماضی کا یہ حق ہے کہ اسے سمجھا جائے اور تہذیبی طور پر اس نے جو کچھ دنیا کو دیا ہے اسے تسلیم کرنا چاہئے۔ انہوں نے اپنے مثالی معاشرہ کو ماضی کے ذریعہ پیش کیا' کہ ماضی میں ایک مثالی معاشرہ تھا جو وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا اور بالاخر جدید عہد میں وہ زوال پذیر ہوا۔ اسی نظریہ کے تحت عظیم شخصیتوں کا نظریہ پیدا ہوا کہ تاریخ میں جو کچھ تبدیلی آئی وہ ان شخصیتوں کی وجہ سے آئی اس کے نتیجہ میں تاریخ کو ان شخصیتوں کے پس منظر میں بیان کیا جانے لگا' بلکہ پورے عہد کو ایک شخص کے نام سے موسوم کرکے اور اسے مرکز بنا کر تاریخی واقعات کو بیان کیا جانے لگا۔ جیسے "فلپ دوم کا عہد" یا "لوئی چہارم دہم کا عہد" وغیرہ۔

رومانوی نظریات نے قوم پرستی کے جذبات کو بھی فروغ دیا' کہ جس کا اثر تاریخ نویسی پر بھی ہوا۔

تاریخ نویسی اٹھارویں صدی میں

لائبنز نے جب اس خیال کا اظہار کیا کہ فطرت میں سب کچھ اچانک نہیں ہوا' اس نے کوئی چھلانگ نہیں لگائی بلکہ یہ ایک تسلسل کے ساتھ ہوا ہے' نیچے سے اوپر کی جانب ارتقاء ہوا ہے تو انسانی معاشرہ بھی اس ارتقاء کے نتیجہ میں آگے بڑھا ہے۔ اس وجہ سے انسانی تاریخ کو ارتقاء کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقائی مراحل کا تعین کیا جانے لگا۔ اطالوی مورخ اور مفکر ویچو نے اس ارتقاء کو جنگل' جھونپڑا' گاؤں اور شہر کی اصطلاحات میں بیان کیا۔

ارتقاء کے نظریہ نے مذہبی عقائد پر کاری ضرب لگائی کہ جو کائنات کی تخلیق کو ایک اچانک عمل سمجھتے تھے۔ ان کے عقیدے کے مطابق کائنات تخلیق ہوئی تھی' ارتقاء پذیر نہیں۔ اس لیے کائنات کے ارتقاء اور اس میں بتدریج ہونے والی تبدیلیوں کو انہوں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی تاریخ نویسی میں تخلیق کے بعد ایک خلاء رہ گیا کیونکہ اس کے بعد وہ فورا" متمدن معاشروں پر آجاتے تھے۔ اور یہ سوالات کہ تخلیق کے بعد یہ معاشرے کے متمدن ہوئے' اور کس طرح انہوں نے ترقی کی؟ ان کو نظر انداز کردیا جاتا تھا۔ ارتقاء کے نظریہ نے اس کے برعکس تاریخ کو ایک تسلسل دیا اور اسے بتدریج مرحلہ وار سمجھنے میں مدد دی۔

ارتقاء کے نظریہ کے تحت تاریخ نویسی میں ترقی کا نظریہ آیا کہ انسان مسلسل آگے کی جانب بڑھ رہا ہے ترقی کے نظریہ کو پیش کرنے والوں نے ان مزاحمتوں اور دشواریوں کی جانب اشارہ نہیں کیا جو کہ ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اس نظریہ کو ماننے والوں کے نزدیک انسان بے پناہ توانائی اور طاقت کا مالک ہے جس کی وجہ سے وہ تیزی سے مسلسل آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ترگوٹ' لے سنگ' اور ہرڈر نے اس نظریہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

اس عہد میں خاص طور پر تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق ہوئی مثلا" مان ٹسکو نے قانون اور اس کے اثرات پر بحث کی۔ آدم اسمتھ نے معاشی پہلو کا جائزہ لیا۔ اور قوموں کے عروج و زوال میں معاشی عنصر کا تجزیہ کیا۔ مالتھوس نے آبادی کے نظریہ کو پیش کیا۔ گبن نے 88-1786ء میں چھ جلدوں میں رومیوں کی تاریخ شائع کی جس میں اس نے روشن خیالی اور علمیت کو ملا دیا گبن نے اپنی کتاب میں زیادہ تر چھپی ہوئی کتابوں کے مواد سے مدد لی' کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اصل کام نقطہ نظر اور واقعات کو بیان کرنے کا ہے۔ مسودوں کی اپنی جگہ اہمیت ہے مگر محض ان کی تلاش و جستجو میں سارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

اس عہد کی تاریخ نویسی کئی لحاظ سے منفی اثرات کا شکار تھی۔ ان کے نظریات عہد وسطی کے بارے میں حقارت آمیز تھے اور وہ اسے دور وحشت و بربریت' مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا زمانہ سمجھتے تھے اور اس لیے اس عہد کی تاریخ نویسی میں ان کے لیے کوئی دلکشی نہیں تھی۔ اس لیے والٹیر' گبن اور ہیوم نے اسے نظر انداز کردیا۔ اس کے مقابلہ

میں قدیم ماضی ان کے لیے ایک پراسرار جاذبیت اور دلکشی رکھتا تھا اور اس میں وہ مثالی معاشرہ کو تلاش کر رہے تھے۔

تاریخ نویسی کے معیار میں سے ایک یہ تھا کہ جو بھی مواد ماخذوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتا اسے بغیر کسی تنقید کے قبول کر لیتے تھے۔ تحقیق کی تکنیک ابھی تک ابتدائی مراحل میں تھی تاریخ کو تعلیمی اداروں میں زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی اور اس کو نصاب میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ تاریخ کی افادیت صرف حکمرانوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی' اس لیے مورخ بھی بادشاہوں کے لیے لکھتا تھا۔ مورخ کو مواد حاصل کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اگر مواد مل جاتا تو وہ صحیح بات لکھتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں حکمران ناراض نہ ہو جائیں۔ کتب خانوں کی حالت ابتر ہوا کرتی تھی اور کتابیں آسانی سے نہیں ملتی تھیں۔ اکثر مورخ اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ وہ سفر کے اخراجات برداشت کر سکتے۔ 1729ء میں جب مشرقی فریز لینڈ میں سرکاری دستاویزات کی حفاظت کے لیے ایک شخص کا تقرر کیا گیا تو اس سے کہا گیا کہ ان دستاویزات کے رازوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے چاہئے کہ وہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتائے اور یہ راز اپنے ساتھ قبر میں لے جائے" سرکاری کاغذات اور دستاویزات کو حکمرانوں کی مرضی کے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اکثر حکمران اس وجہ سے یہ کاغذات نہیں دکھاتے تھے کہ ان سے کہیں ان کے خاندان کی کمزوری یا سلطنت کی بدعنوانی ظاہر نہ ہو جائے۔ ان دستاویزات تک صرف سرکاری مورخ کی پہنچ ہوا کرتی تھی۔ جو شاہی خاندان اور اس کی ریاست کا دفاع کرتا تھا۔

چونکہ مطلق العنان بادشاہت کا زمانہ تھا اس لئے اگر حکمران ناراض ہو جاتا تو کتاب پر پابندی لگا دی جاتی تھی یا مصنف کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑتا تھا' اس کے ذرائع معاش بند کردئے جاتے تھے یا اسے جلا وطن کردیا جاتا تھا اس لیے مورخوں کی اکثریت بادشاہوں کی خوشامد میں تاریخ لکھتے اور ان پر تنقید سے گریز کرتے کیتھولک ملکوں میں مذہبی تشدد اور سختیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے اظہار رائے پر پابندیاں تھیں۔ لیکن یہ عہد اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں 1757ء میں جرمنی کی گوٹن گن یونیورسٹی میں اور 1769ء میں کالج ڈو فرانس میں تاریخ کے لیے علیحدہ سے شعبے قائم ہوئے۔

تاریخ نویسی انیسویں صدی میں

انیسویں صدی میں جرمنی میں تاریخ نویسی میں بنیادی تبدیلیاں آئیں جس نے پورے یورپ کو متاثر کیا۔ اس کے پس منظر میں جرمنی کی اپنی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت تھی۔ بحیثیت ایک متحد ملک کے جرمنی کے وجود کا نہیں تھا۔ اور یہ چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا' اس لیے جب تاریخ لکھنے کا سوال آیا تو انہوں نے ایک ملک اور قوم کی تاریخ لکھنے کے بجائے' فلسفہ تاریخ پر توجہ دی کیونکہ ایک ایسی قوم جو متحد نہ ہوں اور جس کا ملک ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہو اس کی تاریخ نامکمل اور ادھوری ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے تاریخی واقعات بیان کرنے کے بجائے اپنی فکری صلاحیتوں کو تاریخ کے فلسفہ پر صرف کیا۔ اسی وجہ سے عہد کے تمام جرمن فلسفوں نے فلسفہ تاریخ پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھا ہے جس کی وجہ سے تاریخ کو اور س کے عمل کو سمجھنے کا پس منظر فراہم ہوا۔

دوسری اہم چیز یہ تھی کہ اپنی تاریخ کی کم مائیگی کا احساس کرتے ہوئے انہوں نے یونان اور روم کی تاریخ میں پناہ لی۔ خصوصیت سے رومی کا تاریخ کہ جس نے انہیں اپنی شان و شوکت' چمک دمک سے بہت متاثر کیا۔ اس وجہ سے انہوں نے رومی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا اور اس کی فتوحات' سیاسی اداروں' اور قانون پر تحقیق کی۔

برٹ ہولڈ جارج نی بوہر نے سب سے پہلے سائنسی بنیادوں پر رومی تاریخ پر تحقیق کی اور ریاست' قانون' معیشت اور سیاسی اداروں پر مواد جمع کرکے ان پر لکھا اور تاریخ نویسی میں مثبت تنقید کی ابتدا کی اس کا نقطہ نظر تھا کہ کسی بھی قوم اور معاشرے میں واقعات سے زیادہ اس کے ادارے' فرد سے طبقے اور قانون سے زیادہ رسم و رواج زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ اس نے رومی تاریخ میں امراء اور عوام کی کش مکش کو اجاگر کیا ہے۔

چونکہ رومی تاریخ میں وسعت' تنوع اور موضوعات کی فراوانی تھی' اس لیے برطانوی مورخ گبن اور جرمن مورخ موم زن نے اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا' ان تینوں مورخوں کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ روم کی تاریخ کے ذریعہ اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں' اور ماضی کے واقعات پر ان کی پسند و ناپسند سے ان کے سیاسی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

اسی عہد میں رومی تاریخ کے ساتھ ساتھ یونان کی تاریخ' آرٹ اور ادب پر بھی کام

ہوا جس کا آغاز بھی جرمنی سے ہوا۔ اس سلسلہ میں آثار قدیمہ کی دریافتیں' کتبات' سکے اور آرٹ کے نمونہ تاریخ نویسی کے ماخذ بنے۔

یورپ میں تاریخ کی تحقیق کی جو ابتدا ہوئی۔ اور تنقید کے جو معیار مقرر ہوئے اس کا سہرا جرمن مورخوں کو جاتا ہے۔ خصوصیت سے گوٹن گن یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی اور تاریخ کے دائرہ کو وسیع کیا۔ تاریخ اب محض سیاسی واقعات کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ اس کے دائرے میں ادب' ثقافت' معیشت اور قانون سب آ گئے۔ خصوصیت سے قانون اور معاشرہ کے تعلقات پر تحقیقات ہوئیں۔ گوٹن گن یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیوگو نے رومی قانون کے بارے میں لکھا کہ:

"جب ہم اپنے رواج' دستور اور مذہب کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر رومی قانون کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ ہمیں بڑا شاندار لگتا ہے کیونکہ جب کوئی رومیوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور یہ مطالعہ کرتا ہے کہ ان کا قانون کس طرح سے ارتقاء پذیر ہوا ہے اور پھر وہ اس کا موازنہ موجودہ حالات سے کرتا ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگرچہ وہ لوگ تھے جو ہماری ہی طرح کے مگر آخر کیا وجہ تھی کہ وہ اپنے عمل اور کردار میں ہم سے مختلف تھے؟"

اس نے تاریخ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "تاریخ کا کام حالات کو بیان کرنا نہیں ان کو دریافت کرنا ہے"

ساوی نے (Savigny) نے بھی قانون پر تحقیق کی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ قانون کو مقنن نہیں بناتے بلکہ یہ لوگوں میں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک حصہ رسم و رواج کی صورت میں رہتا ہے جب کہ دوسرا قانون بن جاتا ہے اس کے نظریہ نے عقل مند مقنن کے تاریخی کردار کو ختم کر دیا' اور قانون کی تخلیق کو لوگوں کی ضروریات سے وا .سد کر دیا۔

انیسویں صدی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس عہد میں جرمنی میں قومیت کی تحریک زور شور سے شروع ہوئی۔ جرمنوں نے قوم کی تشکیل کے عناصر اور ان کی جڑوں کو تلاش کرنا شروع کیا تاکہ ان کی بنیاد پر وہ اپنی قومیت کی داغ بیل ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں زبان' قانون' دیومالائی قصے و کہانیاں اور لوک گیتوں اور قصوں پر تحقیق شروع ہوئی گرم برادرز نے جرمن لوک کہانیوں کی ترتیب کی۔ ان کے خیال کے مطابق ان کہانیوں میں

جرمن قوم کا کردار پنہاں ہے اور ان سے جرمن قوم کی ساخت اور ہیئت کا پتہ چلتا ہے۔
نپولین کی جنگوں کے نتیجہ میں جرمن قوم شکست سے دوچار ہوئی' جس نے ان میں قومیت کا زبردست جذبہ پیدا کیا' یہی وہ جذبہ تھا کہ جو تاریخ نویسی میں بھی تبدیلی لایا۔ اب تک جرمن تاریخ نویسی یا تو عالمی تھی یا خاص علاقہ سے مخصوص مگر قومی نہیں تھی' لیکن اس کے بعد انہیں اپنی قومی تاریخ سے دلچسپی شروع ہوئی اور جرمن مورخوں نے عہد وسطی کی تاریخ کا مواد جمع کرنا شروع کیا' کیونکہ وہ اس عہد سے جرمن قوم کی ساخت اور اس کی تشکیل کا مواد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس مقصد کے لیے اسٹائن نے 1819ء میں "ابتدائی جرمن تاریخ کے مطالعہ" کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی اور تاریخی مسودوں کی تلاش شروع ہوئی تاکہ ان کو درست کرکے شائع کیا جائے۔ اس سوسائٹی کے تحت پرٹز (Pertz) نے مسودوں کو تلاش کرکے انہیں ایڈٹ کرکے چھاپنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے جرمن تاریخ پر مورخوں کو مواد دستیاب ہوگیا اور انہوں نے قومی نقطہ نظر سے اپنی قوم کی تاریخ کی تشکیل شروع کردی۔
قومی جذبہ سے لکھی گئی اس تاریخ نے جہاں ایک طرف جرمنوں میں قومیت کے جذبات کو پیدا کیا وہاں دوسری طرف اس تاریخ کو سیاست دانوں اور حکومتوں نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

اس عہد کا مشہور مورخ رانکے تھا جو 1795ء میں جرمنی میں پیدا ہوا' اس نے یورپی تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلیاں کیں اور تحقیق و تنقید کے نئے معیار مقرر کئے جس کی وجہ سے تاریخ نویسی ایک منظم علم کی شکل میں وجود میں آئی۔ تاریخ لکھتے وقت اس کے نزدیک سب سے اہم چیز یہ ہے کہ مورخوں کو جانچا اور پرکھا جائے کیونکہ:
"ان میں سے کچھ قدیم مصنفوں کی نقل کرلیتے ہیں۔ کچھ حملہ کرتے ہیں اور کچھ محض مدافعت' کچھ مستقبل کے لیے ہدایات دیتے ہیں کچھ صرف واقعات کی حقیقت دیکھنا چاہتے"

وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ماضی کا مطالعہ حال کے جذبات سے علیحدہ ہو کر کیا جائے اور جو کچھ ماضی میں ہوا ہے اس کو بالکل اسی طرح بلا کم و کاست' کم یا زیادہ کئے بغیر بیان کردیا جائے اور واقعات کا ایک دوسرے سے رشتہ اور ان کے ارتقائی عمل کو دیکھا جائے۔

تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہے کہ صرف مسودوں سے مدد نہیں لی جائے بلکہ اس عہد کے سرکاری کاغذات' یادداشتیں' ڈپلومیٹک خط و کتابت اور ڈائریوں سے بھی مدد لی جائے کیونکہ مورخ تو واقعات کو اپنی پسند و ناپسند کے مطابق بیان کرتا ہے مگر خط و کتابت سرکاری فرامین اور انتظامی امور کی تحریروں میں تاریخی مواد اصلی شکل میں مل جاتا ہے۔

ماخذوں کی شہادتوں کو جوں کا توں تسلیم نہیں کرنا چاہیے اور پھر اس کا مقابلہ دوسرے مورخوں سے کرنا چاہیے۔ ایک واقعہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا سراغ لگایا جائے کہ جس نے سب سے پہلے اس واقعہ کو لکھا۔

رانکے نے اپنے معیار کے مطابق جو تاریخیں لکھیں ان میں "تاریخ پوپ" تحریک اصلاح مذہب" "پروشیا کی تاریخ" فرانس اور انگلستان کی تاریخ اور انقلابوں کی ابتداء اور جنگوں کے موضوعات پر اس نے تحقیق کی' اور 7 جلدوں میں دنیا کی تاریخ بھی لکھی۔

رانکے کے نظریات کا جرمنی میں بہت زیادہ اثر ہوا اور بہت جلد اس کے شاگرد تقریباً" تمام جرمن یونیورسٹیوں میں پھیل گئے' اور تاریخ نویسی کے اس معیار پر انہوں نے جرمنی اور یورپ کی تاریخ پر تحقیقی کام شروع کر دیا۔ اس کا اثر یورپ کے دوسرے ملکوں پر بھی ہوا اور انہوں نے رانکے کے معیار کو آہستہ آہستہ قبول کرلیا۔

چونکہ یورپی حکومتوں نے اپنی دستاویزات مورخوں کے لیے قابل حصول بنا دیں اور وہ آسانی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنے لگے اس لیے تاریخ پر سیاسی پہلو غالب آگئے اور ریاست اور اس کے اداروں پر تحقیق ہوئی جب کہ تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کو کم اہمیت دی گئی۔ دوسرے محض سرکاری دستاویزات کی روشنی میں تاریخ لکھنے کی وجہ سے تاریخ حکومتوں کے نقطہ نظر سے لکھی جانے لگی۔

انیسویں صدی میں پروشیا میں تاریخ نویسی قومیت کے زیر اثر لکھی جانے لگی اور اس کے ذریعہ سے جرمنی کے اتحاد کے لیے اس نے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کیا اس طرح سے تاریخ نویسی کو پروشیا کے مفادات کے لیے استعمال کیا گیا۔ رانکے کے جن شاگردوں نے تاریخ نویسی کو سیاسی مقاصد کے استعمال کیا ان میں جارج و یلز نے ابتدائی جرمن قبائل کی تاریخ لکھی اور ان کے قانون' رسومات اور روایات کو رومانوی انداز میں بیان کیا اس کا مقصد تھا کہ جرمن قوم کی جڑیں ماضی میں دور تک تلاش کی جائیں۔ ہائیزش فون زوبل نے جرمنی کی انقلابی دور کی تاریخ لکھی اور بتایا کہ ملک کے اندرونی حالات کس طرح سے

خارجی تعلقات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور فرانسیسی انقلاب نے جرمنی پر کیا اثرات ڈالے۔ ڈروزین نے تحریک آزادی میں جرمنی کی قربانیوں کا تذکرہ کیا اور جرمنوں کو یہ پیغام دیا کہ وہ پروشیا کی سربراہی میں متحد ہوجائیں۔ اس نے اپنی ایک کتاب پروشیا کی پالیسی پر بحث کرتے ہوئے اس نظریہ کو پیش کیا کہ پروشیا کی ریاست اپنا فرض بھول گئی ہے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ جرمن ایمپائر کو دوبارہ سے زندہ کرے ولہم فون گیزے بریخت نے قرون وسطی میں جرمنی کی شان و شوکت کو بیان کیا۔ ٹرائشکے نے جرمنی کی تاریخ لکھتے ہوئے سوشل ازم اور یہودیوں کو جرمنی کے لیے خطرناک قرار دیا۔ اس نے جنگ کی حمایت کی کیونکہ صرف جنگ کے ذریعہ طاقت ور اپنی قوت کا اظہار کرتا ہے اور اپنی بقا برقرار رکھتا ہے۔ امن اس کے نزدیک بے عملی کا دور ہوتا ہے کہ جس میں قومیں اپنی ذہنی صلاحیتوں کو کھو دیتی ہیں۔

1871ء میں پروشیا نے بسمارک کی سربراہی میں جرمنی کو متحد کردیا اور اسکے ساتھ ہی قومیت کے نقطہ نظر سے لکھی جانے والی تاریخ کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جرمنی کو متحد کرنے کی اس تحریک میں مورخوں نے تاریخ کو سیاست دانوں کے لیے استعمال کیا اور اسے جرمن حکمراں طبقوں کے مفادات کے حصول کا آلہ بنا دیا۔ اس پوری تاریخ میں جہاں قوم کی بات کی گئی اس سے مراد جرمن حکمران طبقے ہیں۔ عوام کے حقوق کی بات کہیں نہیں کی گئی اور نہ ہی اس تاریخ نویسی نے عوام کو اپنے حقوق اور اپنی ذات کا کوئی شعور دیا۔

فرانس

فرانسیسی انقلاب نے جہاں ایک طرف قدیم نظام کی جڑیں اکھیڑ دیں اور قائم شدہ اداروں اور روایات کو بدل دیا' وہاں اس نے فکری اور ذہنی طور پر بھی خیالات میں بڑی تبدیلی کی۔ عوامی طاقت و قوت کا ابھرنا' بادشاہ اور امراء کا زوال' چرچ کے اثرات میں کمی اور مسلسل سیاسی تبدیلیاں ان سب نے مل کر لوگوں کے شعور میں زبردست اضافہ کیا اور اس کا اثر فرانس کی تاریخ نویسی پر بھی ہوا۔

فرانسیسی انقلاب نے ماضی کے بارے میں رجحانات کو بدل دیا۔ کیونکہ یہ انقلاب

قدیم سیاسی و مذہبی اور معاشرتی روایات اور اداروں کے خلاف آیا تھا اس لیے ان کے ان میں اور رجعت پسند و ترقی پسند قوتوں میں تصادم جاری رہا۔ کچھ وقت کے لیے بادشاہت کا احیاء ہوا' پھر جمہوریت آئی' لہٰذا اس ماحول میں جو تاریخ لکھی گئی اس میں دونوں نقطہ نظر ملتے ہیں سیاسی دباؤ کے تحت جو تاریخ لکھی گئی اس میں فرد سے زیادہ ریاست کو اہمیت دی گئی' معاشرہ کے ڈھانچہ اور تشکیل پر بحث کی گئی' ریاست کے ارتقاء اور اس کی ترقی پر لکھا گیا اور ریاستوں کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیا گیا۔ گزو نے انگلش انقلاب کی تاریخ اور یورپی تہذیب کی تاریخ "میں اس کا اظہار کیا کہ تاریخی واقعات کی تہہ میں ہونے والی روح کو دریافت کیا جائے اور واقعات کو محض بیان کرنے کے بجائے ان کی تعبیر و تفسیر کی جائے۔ مشلے نے اور تھیئر نے فرانس کی قرون وسطی کی تاریخ اور انقلاب سے پہلے کی حکومت کی تاریخ پر کام کیا۔ لے سازتن' لوئی بلاں' ٹوکیو ول' اور کوئنے نے فرانسیسی انقلاب کا تنقیدی مطالعہ کیا اور اس پر بحث کی کہ اس کے نتیجہ میں کیوں مطلق العنانیت وجود میں آئی اور کیوں اس نے تباہی و بربادی اور جنگ کے لیے راستے کھول دیے تیں نے فرانسیسی انقلاب پر سخت تنقید کی اور اس دوران میں جو تشدد ہوا تھا اس کا جائزہ لیا اور اپنا فیصلہ جمہوریت کے خلاف دیا۔ اس نے انقلاب کے پس منظر اور انقلاب کے دوران میں کیتھولک و پروٹسٹنٹ فرقوں کے جھگڑے' عقلیت و عیسائیت کے درمیان تصادم اور عوام و حکمران طبقوں کی کش مکش کو بیان کیا ہے۔ فرانسیسی انقلاب کا یورپ پر کیا اثر ہوا' اس پر سورلی اور اولارڈ نے لکھا۔

فرانسیسی انقلاب کے بعد دوسرا موضوع نپولین کا تھا کیونکہ اس کا خاندان مسلسل سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں مصروف تھا' اس مقصد کے لیے اس کو ضرورت تھی کہ نپولین کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے تاکہ لوگ اس سے متاثر ہوں اور اس کے خاندان کی حمایت کریں۔ اس لیے اس پر مواد جمع کیا گیا اور ہزار ہا فرانک خرچ کرکے اس کے ذاتی کاغذات' خطوط اور اس کے عہد کے لوگوں کی یادداشتوں کو نزدیک ماضی کا ایک دور تھا کہ جس کا خاتمہ فرانسیسی انقلاب نے کیا اور ایک روشن عہد کی ابتدا کی۔ انقلاب کے دوران لوگوں کی نفرت حکمران طبقوں سے اس قدر شدید تھی کہ انہوں نے امراء کے خاندانوں کے کاغذات اور دستاویزات کو انتقاماً" جلا دیا تاکہ تاریخ میں ان کا نام و نشان باقی نہیں رہے۔ اب تک چرچ کے راہب تاریخ لکھا کرتے تھے' مگر اس انقلاب

کے نتیجہ میں چرچ بھی اجڑ گئے۔ اور راہب بیکار ہوگئے اس لیے انہوں نے تاریخ نویسی کا کام ترک کردیا۔ انقلاب کے ساتھ ہی وہ تمام شاہی ادارے اور اکیڈمیاں جو حکمراں طبقوں کے نظریات کو فروغ دیتی تھیں وہ بھی ختم ہوگئیں۔

آگے چل کر فرانس کی تاریخ نویسی نپولین کے عہد میں بھی متاثر ہوئی کیونکہ وہ کسی بھی ایسے نقطہ نظر کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھا کہ جس میں ایمپائر اور اس کے اداروں پر تنقید ہو۔ اس نے صرف ایسی تاریخ نویسی کی سرپرستی کی کہ جس کے ذریعہ اس کی شخصیت کو ابھارا گیا ہو۔

فرانس کی تاریخ میں انقلابی تبدیلی لانے والے مشلے تھا۔ جس نے فرانس کی تاریخ اور فرانسیسی انقلاب پر کتابیں لکھ کر ایک طرف تو فرانس کی عظمت کو اجاگر کیا۔ دوسری طرف اس سے پہلی مرتبہ تاریخ میں عوام کی اہمیت کو ثابت کیا کہ تاریخ کی تشکیل عوام کی توانائی اور قوت کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اس نے تاریخی حقائق کے ذریعہ اس نظریہ کو رد کیا کہ کوئی نسل برتر یا افضل نہیں ہوتی اور نہ ہی عظیم آدمی یا شخصیت کسی روحانی اور مافوق الفطرت خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ تاریخ کے عمل میں حصہ لینے والے عوام ہوتے ہیں کہ جن کی آواز خدا کی آواز ہوتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب میں جو کچھ بھی اچھا ہوا اس میں عوام کا کردار اور عمل تھا۔ مشلے کے تاریخی نظریات نے تاریخ نویسی میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا کہ تاریخ کو حکمرانوں اور امراء کے نقطہ نظر کے بجائے عوامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔

فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے بعد سے فرانس میں برابر سیاسی تبدیلیاں اس کے نتیجہ میں نپولین کو فرانس کی عظمت بنا کر اس کی شخصیت کو ابھارا گیا۔ خصوصیت سے انتشار اور سیاسی بدامنی کے زمانہ میں اس کی شخصیت کا جادو لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا اور لوگ ایک بار پھر سے نپولین سوم کی ذات میں وہ خوبیاں دیکھنے لگے۔ لیکن جو مورخ نپولین سوم کے خلاف تھے انہوں نے رد عمل کے طور پر نپولین اول کے خلاف لکھا اور اس نے فرانس کو جو نقصان پہنچائے تھے ان کو بیان کیا' تیں کی کتاب ان میں سے ایک تھی۔

برطانیہ

انیسویں صدی برطانیہ کے نو آبادیاتی نظام کے عروج کا زمانہ تھا' ایشیا اور افریقہ کے

اکثر ملکوں پر اس کا قبضہ تھا' نو آبادیاتی نظام' فتوحات اور وہ شخصیتیں جنہوں تے اس نظام کو قائم کرنے میں مدد دی تھی برطانوی تاریخ کے اہم موضوعات تھے۔ دوسری طرف برطانیہ کی داخلی صورت حال میں ٹوری اور وگ پارٹی کے تصادم کی شکل بھی تاریخ نویسی میں نظر آتی ہے۔ برطانیہ کی اندرونی اور بیرونی سیاست میں شخصیتوں کا جو کردار تھا اس نے تاریخ نویسی میں شخصیتوں کو زیادہ اہمیت دی اور مورخوں نے دوسری قوتوں کو' جو تاریخ کی تشکیل میں موثر ہوتی ہیں' نظرانداز کر دیا۔

کارلائل نے اسی زمانہ میں "ہیرور شپ" کے نظریہ کی تبلیغ کی جس نے اس کے عہد کی تاریخ نویسی کو متاثر کیا۔ اس کے نزدیک یہ چنیدہ افراد کا کام ہے کہ وہ جاہل اور غیر مہذب لوگوں کو تہذیب سکھاتے اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔ جمہوریت معاشرے کے لئے زہر قاتل ہے۔ جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور باعمل شخصیتوں کے کام میں روڑے اٹکاتی ہے۔

کارلائل سفید نسل کی برتری کا قائل تھا اور جنوبی امریکہ میں غلامی کے نظام کا حامی یہ افریقہ میں حبشیوں کے قتل کو تہذیب کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے خیالات نے نو آبادیاتی نظام کے استحکام میں مدد کی۔ اس عہد میں ان شخصیتوں پر کتابیں لکھی گئیں جنہوں نے نو آبادیاتی نظام کے قیام میں بھرپور حصہ لیا' مثلاً" میکالے کلائیو اور وارن ہسٹنگ کے کارناموں پر لکھا کہ جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو قائم کیا تھا۔

فراڈے نے انگلستان کی تاریخ میں قومی جذبات کو ابھارا' اس نے یورپی تحریکوں کے مقابلہ میں جیسے کہ تحریک اصلاح مذہب تھی' انگلستان کے بادشاہوں'جنرلوں اور سیاست دانوں کا دفاع کیا اور انگریز قوم کی برتری کو ثابت کیا'

جے۔ آر۔ گرین نے 1869ء میں انگلستان کی تاریخ نویسی میں اہم تبدیلی کی۔ اب تک تاریخ کو بادشاہوں یا حکمرانوں کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا' اس نے پہلی مرتبہ اپنی کتاب کا مختلف نام رکھا "انگریز لوگوں کی مختصر تاریخ" یہ ایک نئی روایت تھی اب تک جو تاریخ باشاہوں' حکمرانوں اور شخصیت پرستی کے ماتحت تھی' اس نے اس روایت کو توڑا اور اس پر زور دیا کہ تاریخ کی تشکیل میں عوام کو ان کا مقام ملنا چاہیے اور اگر تاریخ کو صحیح طریقہ سے سمجھنا ہے تو ضروری ہے کہ اسے نیچے سے شروع کیا جائے اور اوپر سے

نہیں- اس لیے اس نے تاریخ کے ادوار جو اب تک حکمران خاندانوں سے موسوم ہوا کرتے تھے- انہیں بدل کر ان کی جگہ حکومتوں کی خصوصیات کی بناء پر ادوار میں تقسیم کیا- اس نے سیاسی واقعات پر زور دینے کے بجائے سماجی' معاشی اور ثقافتی عوامل کو زیادہ اجاگر کیا- اسی وجہ سے فکری و عقلی افکار جو معاشرے کو خاموشی سے متاثر کرتے ہیں- ان کی جانب اس نے توجہ دلائی' ان میں اہم کتابیں اور ایسی شخصیتیں ہیں کہ جن کے افکار نے معاشرہ کو ذہنی طور پر متاثر کیا- گرین کی اس کتاب نے تاریخ نویسی کے رجحان کو بدلا- اور اس کو وسعت دے کر اس کے ذریعہ عوام میں شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی-

اس ضمن میں لیکی کی کتاب "عقلیت کی تاریخ" اور یورپی اخلاق کی تاریخ" بھی قابل ذکر ہیں- کہ جن میں سیاست سے ہٹ کر معاشرہ کی فکری ساخت و ہیئت پر بحث کی گئی ہے لیکن اس عہد میں سیلے کی کتاب "انگلستان کی وسعت" بھی شائع ہوئی جس نے نو آبادیاتی نقطۂ نظر سے انگلستان کی فتوحات کو بیان کیا اور تاریخ کو محض سیاست تک محدود کر دیا' اس کے اپنے قول کے مطابق "تاریخ محض ماضی کی سیاست ہے" اس طرح سے یہ کتاب سیاست دانوں کی تربیت کے لیے تو مفید تھی'مگر اس کا اثر معاشرہ کے دوسرے طبقوں پر نہیں ہوا-

اداروں کی تاریخ

انیسویں صدی کی ابتدا میں جب چرچ' تجارتی کمپنیوں' فرموں' اور حکومت کے مختلف شعبوں کے کاغذات اور دستاویزات سامنے آئیں اور انہیں درست کر کے چھاپا گیا تو ان کی بنیاد پر اداروں کی تاریخ لکھنے کی ابتداء ہوئی- اداروں کی تاریخ نے تاریخ نویسی میں ایک اہم اضافہ کیا کیونکہ اس کی مدد سے معاشرہ کی ساخت'رجحانات اور روایات کو سمجھا گیا- ادارے معاشرہ کے اندر ارتقاء پذیر ہوتے ہیں- اگر ان کا ارتقائی مطالعہ کیا جائے- تو اس سے معاشرہ کی جڑوں کا پتہ چلتا ہے'یہ معاشرہ کی عادات'رسوم و رواج' خیالات و افکار' قانون اور مذہب کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں- ہر ادارہ کسی مخصوص عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور خاص طبقوں کے مفادات کی نمائندگی کرتا ہے- اس لیے اداروں کا مطالعہ نہ صرف اس عہد کی روح کو ظاہر کرتا ہے بلکہ طبقاتی مفادات اور طبقاتی

اثر و رسوخ اور ان کے اقتدار کو بھی سامنے لاتا ہے۔ کوئی بھی ادارہ اس وقت تک با عمل اور طاقت ور رہتا ہے جب تک اس کی ضرورت ہوتی ہے' جیسے ہی ضرورت ختم ہوتی ہے ادارہ بھی اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ اور اس کی محض ایک تاریخی حیثیت رہ جاتی ہے۔

اداروں کی تاریخ اس لحاظ سے بھی اہم رہی کہ اس نے شخصیتوں کی تاریخی اہمیت کو کم کر دیا' ادارے کسی ایک خاص شخصیت کے ذریعہ تشکیل نہیں پاتے بلکہ ان کی تشکیل میں معاشرہ کی مجموعی توانائی ہوتی ہے' اس ان اداروں کا تاریخی عمل انفرادی نہیں' اجتماعی ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں مورخوں نے جاگیرداری' چرچ' ریاست خاندان' خانقاہ' شہر' گاؤں' میونسپلٹی' بادشاہت' دستور' قوانین اور رسوم و رواج پر تحقیقات کیں۔

اداروں کی تاریخ کی ابتدائی تحقیقات جرمن مورخوں نے کیں۔ اس کے بعد فرانس میں اس پر کام ہوا' فرانسیسی اس لیے پیچھے رہ گئے کہ فرانسیسی انقلاب کے دوران حکومت چرچ' اور زمینداروں کے کاغذات و دستاویزات کو تلف کر دیا گیا تھا۔ اس لیے ان کے پاس مواد کی کمی تھی۔ فرانسیسی مورخ فسٹل دو کو رانشرے(وفات:1889) نے فرانسیسی جاگیرداری' بادشاہت' اور حکومتی اداروں پر کام کیا' اور اس بات پر زور دیا کہ اداروں کی تاریخ پر لکھتے ہوئے ضروری ہے کہ ہر ماخذ کابغور مطالعہ کیا جائے' اس عہد کی اصطلاحات اور الفاظ کو سمجھا جائے کیونکہ ہر لفظ کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔اور ہر عہد کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں۔ تاریخ کے ایک عہد یا واقعہ کو دوسرے عہد یا واقعہ سے تشبیہ نہیں دینی چاہیے۔ صرف اس پر اعتماد کیا جائے جو ماخذوں میں ہے۔ تاریخ کو جذبات کے ذریعہ مسخ نہیں کرنا چاہیے۔ تاریخ سائنس ہے اور حب الوطنی ایک خوبی' ان دونوں کا ملاپ درست نہیں۔ قانون' رسوم و رواج' اور نظریات وافکار کسی عہد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ شخصیتں اتنی اہم نہیں۔

انگلستان میں جن مورخوں نے اداروں کی تاریخیں لکھیں ان میں اسٹب' ایچ۔ مین الیف۔ پولاک' ونگراڈوف' اور میسٹ لینڈ قابل ذکر ہیں۔

معاشی و سماجی تاریخ

سیاسی تاریخ کے ردعمل کے طور پر جہاں ایک طرف ثقافتی اور معاشرتی تاریخ لکھی

گئی' وہاں تاریخی عمل میں معاشی پہلو اور اس کے کردار پر بھی بحث کی گئی- آدم اسمتھ' ریکارڈو' مارکس اور اینگلز کے افکار کے نتیجہ میں اس پہلو پر زیادہ زور دیا گیا-معاشی تاریخ کی ابتداء جرمنی سے ہوئی اور 1843ء میں روشر نے تاریخ کو معاشی نقطۂ نظر سے لکھنا شروع کیا اور ان بنیادی معاشی قوانین کی وضاحت کی کہ جو معاشرہ کو کنٹرول کرتے ہیں-

جرمنی میں معاشی تاریخ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1900ء سے 1927ء تک اس موضوع پر تقریباً" 340 کتابیں چھپیں' ان میں زراعت' صنعت و حرفت' دست کاری' اور معاشی تنظیموں کے موضوعات شامل تھے-

کارل ولیلم فش نے روسی تاریخ کو معاشی نقطۂ نظر سے بیان کیا' اس کی کتاب مارکس اور اینگلز کے کیمونسٹ مینی فیسٹو کے ساتھ شائع ہوئی' اس نے تاریخ کے معاشی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ معیشت سیاست پر اثرانداز ہوتی ہے اور سیاسی اداروں کے ارتقاء اور ترقی میں حصہ لیتی ہے تاریخ کے عمل میں طبقوں کے معاشی مفادات اہم کردار ادا کرتے ہیں-

انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد وہاں کے معاشرے پر جو اثرات ہوئے اس نے تاریخ نویسی میں معیشت کے کردار کو زیادہ اہمیت دی- صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں معاشرہ میں ریاست سے زیادہ فرد کو اہمیت دی گئی' اور آزاد تجارت کے خیالات کو فروغ ملا-

تاریخ کا مارکسی نقطۂ نظر

مارکس نے تاریخ کو جو نقطۂ نظر دیا' اس کے تحت اس نے معاشروں کی تہذیبی تاریخ کے ارتقاء کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا؟ ابتدائی کیمونسٹ معاشرہ' دور غلامی' دور جاگیرداری اور صنعتی عہد' اس کے بعد اس نے تاریخ میں سماجی و معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ تلاش کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب بھی کسی معاشرہ میں ذرائع پیداوار میں تبدیلی آتی ہے تو اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں بنیادی طور پر انقلابی تبدیلیاں آتی ہیں' اور معاشرہ کا قانون رسم و رواج' عادات و اطوار' اخلاق اور سیاسی نظام یہ سب بدل جاتا ہے-اس لیے تاریخ میں اہمیت اس بات کی ہے کہ اس میں اس عمل کو دیکھا جائے اور کا تعین کیا جائے کہ جس میں ذرائع پیداوار' اور اس کے تعلقات میں تبدیلی آتی

ہے۔ اور اس تبدیلی کے نتیجہ میں جو اثرات ہوئے ہیں۔ ان کا جائزہ لیا جائے' اس وجہ سے تاریخ کو محض سیاسی واقعات نہیں سمجھنا چاہیے' اور نہ حکمران خاندانوں کی تبدیلی کے ساتھ اس کے ادوار کو متعین کرنا چاہیے' بلکہ پیداواری ذرائع اور پیداواری تعلقات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مارکس نے تاریخی عمل میں طبقاتی تضادات اور ان کی باہمی کس کمش اور تصادم کی نشان دہی بھی کی کہ جو تاریخی عمل کو برابر آگے کی جانب لے جا رہا ہے۔

یورپ میں مارکسی مورخوں نے ان بنیادوں پر عالمی تاریخ' اور یورپی تاریخ کا مطالعہ کیا' اور تاریخ میں معاشی عناصر نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کی طرف توجہ دلائی اس نقطۂ نظر نے تاریخ نویسی کو اہم سائنٹفک طریقے دیئے کہ جن کی بنیاد پر اس نے تاریخ کی نئے انداز سے تشکیل کی' اور واقعات کی تہہ میں جو طبقاتی مفادات تھے انہیں اجاگر کیا۔

جدید دور

بیسویں صدی میں تاریخ نویسی کا دائرہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس عرصہ میں تاریخی مواد میں بے حد اضافہ ہوا ہے' مسودوں' یادداشتوں' سرکاری کاغذات اور دستاویزات کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ کتابوں کی اشاعت بڑھ گئی ہے۔ کتب خانوں میں تحقیقی مواد کی سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں' مورخوں کی تحقیقات مختلف رسالوں' جرنلوں' اور اخباروں میں چھپنے لگی ہیں' مورخوں کی مختلف جماعتیں اور سوسائیٹیاں قائم ہو گئی ہیں کہ جن کی وقتاً"فوقتاً" نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور جہاں مختلف موضوعات پر باہمی تبادلہ خیالات بھی ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔

تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر گہرائی کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔ کام کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ موضوع سمٹ کر کم ہو رہے ہیں' اور ان کے کسی ایک خاص پہلو کا تحقیقی مطالعہ کیا جانے لگا ہے' نئے مواد کی روشنی میں تاریخ کو نئے سرے سے تشکیل دیا جا رہا ہے' اور تاریخ واقعات و شخصیات کا نئے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ جیسے فریڈرک دی گریٹ' نپولین' اور میٹرنک' مثلاً" میٹرنک کو دوسری جنگ عظیم کے بعد امن کے پیامبر کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور اس کے ان اقدامات کی تعریف کی کہ جو اس نے یورپ میں امن قائم کرنے کے لیے کیں تھیں۔

اگرچہ موجودہ دور کی تاریخ نویسی دو عالمی اور معاشی بحرانوں کی وجہ سے بے انتہا متاثر ہوئی' لیکن ان جنگوں اور بحرانوں نے مورخوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ تاریخ کے ذریعہ ان اسباب کا تجزیہ کریں کہ جن کی وجہ سے دنیا کو ان بحرانوں سے سابقہ پڑا۔

فرانس کے مورخ عالمی جنگوں کے دوران جرمنوں کے حملوں اور ان کے نتیجہ میں ان کے ملک کو جو ذلت اٹھانا پڑی اس کی نفسیاتی اثرات کا شکار تھے' اس لیے انہوں نے اس عہد کی سیاسی تاریخ پر تحقیق کی۔ پیرانیوون نے خصوصیت سے ڈپلومیٹک تاریخ پر کام کیا اور اس سے متعلق تمام دستاویزات کو اکٹھا کیا۔ اس نے 1945ء تک کے عہد کو سمیٹا' لیکن اب تک فرانسیسی مورخوں کا محبوب موضوع فرانسیسی انقلاب ہے'.اس کے بعد انہوں نے فرانس کی سماجی اور معاشی تاریخ پر لکھا ہے۔ اسکے علاوہ فرانسیسی مورخوں نے فرانس کی تاریخ کو تفصیل سے کئی جلدوں میں لکھا ہے' اور ان میں کئی مورخوں نے حصہ لیا اور اپنے اپنے خصوصی موضوعات پر انہوں نے تحقیقی کام کیا۔

انگلستان میں اس طرح کی تاریخیں کیمرج ہسٹری کے نام سے چھپیں جس میں انگلستان کے قدیم' عہدوسطیٰ' اور جدید دور پر انگریز مورخوں نے اپنا تحقیقی مواد اکٹھا کیا' اس قسم کی ایک اور تاریخ آکسفورڈ ہسٹری کے نام سے بھی چھپی ہے' ان تاریخوں کو یہ وقتاً"فوقتاً" نئے مواد کی روشنی میں درست بھی کرتے رہتے ہیں۔

پہلی جنگ سے پہلے انگلستان میں مورخ دو موضوعات پر کام کر رہے تھے اول' معاشرہ کی سماجی و تہذیبی تاریخ' اس میں وہ معاشرہ کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے' دوئم' انگلستان کے امپیریل نظام پر جس میں وہ کامن ویلتھ کی تشکیل اور اس کے نظام کا دفاع کرتے تھے' یہ رجحانات دو عالمی جنگوں کے بعد بھی قائم رہے' مگر اس کے علاوہ انہوں نے اپنی تاریخ کی دوبارہ سے تشکیل کی' اور اس کے دائرہ کو سیاست سے بڑھا کر اس میں ثقافت و معیشت کو شامل کیا۔ انیسویں صدی کا ایک مشہور مورخ چارلس ویبسٹر ہے جس کا موضوع 19' اور 20 صدی کی ڈپلومیٹک تاریخ ہے' اس نے کانگرس آف ویانا" پر کتاب لکھی' اور جب پہلی جنگ کے بعد یہ ورسائی کانفرنس میں شریک ہوا تو اس نے وہاں مندوبین پر زور دیا کہ اس معاہدے کو بھی ویانا معاہدہ کی روشنی میں کیا جائے' مگر اس کی بات کو نہیں مانا گیا' اور جرمنی کے ساتھ سخت سلوک کیا کہ جس نے دوسری جنگ عظیم کی بنیاد ڈالی۔

اس عہد کا دوسرا مشہور مورخ لیوس نامیر ہے' جس نے "انگلستان امریکی انقلاب کے دور میں" کتاب لکھ کر تاریخ کو ایک نیا نقطۂ نظر دیا اس نے ان عوامل کا جائزہ لیا کہ جس کی وجہ سے انگلستان کی پارلیمنٹ نے امریکی نو آبادیات کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔

جرمنی میں عالمی جنگوں سے پہلے مورخوں میں قوم پرستی' غیر جمہوری اور نسل پرستی کے جذبات تھے' پہلی عالمی جنگ کے بعد جرمنی کے مورخوں نے اس بات کی کوشش کی کہ جرمنی کو جنگ کے الزام سے بری کیا جائے' اس سلسلہ میں وائمر جمہ[illegible] کے جو سرکاری کاغذات سامنے آئے ان سے انہیں اپنے نقطۂ نظر کو بیان کرنے میں مدد ملی۔دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمن مورخوں کے سامنے بڑے مسائل تھے کہ وہ ہٹلر اور نازی دور حکومت کو کس طرح بیان کریں۔؟ ایک طرف جہاں وہ ہٹلر اور نازی پارٹی کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان مزاحمتی تحریکوں کو بھی بیان کیا ہے کہ جنھوں نے نازی پارٹی کے خلاف جدوجہد کی' اور ان مظالم کا ذکر کیا ہے کہ جس کا شکار جرمن عوام ہوئے اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نازی پارٹی دوسری اقوام سے زیادہ خود جرمنوں کے لیے مظالم کا باعث بنی' اور اس لیے ہٹلر کی وجہ سے پوری جرمن قوم کو موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

جنگ کے بعد جرمن مورخوں کو اس بات کا احساس ہوا ہے کہ اگر کبھی بھی آمرانہ حکومت قائم ہوئی تو اس کے نقصانات کیا ہوں گے' اس لیے وہ تاریخ کو جمہوری نقطہ نظر سے لکھ رہے ہیں' اور ان اداروں پر تحقیق کر رہے ہیں کہ جن کے ذریعہ جمہوری اقدار کو فروغ ملے۔اور انتہا پسندی کا خاتمہ ہو۔

○

انلز تاریخ نویسی

انیسویں صدی میں جرمنی میں تاریخ نویسی میں ایک انقلاب آیا جس نے نہ صرف یہ کی تاریخ کے مضمون کو خود مختار و آزاد بنایا بلکہ یہ کوشش بھی ہوئی کہ اسے سائنسی بنیادوں پر ڈھالا جائے اور اب تک یہ جو ادب کے ساتھ منسلک تھی اس سے اسے آزاد کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں لیو پولڈ رانکے (1795ء- 1886ء) نے جو تاریخ نویسی میں تبدیلیاں کیں اس کے اثرات نہ صرف یورپ میں ہوئے بلکہ اس سے امریکہ کی تاریخ نویسی بھی متاثر ہوئی۔ رانکے نے خصوصی طور پر سیاسی تاریخ کی تشکیل کی اور اس پر زور دیا کہ سیاسی تاریخ کو لکھتے ہوئے سرکاری دستاویزات پر زور دیا جائے اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ واقعات کو شاعرانہ اور تخیلاتی طور پر پیش نہیں کیا جائے بلکہ اس طرح سے بیان کیا جائے جیسے کہ وہ ہوتے تھے۔ لیکن اس کی سیاسی تاریخ کا مرکز یورپ ہے' اور یورپ میں بھی صرف بڑی سیاسی طاقتیں کہ جو نو آبادیاتی نظام کی وجہ سے پوری دنیا پر اثر انداز ہوئیں اس لیے ان کے نزدیک یورپ کا تصور جغرافیائی نہیں بلکہ روحانی ہے کہ جس نے اسے سیاسی ورثہ دیا۔

رانکے کی سیاسی تاریخ کے رد عمل میں ایک اور مورخ بورکیاؤٹ (1818ء- 1897ء) نے ثقافتی تاریخ کو روشناس کرویا۔ اس میں اس نے شہروں اور وہاں کے متوسط طبقہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہر دور کی اپنی روح میں ہوتا ہے۔

ابتداء میں ثقافت سے مراد شہری اور متوسط طبقہ کی ثقافت تھا مگر بعد میں اس کا دائرہ وسیع ہوا اور اس میں ادب' فن' تعلیم اور تحقیقی سرگرمیاں بھی آگئیں اس نے خصوصیت سے معاشرہ میں اقدار کے عمل کا جائزہ لیا کہ جو انسانی حرکات اور سرگرمیوں کے متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یورپ کی تاریخ نویسی میں اس قدر مزید تبدیلیاں آئیں جب 1929ء میں دو فرانسیسی مورخین مارک بلوخ اور لوسیس فیوبے نے تاریخ پر ایک جرنل انلز (ANNLS) (وقائع نویسی) کے نام سے چھاپنا شروع کیا۔ اس جرنل کی اشاعت کے ساتھ ہی تاریخ نویسی میں انلز کے نام سے تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد تھا کہ ایک نئے' تازہ' اور جدید انداز میں تاریخ کا تجزیہ کیا جائے اس تحریک کے اب تک تین دور خصوصیات کے حامل رہے ہیں۔

پہلے دور میں اس تحریک میں سیاسی تاریخ نویسی کے خلاف زبردست ردعمل پایا جاتا ہے اس لیے اس دور میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ تاریخ کو محض بیان نہیں کیا جائے بلکہ واقعات کے مسائل کو پرکھ کر ان کا تجزیہ کیا جائے۔

دوسرے دور میں اس مکتبہ فکر کے مورخوں نے تاریخ کو وسیع مفہوم کے ساتھ پیش کیا جس میں اس بات پر زور تھا کہ تاریخ میں ان تمام سرگرمیوں کا احاطہ کیا جائے کہ جو معاشرہ میں رواں دواں ہیں تاکہ ایک وسیع کینوس میں انسانی عمل کو سمجھا جا سکے گا۔

اس نقطہ نظر کے تحت سنہرے دور میں تاریخ اور دوسرے مضامین کے ساتھ رشتوں کو بڑھایا گیا۔ اور جغرافیہ' عمرانیات' معاشیات' نفسیات' سیاست و ثقافت ان تمام پر تاریخ لکھی گئی تاکہ معاشرے کی مکمل تصویر سامنے آسکے اور اس مکمل تصویر کے تجزیہ کے بعد انسانی تاریخ کو سمجھا جاسکے۔

چنانچہ پہلے دور میں 1920ء سے 1945ء تک اس میں تاریخ لکھنے کا کام انقلابی مورخوں کی ایک جماعت کی ایک جماعت نے کیا کہ جنہوں نے روایتی اور سیاسی تاریخ اور واقعاتی کو رد کردیا۔ دوسری جنگ کے بعد فرانسیسی میں تاریخ کے اداروں پر انلز اسکول کے باغیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور انہوں نے اس کو اپنے نظریات کو مقبول بنانے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ اور خصوصیت سے نئے تصورات اور ہاتھوں کا رواج دیا اور سیریل تاریخ کا ایک سلسلہ شروع کیا کہ جس کے ذریعہ معاشرہ میں ہونے والی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے۔ 1968ء میں انلز اسکول کی اہمیت کم ہوگئی اور دوبارہ سے اس نے سماجی و ثقافتی اور سیاسی تاریخ نویسی پر توجہ دینی شروع کردی۔

انلز اسکول نے تاریخ کے دائرہ کو بڑھا دیا اور خصوصیت سے ذہنی و نفسیاتی تاریخ کے ذریعہ اس میں نئے نئے تجربات کئے۔ اس سلسلہ میں خصوصیت سے نفسیات میں جو

تحقیق ہوئی تھی اس سے مدد لی گئی چنانچہ لیفابورے نے یہ انقلابی مجمع اور اس کی ذہنیت پر ایک کتاب لکھی تو مارک بلوخ نے یورپ کے اس پرانے رواج کا تاریخی و نفسیاتی تجزیہ کیا کہ جس میں یہ یقین کیا جاتا تھا کہ بادشاہ کے پاس وہ روحانی طاقت ہے کہ جس کے ذریعہ وہ بیماروں کو محض چھو کر صحت یاب کر دیتا ہے۔

لیکن اس اسکول کی سب سے عمدہ کتاب فرنانڈ بروڈل کی تحریر یہ ہے کہ جسے ایک ایسی تاریخ کہا جاسکتا ہے کہ جو وقت کی پابندیوں سے آزاد ہے اور اس میں انسان اور ماحول کے تعلقات کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد تفصیل کے ساتھ معاشی' سماجی اور سیاسی نظاموں کا تجزیہ کیا ہے جو کہ بحر روم کے ماحول میں پروان چڑھے۔ بروڈل نے اس میں کوشش کی ہے کہ اس علاقہ کی ایک ایسی تاریخ لکھے کہ جسے مکمل کہا جاسکے اور جس میں معاشرے کے تمام پہلو آجائیں۔

اسی نقطہ نظر کے تحت بروڈل نے "تہذیب اور سرمایہ داری" لکھی اور اس میں اس نے روز مرہ کی زندگی میں جو تبدیلیاں آئی تھیں ان کا جائزہ لیا ہے مثلاً" اس کے مطالعہ کے بعض دلچسپ نتائج سامنے آئے ہیں۔ مشرق بعید میں چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ چونکہ چاول کی فصل کامیاب ہوتی ہے اور اس میں قحط اور خشک سالی کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ اس نے اس کے نتیجہ میں مشرق بعید کی آبادی زیادہ بڑھی۔ اور چونکہ چاول کی کاشت میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے پر بادشاہ اور حکومت نے قبضہ رکھا جس کی وجہ سے سخت قسم کا ڈسپلن معاشرہ میں قائم ہوا اور بادشاہ کی طاقت و قوت بڑھ گئی۔

مکئی کی کاشت میں چونکہ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے امریکہ میں مقامی باشندوں کو فرصت کے مواقع مل گئے اور انہوں نے مایا اور ایزٹک تہذیبوں کو پیدا کیا۔ اس کے مقابلہ میں یورپ اناج کھانے والا براعظم ہے۔ چونکہ اناج کی فصلوں میں یقینی صورت حال نہیں ہوتی ہے اس لیے قحط یا خشک سالی کے دوران معاشرہ میں بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اس کی وجہ سے آباد علاقہ اجڑ جاتا ہے۔ اور ویران علاقے آباد ہوجاتے ہیں اس کے علاوہ چونکہ یورپ کے پاس علاقہ کم ہے اور اس کی آبادی زیادہ تھی اس کی وجہ سے ذرائع نقل حمل اور ٹرانسپورٹ کے مسائل زیادہ نہیں رہے۔ چونکہ یورپ میں مزدوری مہنگی تھی اس لیے دوسرے ذرائع تلاش کیے گئے تاکہ اس کا نعم البدل ہوسکے۔ اسی عمل نے صنعتی انقلاب کو پیدا کیا۔

اس کتاب میں ہروڈل نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ روز مرہ کی زندگی کے واقعات کو اور معاشرہ میں ہونے والے اہم سیاسی و معاشی عمل کو ہم آہنگ کردے۔

اس کے بعد آنے والے مورخوں نے معاشرہ کے ان پہلوؤں کو پرکھنا شروع کردیا کہ جن کے بارے میں لوگوں میں زیادہ اہمت نہیں تھی۔ مثلاً" بچپن، خواب، جسم، بو یا عورت، خاندان، گاہوں کی سماجی زندگی، اس قسم کی تاریخ میں فلپ اریز کی "بچپنے کے کئی سو سال" قابل ذکر ہے۔ فاضل مصنف نے بچپن کے بارے میں قرون وسطی کے نظریات کو بیان کیا ہے کہ جس میں بچوں کو جانوروں کی طرح سمجھا جاتا تھا یا بالغوں کی پہلی سطح، اور بچپن کے بارے میں سترھویں صدی میں جاکر تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں کہ جس کے بعد سے بچپن کو اہمیت دینا شروع ہوگی۔

ایک اور مصنف جان ڈیلیوسے نے خوف اور جرم کی تاریخ لکھی کہ جس میں اکثریت کے خوف سے لے کر سمندری جنوں، پلیگ، بھوک، شیطان اور جادوگرنیوں کے خوف کا تجزیہ کیا ہے۔ ایک اور کتاب "مقبول ثقافت کی تاریخ" میں معجزے، کراماتیں، جادو اور زیارت کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب "کتاب کی تاریخ" یہ ہے کہ جس میں یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ مقبول عام کتابیں کون سی ہوتی ہیں۔ ملازم اور نچلے طبقے کیا پڑھتے ہیں۔ وغیرہ۔

یورپ میں تاریخ نویسی اب اس قابل ہوگئی ہے کہ نہ صرف انسان اس کے ذہن، نفسیات، اور عمل کی تاریخ لکھتے بلکہ اس کے جذبات کی بھی تاریخ لکھ سکے۔ اس کی ایک مثال حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب "آنسوؤں کی تاریخ" ہے اس اسکول کا جو اثر ہوا وہ یہ کہ اب صرف انسانی اداروں کی تاریخ لکھنا ہی ممکن نہیں بلکہ انسانی جذبات کی تاریخ بھی لکھی جاسکتی ہے۔

باب نمبر6

امریکی تاریخ نویسی

امریکہ کی دریافت کے بعد جب دولت اور مواقع کی تلاش میں یورپی اقوام نے نئی دنیا کا رخ کیا تو ان کا مقصد محض لوٹ کھسوٹ اور دولت جمع کرنا تھا۔

مہاجرین کی حیثیت سے ان کا تعلق نہ تو زمین سے تھا اور نہ ان کی ہمدردیاں وہاں کے مقامی باشندوں سے تھیں اس لیے انہوں نے ظالمانہ طریقوں سے مال غنیمت حاصل کیا اور یورپ واپس آ گئے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یورپی لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی اور وہاں ان کی چھوٹی چھوٹی کالونیاں آباد ہو گئیں۔ اس ابتدائی زمانہ میں انہیں تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' اس لیے انہوں نے نئی دنیا کی تاریخ سے کسی قسم کی واقفیت حاصل نہیں کی۔اور ان کے تقریباً" 150 سال جدو جہد میں گزر گئے۔ یہ جدوجہد مقامی باشندوں سے بھی رہی۔ اور فطرت سے بھی۔

اس ابتدائی زمانہ کا تاریخی مواد کسی باضابطہ شکل میں جمع نہیں کیا گیا' مختلف افراد نے مختلف ضرورتوں کے تحت اپنی یادداشتیں' اور ڈائریاں ضرور لکھیں جس سے ان کا تعصب' اور نفرت ظاہر ہوتی تھی' خصوصیت سے مقامی باشندوں کے لیے انہوں نے یک طرفہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہوئے صرف ریڈ انڈین کے مظالم بیان کئے۔اور ان کے ساتھ یورپی اقوام نے جو سلوک کیا' اسے نظر انداز کر دیا۔

امریکی تاریخ میں سب سے پہلا مرحلہ امریکی قوم کی تشکیل کا تھا' کیونکہ یہاں یورپ کی تمام اقوام آئیں تھیں۔ ان کے علاوہ چین' جاپان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے تھوڑے بہت لوگ تھے۔ساتھ ہی میں افریقہ سے حبشیوں کو بطور غلام یہاں لایا گیا تھا۔ اس لیے ایک قومی کردار کی تشکیل اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ ان کے سامنے کوئی داخلی اور خارجی خطرات نہ ہوں۔

یورپی اقوام جو مختلف کالونیاں میں آباد ہوئے تھے ان میں اکثر وہ تھے کہ جن کا تعلق

کسی خاص مذہبی فرقہ اور مسلک سے تھا یا ایک ملک کے رہنے والے تھے اس لیے ابتدائی مرحلہ میں یورپی اقوام میں علاقائی کردار کی تشکیل ہوئی' اس لیے 1780ء کی دہائی میں امریکہ میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان کا تعلق کسی علاقہ سے تھا جیسے ٹامس ہچسن نے موچوسٹ پر اور رابرٹ پراوڈ نے پین سلوانیہ پر تاریخیں لکھیں۔ ان تاریخوں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں شخصیت پرستی پر زیادہ زور دیا گیا' خصوصیت سے ان شخصیتوں پر کہ جنہوں نے مقامی باشندوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا۔ ان کے کارناموں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس عہد میں ان کی تاریخ نویسی کے موضوعات اس لیے محدود تھے کہ ان کا تاریخی سرمایہ بھی محدود تھا' ریڈانڈین سے جنگیں' زمینوں کی تلاش اور فطرت کی سختیاں یہ ان کے معاشرے کے بڑے مسائل تھے' اس لیے ان میں ان شخصیتوں کو اہمیت دی گئی کہ جنہوں نے اس ماحول میں کامیابی حاصل کی۔

امریکیوں میں قومی جذبات اس وقت پیدا ہوئے جب ان میں اور برطانیہ میں دستوری حقوق کے لیے کش مکش شروع ہوئی' اس کے بعد سے تاریخ نویسی میں آزادی کی جنگیں اہم موضوع بن گئیں۔ اور وہ افراد کہ جنہوں نے نئی ریاست کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ وہ معمار قوم کی حیثیت سے پوری قوم کے ہیرو بن گئے اس کے بعد سے مورخ انقلابی جنگوں اور دستوری مباحث کے بارے میں میں مواد جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ پہلی تاریخی کتاب جو علاقائیت سے بلند ہو کر لکھی گئی وہ 1828ء میں ٹموتھی ٹپکن کی تھی' جس کا نام تھا "ریاست ہائے متحدہ کی سیاسی اور سماجی تاریخ۔"

1825ء سے 1880 تک امریکی تاریخ نویسی میں رومانوی اثرات کا غلبہ رہا: طوالت' واقعات کا محض بیان کرنا' اور شخصیتوں کے گرد رومانوی واقعات کا ہالہ اس عہد کی تاریخ نویسی کی خصوصیات تھیں۔ تاریخی عمل میں جو سماجی و معاشی قوتیں تھیں انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ مخالف گروہوں اور جماعتوں کے لیے تعصب و نفرت کے جذبات اس قدر شدید تھے کہ ان کے لیے تاریخ میں کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ اس لیے تاریخ کو یکطرفہ انداز میں لکھا گیا۔

بہرحال اس عہد کی یہ خصوصیت ضرور ہے کہ اس میں تاریخی مواد کو جمع کیا گیا' جیرڈ اسپارکس نے واشنگٹن اور فرینکلن کے کاغذات و دستاویزات کو جمع کیا' مگر اس کی خرابی یہ تھی کہ اسے جو دستاویز پسند نہیں ہوتی تھی وہ اسے شامل نہیں کرتا تھا' اس کا مقصد یہ تھا

کہ ایسا مواد جمع کیا جائے کہ جس سے اس کی پسندیدہ شخصیتیں بطور ہیرو لوگوں کے سامنے آئیں۔

1834ء میں جارج بنک فورٹ نے امریکہ کی تفصیلی تاریخ لکھی' جو اس کی دریافت سے شروع ہوتی ہے' اگرچہ اس کے ہاں بھی شخصیت پرستی کا اثر نمایاں ہے مگر ساتھ ہی میں مذہبی اور ترقی کے نظریات بھی ملتے ہیں۔وہ اس کا قایل ہے کہ امریکی قوم کو خدا کی حمایت حاصل ہے' اور اب اس کا یہ فرض ہے کہ وہ دنیا کو جمہوری اقدار سے روشناس کرائے۔

رومانوی مکتبہ فکر کے تحت امریکی تاریخ نویسی میں وطن پرستی کے جذبات پیدا ہوئے اور لوگوں میں تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

1880ء میں رانکے کے اثر کے وجہ سے امریکہ میں تاریخ نویسی سائنسی بنیادوں پر استوار ہوئی' اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ماخذوں کے جواہرجات کا صحیح طریقہ سے اندراج کیا جائے اور اقتباسات صحیح ہوں۔ اس کے بعد سے جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں انہوں نے اپنے سے پہلے مورخوں کے مواد کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ماخذوں پر توجہ دی اور تاریخ کو تجزیاتی انداز میں لکھ کر شخصیتوں کے اثر کو کم کیا' جھوٹے ہیرو جواب تک تاریخ میں اہمیت حاصل کئے ہوئے تھے ان کی اصلیت کو ظاہر کیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ حقیقت کو فرض نہیں کیا جائے بلکہ اسے ثابت کیا جائے' جن مورخوں نے اس نقطۂ نظر سے تاریخیں لکھیں ان میں اینڈر یووائٹ' ڈ-لنیل' گلمن' اور ہنری ایڈم مشہور ہیں۔

جب امریکہ نے اپنی تنہائی کا زمانہ ختم کیا اور اس نے تجارتی و صنعتی لحاظ سے ترقی کی تو اس زمانہ میں تاریخ نویسی میں قومی اسکول کا فروغ ہوا جس نے امریکی قوم کی عظمت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اس عہد میں نجی جائیداد کے تحفظ کے لیے اسے تقدس کا درجہ دیا گیا۔جب تجارت کے ساتھ ساتھ امریکہ نے اپنی منڈیوں کے لیے نو آبادیات حاصل کرنے کی جدوجہد کی تو ان کی تاریخ میں سامراجیت کا نقطۂ نظر بھی آ گیا۔

سیاسی تاریخ کے ردعمل میں جب مورخوں نے ثقافتی اور تہذیبی تاریخ لکھنے کی ابتداء کی تو اس نے تاریخ نویسی میں ایک بار پھر علاقائی تاریخ کو اہمیت دی اور اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ امریکی قوم کی ساخت اور اس کہ ہیئت کے تجزیہ کے لیے ضروری ہے کہ علاقائی تاریخ پر تحقیق کی جائے۔ اس ضمن میں ایف۔ جے۔ ٹرنر بڑا مشہور مورخ ہے

جس نے امریکہ کی تاریخ کی تشکیل میں سرحدوں کے کردار اور ان کے اثرات پر بحث کی ہے۔ کیونکہ تاریخ کی سرحدیں برابر وسیع ہوتی رہیں اس لیے امریکی ذہن کے بنانے اور ملک کے سیاسی و سماجی اور معاشی اداروں کی تشکیل میں اس عمل کا بڑا ہاتھ ہے۔

ثقافتی تاریخ نویسی کے تحت ادب' معیشت' لوک ورثہ' فلسفہ اور عمرانیات کے نقطہ نظر سے امریکی ثقافت کی تشکیل میں جن جن عناصر نے حصہ لیا ان پر تحقیق کی گئی اس ضمن میں معاشی عناصر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور امریکی دستور اور حکومتوں کے بدلنے میں معیشت کے عمل دخل اور اثرات کو اجاگر کرنے کی غرض سے تاریخیں لکھی گئیں۔

یورپ کی تاریخ نویسی میں جو رجحانات رہے اس کا اثر بھی امریکی تاریخ نویسی پر ہوا' اور یہاں بھی سیاسی' ثقافتی اور معاشی اداروں کی تاریخ لکھی گئی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ سماجی اور معاشی قوتیں کس طرح معاشرہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

بیسویں صدی میں خصوصیت سے فرانس کے انلز اسکول (ANNALS SCHOOL) سے تعلق رکھنے والے مورخوں کے نقطہ نظر سے امریکی تاریخ نویسی متاثر ہوئی اور معاشرہ کے سماجی و معاشی ڈھانچہ کا تجزیہ کیا گیا جس کی وجہ سے سماجی تاریخ کے سامنے سیاسی تاریخ کمزور ہو گئی۔

امریکہ میں انتخاب کے طریقہ کار کی وجہ سے ووٹروں کے رجحانات اور ان کی پسند اور ناپسند کو بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے مورخوں نے اس پہلو پر توجہ دی کہ ووٹروں کی ووٹنگ کی روشنی میں نسل' طبقات اور مذہب کے بارے میں معاشرے کے رجحانات کا تجزیہ کیا جائے اور جو تبدیلیاں آتی ہیں۔ ان کو اجاگر کیا جائے کیونکہ ووٹروں کے دباؤ کی وجہ سے سیاسی جماعتیں اپنی پالیسی بدلتی رہتی ہیں' اس طرح سے ووٹر عملی طور پر تاریخ کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں اور تاریخ کی یہ تشکیل صرف سیاسی ہی نہیں ہوتی بلکہ تہذیبی اور ثقافتی بھی ہوتی ہے۔

1960ء کی دھائی میں امریکہ میں مورخوں کی ایک جماعت نے تاریخ کو مارکسی نقطہ نظر سے لکھنا شروع کیا۔ خصوصیت سے جنوب کے علاقہ کی تاریخ' اس میں غلامی کے ادارے کا عروج اور اس کا زوال اور مزدور طبقہ کا پیدا ہونا جیسے اہم موضوعات تھے۔ نیو لیفٹ تحریک کے مورخوں نے مزدور طبقہ کی تاریخ لکھی اور امریکی ثقافت میں پیداوار کی کھپت اور اس کے اثرات کا تجزیہ کیا اور یہ کہ پوری امریکی ریاست ایجنٹ کے طور پر

حکمران طبقوں کے مفادات کے لیے کام کر رہی ہے۔

مارکس ازم کے ساتھ ساتھ ترقی پسند مسلک کے مورخوں نے امریکی تاریخ میں طبقاتی کش مکش اور تصادم کا بھی تجزیہ کیا ہے' اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس تصادم نے امریکی قوم کو ایک قوم کا کردار دیا اور اسی وجہ سے امریکی جمہوریت نے ترقی کی۔

اس کے جواب میں یک جہتی مسلک کے مورخوں نے یہ استدلال دیا کہ امریکی معاشرے میں تصادم نہیں ہے بلکہ مفاہمت ہے یہ مفاہمت امریکی جمہوریت اور سرمایہ داری میں برقرار ہے اور امریکہ کے مختلف علاقوں میں کوئی نظریاتی فرق نہیں کیونکہ یہ سب سرمایہ داری کے حامی ہیں۔ انہوں نے سرمایہ داری اور مزدوروں کے باہمی تصادم سے بھی انکار کیا' ان کے نزدیک یہ دونوں طبقے ترقی کے خواہش مند ہیں اور ان میں تصادم اس لیے کم ہوگا کہ دونوں کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں ترقی کے مواقع چونکہ ہر طبقے کو میسر ہیں اس لیے ان میں تصادم نہیں بلکہ مفاہمت ہے جو تمام طبقوں کو باہم ملائے ہوئے ہے ظاہر ہے یہ نقطہ نظر امریکی سرمایہ داری کی حمایت کرتا ہے۔

جرمنی کے مشہور ماہر عمرانیات ماکس ویبر کے نظریات سے تاثر ہو کر جو تاریخ لکھی گئی اس میں یہ کہا گیا کہ رجعت پسندی و ترقی پسندی کے نظریات میں کوئی تصادم نہیں بلکہ یہ بیوروکریسی کی نئی تنظیم اور اس کی اہمیت ہے کہ جس نے تاریخ کی تشکیل میں اہم حصہ لیا' اس کی وجہ سے انفرادی اور سماجی اداروں کو زوال ہوا' اور مرکزی بیورو کریسی برابر طاقت ور ہوتی گئی یہاں تک کہ ریاست اور اس کے تمام ادارے اس کے زیر اثر آگئے اور اب بیوروکریسی کا ادارہ سرکاری اور نجی اداروں میں موجود ہے اور امریکہ کا مستقبل اس سے وابستہ ہے۔

اس کی مثال بڑی بڑی فرموں' کمپنیوں اور بین الاقوامی تجارتی اداروں میں دیکھی جاسکتی ہے کہ ان میں اب تصادم نہیں بلکہ مفاہمت ہوگئی ہے اس سے مقامی خودمختاری ختم ہوگئی ہے اور اب ریاست طبقوں کے مفادات کے لیے کام نہیں کرتی بلکہ یہ بیورو کریسی کی ضروریات کے تحت اپنی پالیسی بدلتی رہتی ہے۔ اب بڑی بڑی کمپنیاں کسی فرد کے کنٹرول میں نہیں بلکہ ایک ادارہ بن گئی ہیں جو کہ اپنی خود مختاری کو برقرار رکھے ہوئے ہے اس کی وجہ سے امریکی معاشرہ میں فرد کی اہمیت ختم ہوگئی ہے۔

امریکی تاریخ نویسی میں نیگرو اقلیت اور مقامی ریڈ انڈین باشندوں کو نظر انداز کیا گیا

اور امریکی تاریخ کی تشکیل میں ان کے کردار اور کوششوں کا اعتراف نہیں کیا گیا غلامی کے خاتمہ کو جو کہ صنعتی ترقی کے لیے ضروری تھی اسے امریکی تاریخ میں اس طرح سے پیش کیا گیا کہ جیسے یہ اصلاح انہوں نے انسانیت کی خاطر کی ہو' حالانکہ صورت حال یہ تھی کہ غلامی کا ادارہ وقت کے ساتھ فرسودہ ہورہا تھا اور اپنی افادیت کھوتا جارہا تھا' کیونکہ غلامی میں مرضی کے خلاف کام کروانے کی وجہ سے تشدد کے حربوں کو استعمال کیا جاتا تھا' اور جب غلاموں کو مناسب غذا نہیں ملتی تھی تو ان میں اموات کی شرح زیادہ ہوتی تھی' جنگ اور سیاسی تبدیلی کی صورت میں ان کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا۔ غلام خاندان کو گھر میں رکھ کر اس کے تمام اخراجات برداشت کرنا پڑتے تھے۔ عورتیں چونکہ زیادہ مشقت کے کام نہیں کرسکتی تھیں اس لیے انہیں تو بطور داشتہ رکھا جاتا تھا یا گھریلو کام کاج کے لیے' اگر غلاموں کی کمی پڑ جائے اور منڈی میں دستیاب نہ ہو تو اس کمی کو فوری طور پر دور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے غلامی کا ادارہ صرف اس وقت تک فائدہ مند رہا جب تک کہ کھیتی باڑی اور زراعت کا کام ان سے لیا جاتا تھا اور جب تک کہ افریقہ سے لاکر انہیں بڑی تعداد میں سستا فروخت کیا گیا لیکن جب شمال میں صنعتی ترقی ہوئی تو انہیں مزدوروں کی ضرورت ہوتی اور غلامی کے خاتمہ پر انہیں بے سہارا اور بے روزگار غلام بطور مزدور مل گئے۔ بحیثیت مزدور کے یہ فیکٹریوں میں کام کرتے تھے اور ان کے خاندانوں کی کوئی ذمہ داری سرمایہ دار پر نہیں آتی تھی۔ اس لیے غلامی کے ادارے کا عروج و زوال امریکی تاریخ کا ایک انتہائی اہم حصہ ہے۔

بیسویں صدی میں امریکی نیگرو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی شناخت کی تلاش میں تاریخ سے مدد لے رہا ہے اور اس وقت بلیک ہسٹری اپنی ابتدائی شکل میں ہے مگر مستقبل میں یہ امریکی تاریخ نویسی میں بے انتہا اضافے کرے گی۔

امریکہ کے مقامی باشندوں کا ابتدائی دور میں یورپی اقوام سے جو تصادم ہوا' اس کی وجہ سے امریکی تاریخ میں ریڈ انڈین باشندوں کا جو تصور دیا گیا وہ یہ تھا کہ یہ ظالم' بے رحم' کام چور' سست اور کاہل لوگ ہیں اور نہ ان کی کوئی تاریخ ہے اور نہ تہذیب و تمدن۔

لیکن موجودہ دور میں صورت حال بدل گئی ہے۔ کیونکہ اب ریڈ انڈین ان کے لیے کسی خطرہ کا باعث نہیں۔ اس لیے مورخوں کے ایک گروہ نے ان کی تاریخ اور ثقافت پر تحقیق شروع کی اس کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ ریڈ انڈین طبقے نے تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے

لکھنا شروع کیا' انہوں نے اس فرسودہ نظریہ کی تردید کی کہ مقامی باشندے ست اور کاہل تھے اور یہ کہ انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے شکست تسلیم کرلی۔ انہوں نے واقعات کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ مقامی باشندوں نے مسلسل مزاحمت کی اور کئی جنگوں میں سفید فام اقوام کو شکست دی۔ سفید فام لوگوں نے دھوکہ دہی اور عہد ناموں کی خلاف ورزی کر کے ان پر فتح پائی۔ ان کی آبادی کو غیر اخلاقی حربے استعمال کر کے کم کیا' جن میں جراثیموں کے ذریعہ بیماریاں پھیلا کر ان کو مارنا شامل ہے۔

آثار قدیمہ کی دریافتوں نے اس کو ثابت کردیا ہے کہ یورپی اقوام کی آمد سے قبل امریکہ میں اعلیٰ اور ترقی یافتہ تہذیبیں موجود تھیں جن میں ایزٹک' بایا اور انکا مشہور ہیں کہ جن کو دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ میں اس وقت جو محدود ترقی پسند مورخوں کا طبقہ ہے وہ امریکی تاریخ کو تنقیدی اور معروضی انداز میں لکھ رہے ہیں۔ اگر ان کی آواز سنی گئی تو امریکی معاشرہ میں مثبت سوچ پیدا ہو سکتی ہے اور وہ اپنی موجودہ سامراجی اور جارحانہ پالیسی کو تبدیل کر کے دنیا کی دوسری اقوام میں اپنے لیے احترام و عزت پیدا کرسکتے ہیں۔

اختتامیہ

چاہے مشرق کی تاریخ نویسی ہو یا مغرب کی' اس کو مرد کے نقطہ نظر سے لکھا گیا' ہے کیونکہ اس تاریخ کا تعلق اس عہد سے ہے جب کہ مرد معاشرے میں اپنی برتری قائم کر کے عورت کو پس پردہ دھکیل چکا تھا اور ریاست و حکومت اور معاشرے کے دوسرے تمام اداروں پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا اور اس عہد سے عورت چار دیواری میں محصور ہو کر گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی پیدائش و پرورش میں ایسی مصروف ہوئی کہ اسے بہت کم عملی کاموں میں حصہ لینے کا موقع ملا' اور اس کے اس اہم کام کو بھی غیر اہم سمجھ کر اسے تاریخ کی تشکیل سے نکال دیا۔ اس لیے تاریخ نویسی پر مرد کی شخصیت چھائی ہوئی ہے۔ اس کی مردانگی' جرات و ہمت' شجاعت و جواں مردی' سیاسی جوڑ توڑ' انتظامی امور اور مذہبی معاملات سب میں اس کا تذکرہ ہے۔ اس تاریخ نویسی میں عورت صرف صنف نازک کی حیثیت سے ابھر کر آتی ہے۔ جس کا تاریخ بنانے میں کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔

بیسویں صدی میں عورتوں کی تنظیمیں مسلسل عورت کی کھوئی ہوئی عظمت واپس لانے میں جدوجہد کررہی ہیں اور اس سلسلہ میں وہ تاریخ سے مدد لے رہی ہیں۔ انہوں نے اب تاریخ کے ذریعہ ان پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی کہ جن میں عورتوں نے نمایاں حصہ لیا۔ خصوصیت کے ساتھ مغرب کی تاریخ نویسی میں عورتوں کی تاریخ روز بروز اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اور تاریخ میں عورتوں کی جدوجہد کو نمایاں طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ تعلیمی اداروں میں عورتوں کی تاریخ نصاب میں داخل ہے اور اب تاریخ کو اس انداز سے لکھا جا رہا ہے کہ یہ صرف مرد کی تاریخ ہی نہیں رہے بلکہ پورے معاشرے کی تاریخ ہو کہ جس میں مردوں اور عورتوں نے مل کر حصہ لیا ہو جس قدر عورتیں اپنی آزادی کی جدوجہد میں کامیاب ہورہی ہیں' اسی قدر وہ تاریخ میں اپنا مقام اونچا کر رہی ہیں۔

وہ موضوعات کہ جس سے معاشرہ میں عورت کی اہمیت ابھر کر آئی ہے۔ اس میں عورت کی گھریلو ذمہ داریاں بچوں کی پرورش' زراعت و صنعت و حرفت میں اس کا حصہ' رسوم و رواج کی تشکیل میں اس کی تخلیقی صلاحیتیں ماحول کے تشدد اور تناؤ کو کم کرنے میں اس کی کوششیں' موسیقی' رقص' مصوری اور فنون لطیفہ میں اس کے کارنامے اور یہ کہ عورت نے صدیوں سے مظلوم اور کچلے ہوئے ہونے کے باوجود کس طرح اپنی بقاء کی جنگ لڑی' عورت کی مزاحمت' بغاوت اور' اپنی حیثیت کو برقرار رکھنا' یہ تاریخ کے اہم موضوعات ہیں۔

تاریخ نویسی میں دوسرا اہم طبقہ جسے فراموش کردیا گیا تھا وہ اقلیتوں کا تھا۔ اقلیتیں چونکہ سیاسی قوت سے محروم ہوتی ہیں۔ اس لیے انہیں تاریخ کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں دیا گیا اور وہ اکثریت سے علیحدہ تنہائی میں محصور رہے۔ اس تنہائی میں انہوں نے اپنی علیحدہ روایات' اقدار' رسوم و رواج' اور ادارے بنائے۔ بیسوی صدی میں جب کہ تاریخ نویسی کے رجحانات میں تبدیلی آئی اور تاریخ صرف ماضی کی سیاست ہی نہیں رہی اور اس کا دائرہ وسیع ہوا تو اس کے ساتھ ہی اقلیتوں نے بھی اپنی تاریخ لکھنی شروع کردی اور انہوں نے معاشرہ کی سماجی و معاشی اور ثقافتی ترقی میں جو حصہ لیا تھا اس کو اجاگر کیا اور تاریخ کے ذریعہ انہوں نے خود کو علیحدگی سے نکال کر اپنی اہمیت کو تسلیم کردیا۔

بیسویں صدی میں تاریخ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے اور اب معاشرہ کا ہر پہلو اس کے اندر آگیا ہے۔ اس میں کھیل' موسیقی' رقص' حکومتی و ریاستی ادارے اور سائنسی و

سماجی علوم یہ سب تاریخ کے موضوعات ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب تاریخ میں عوام کی اہمیت ہوگئی ہے' صدیوں سے کچلے ہوئے پسے ہوئے مظلوم عوام کو جن کی زبانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے اور جن کی سوچ اور ذہن پر پابندیاں تھیں جن کی محنت و مشقت سے انکار کیا جاتا تھا اور جنہیں تاریخ میں کوئی مقام نہیں دیا جاتا تھا' وہ عوام وقت کے ساتھ باشعور ہو کر بڑی بڑی ہستیوں کو ان کے اعلیٰ مقام سے گرا کر ان کا مقام خود حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس احساس سے واقت ہیں کہ تاریخ کی تشکیل میں سب سے زیادہ حصہ ان کا ہوتا ہے۔

تاریخ نے عوام کو شعور دیا کہ وہ جنگیں جن میں وہ خون بہاتے تھے وہ ان کے مفادات کے لیے نہیں تھیں بلکہ حکمران طبقوں کے مفادات کے لیے تھیں جن کھیتوں میں وہ کام کرتے تھے اور جن کانوں سے وہ معدنیات نکالتے تھے اس کا صلہ انہیں نہیں حکمرانوں کو ملتا تھا' اس لیے انہوں نے تاریخ سے مسلسل سیکھا ہے اور اس شعور کی مدد سے وہ تاریخ میں اپنا مقام متعین کر رہے ہیں' اور اس تاریخی شعور کو پیدا کرنے میں ترقی پسند مورخوں کا بڑا اہم کردار ہے کہ جنہوں نے تاریخ نویسی کے ذریعہ تاریخ کے نظریات کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔

○

حصہ دوم:

تاریخ اور فرقہ واریت

پیش لفظ

کسی عہد کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کے مورخ کے ذہن کو سمجھا جائے اور اس کے ذہن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت کے نظریات و افکار اور رجحانات کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ تاریخ کے سمجھنے میں نہ صرف مدد گار ہوتے ہیں بلکہ اس سے تاریخ کا گہرا شعور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ نویسی کی اہمیت دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مختصر کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ نویسی کے رجحانات سے قارئین کو روشناس کرایا جائے۔

ڈاکٹر مبارک علی

برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات

ڈاکٹر مبارک علی

اگر ایک طرف تاریخ معاشرے میں شعور اور آگہی پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف یہ تنگ نظری و عناد اور بے عملی کا بھی باعث ہوتی ہے اس کا دارو مدار تاریخ نویسی اور اس کے نظریات پر ہوتا ہے کہ کن حالات میں واقعات کو کس طرح اور کس انداز اور کن مفادات کے تحت پیش کیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف طبقوں کے مفادات بھی بدلتے رہتے ہیں اور ان مفادات کے زیر اثر تاریخ نویسی کے نظریات و انداز بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً" مذہبی عقائد کے زیر اثر تاریخ کا الہیاتی نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت تاریخ خدا کے منصوبوں کی تکمیل کرتی ہے اس میں انسانی عقل و دانش کو کوئی دخل نہیں وہ اس بساط عالم پر ایک مہرے کی مانند ہے جو کائنات میں خدا کے منصوبوں کی تکمیل کررہا ہے۔ تاریخ کے اس نظریہ کے تحت انسان کی حیثیت ایک بے جان کٹھ پتلی کی طرح ابھرتی ہے جو حالات کے بہاؤ کے ساتھ بغیر کسی جدوجہد اور مزاحمت کے بہتا چلا جاتا ہے اور تاریخ میں جو کچھ ہورہا ہے یہ اس کی فہم و عقل سے بالا تر ہے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ خود کو تقدیر کے حوالے کردے اور تسلیم و رضا کا پیکر بن جائے۔

مذہبی عقائد کے حامل مورخین کی تاریخ نویسی میں مذہبی احیاء کا نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ تاریخ کو اس معیار اور زاویہ سے جانچتے اور پرکھتے ہیں' جو مذہب نے اپنے ابتدائی زمانے میں تشکیل دیئے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کے ابتدائی دور کا معاشرہ مذہب کی خالص اور جاندار روایت کا حامل تھا۔ اس لیے وہ ایک کامل اور مثالی معاشرہ تھا اور اس لحاظ سے تاریخی عمل کی انتہا تھی اس کے بعد سے تاریخ کے پاس سکھانے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ لہٰذا بعد کی تمام تبدیلیاں' بد ترین تبدیلیاں ہیں اور ان کے مضر اثرات کو

ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کی ابتدائی اور خالص روایات و اقدار کا احیاء کیا جائے۔ اور ترقی کی تمام علامات کو نیست و نابود کردیا جائے ان کے نزدیک معاشرے کی فلاح اس میں ہے کہ تاریخی عمل کو روک دیا جائے اور پھر واپسی کی جانب گردش ایام کو لوٹا دیا جائے کیونکہ بقول شبلی نعمانی ہماری ترقی اسی میں ہے کہ ہم آگے جانے کی بجائے پیچھے کی جانب جائیں اس نظریہ کے تحت لکھی جانے والی تاریخیں ماضی کی عظمت کو اجاگر کرتی ہیں اور ماضی کو تشکیل دیتے وقت ان میں عقیدت اور والہانہ لگاؤ ہوتا ہے۔ تنقیدی نقطہ نظر اور تجزیہ نگاری نہیں ہوتی۔

احیاء کے نظریہ کے برخلاف تاریخ میں ترقی کا نظریہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان برابر اور آگے کی جانب بڑھ رہا ہے اور انسانی معاشرہ دور وحشت و بربریت سے ترقی کرتا ہوا' عقل و دانش اور خرد مندی کے عہد تک پہنچ گیا ہے۔ یہ ترقی اس بات کی علامت ہے کہ انسان برابر آگے کی جانب بڑھے گا جتنا وہ ترقی کرے گا اتنا اس کا ماضی اسے تاریک اور غیر مہذب نظر آتا رہے گا۔

یورپی اقوام کی صنعتی و فنی ترقی اور اس کے نتیجہ میں نو آبادیاتی نظام تاریخ نویسی میں ایک اور تبدیلی لایا۔ ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں سیاسی اقتدار قائم کرنے کی غرض سے انہوں نے اپنے عوام کو یہ تاثر دیا کہ چونکہ ان ملکوں میں مطلق العنانیت ہے اور ان کے حکمران تمام ذرائع پیداوار پر قابض ہیں اس لیے ان ملکوں کو فتح کرکے انہیں ظالم حکمرانوں سے نجات دلائی جائے اور ان کی رعایا کو مہذب بنایا جائے نو آبادیاتی دور میں تاریخ کا یہ سامراجی نظریہ یورپ میں بڑا مقبول رہا۔

جب نو آبادیات میں یورپی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ تو انہوں نے دو قومی نقطہ نظر سے اپنی تاریخ کی جدید تشکیل شروع کی تاکہ اس کی مدد سے قومی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تاریخ نویسی میں بڑی تبدیلیاں آئیں کیونکہ نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد ہر آزاد ملک نے اپنی تاریخ نئے سرے سے لکھنی شروع کی اور اقوام عالم میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے تاریخ سے مدد لی۔ اس سے "سفید اقوام کی تاریخ" کا غلبہ کمزور ہوا اور یہ تصور کہ عالمی تاریخ کا مرکز یورپ ہے' وہ ختم ہوا' اور ایشیا و افریقہ و لاطینی اقوام نے عالمی تاریخ کے مرکز اپنے ہاں تلاش کرنے شروع کردیئے۔

لیکن قومی حکومتوں کے قائم ہونے کے بعد تاریخ نویسی کے رجحانات میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ نئے حکمران طبقوں اور اداروں نے تاریخ کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کیا' اس کے تحت شخصیت پرستی اور حکومتی اداروں کو تعریف و توصیف تاریخ کا ایک اہم حصہ بن گئے۔

مارکس اور اینگلز نے تاریخ کا جدلیاتی اور مادی نظریہ پیش کرکے تاریخی عمل کو سمجھنے میں مدد دی۔ اس کی روشنی میں انسانی تاریخ طبقاتی کشمکش اور جدوجہد کی تاریخ نظر آتی ہے جو ذرائع پیداوار اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کے سبب برابر بدل رہی ہے اس نقطہ نظر سے جب تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا تو اس میں طبقاتی مفادات سیاست' قانون، معیشت اور ثقافت سب پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے اس نظریے نے عوام کو تاریخ کا ایک ایسا شعور دیا کہ انہیں احساس ہوا کہ تاریخ میں صرف بادشاہوں' جاگیرداروں' امراء اور سرمایہ داروں کا تو ذکر ہے مگر ان کا نہیں جب تک ان میں تاریخی شعور نہیں تھا وہ یہی سمجھتے تھے کہ تاریخ بادشاہوں اور امراء کی ہوتی ہے لیکن اب وہ اس حقیقت سے واقف ہوئے کہ انہوں نے بھی تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے لہٰذا ان کا بھی تذکرہ تاریخ میں آنا چاہیے۔ ماضی میں چونکہ انہیں فراموش کردیا گیا اور ان کے تاریخی کردار اور عمل کی شہادتیں محفوظ نہیں رکھی گئیں اس لیے ضروری ہے کہ اب انہیں تاریخ فراموش نہیں کرے' اور جدید تاریخ نویسی میں نہ صرف یہ کہ ماضی میں ان کا صحیح مقام انہیں دیا جائے بلکہ موجودہ دور میں تاریخ ان کے تاریخی عمل کو محفوظ رکھے کیونکہ تاریخ کی تشکیل میں اب بھی وہ اتنے ہی سرگرم عمل ہیں جتنے ماضی میں تھے۔

اس پس منظر کے بعد آیئے اب برصغیر ہندوستان میں تاریخ نویسی کا جائزہ لیا جائے:

ہندوستان میں تاریخ نویسی کی ابتداء مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہوئی۔ ہمارے ابتدائی دور کے مسلمان مورخوں نے تاریخ میں الہیاتی نظریہ کو اختیار کیا اور تاریخ میں جو کچھ ہوا اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے واقعات کو من و عن تسلیم کرلیا اس لیے ان کے ہاں تاریخ کا معاشی و سماجی نقطہ نظر سے کوئی تجزیہ نہیں سلاطین اور مغل بادشاہوں کے دور کے اکثر مورخین چونکہ مذہبی علماء و فقہا تھے اس لیے انہوں نے بادشاہوں' امراء اور اہم شخصیتوں کے عمل اور کردار کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا اور ان کی تعریف و توصیف کی جنہیں وہ مذہب کا پابند سمجھتے تھے جو حکمران ان کے نزدیک شریعت کے پابند نہیں تھے۔

ان کے کردار اور طرز حکومت میں انہیں ماسوائے برائیوں کے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اسی لیے ضیاء الدین برنی نے علاؤ الدین خلجی، اور محمد تغلق پر کڑی تنقید کی اور عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے اعمال پر سخت گرفت کی، جب کہ التمش، ناصر الدین محمود، بلبن، فیروز شاہ اور اورنگ زیب نیک و خدا ترس اور صالح مسلمان قرار دیئے گئے۔

ان مورخین کے نزدیک تاریخ حکمرانوں، امراء، علماء، صوفیا کے کارناموں کی تاریخ ہے اس لیے انہوں نے یہ تاریخیں شخصیت پرستی کے نظریہ کے تحت لکھیں، اور بااثر و حکمران طبقوں کی شخصیتوں کو بڑے مبالغہ کے ساتھ پیش کیا تاکہ لوگ ان کے کردار، ان کی اصلاحات اور ان کی خوبیوں سے متاثر ہوں۔

ضیا الدین برنی اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

"انبیاء، خلفاء، سلاطین اور بزرگان دین دولت کے حالات و واقعات سے واقف ہونے کا نام تاریخ ہے۔ فن تاریخ کا مقصد خاص طور پر ان بزرگان دین و دولت کے حالات معلوم کرنا ہے، جو ذاتی کمالات رکھتے تھے اور اپنی بزرگی کے باعث دنیا میں ناموری اور شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ (اس کے برخلاف) ادنیٰ اور کم ظرف نالائق، نااہل، پست ہمت، گمنام، بے سروپا، کاہل، کم اصل اور بازاری لوگوں کو نہ تاریخ سے کوئی نسبت ہے اور نہ اس کا مطالعہ ان کا شغل ہوسکتا ہے، تاریخ جاننے سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، اور یہ علم کسی وقت بھی ان کے کسی کام نہ آئے گا، اس لیے تاریخ میں بزرگان دین و دولت کے اوصاف اور ان کی بزرگی و کمالات سے متعلق واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور ادنیٰ کم ظرف، کم اصل، اور بازاری لوگوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔۔۔۔۔ بخیل اور کم ظرف لوگوں کے لیے اس کا پڑھنا اور جاننا مضر ہے نہ کہ نفع بخش۔" (1)

اس لیے یہ مورخین علم تاریخ کو صرف حکمران طبقوں کے لیے مفید سمجھتے تھے کہ جس کے ذریعہ انہیں اچھے اور برے کی تمیز ہوتی ہے اور وہ ماضی کے حوادثات و واقعات سے سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کا ایک اہم پہلو ان کے ہاں عبرت ہے جو حکمران طبقوں کے سامنے شخصیتوں و قوموں کے عروج و زوال اور بلندی و پستی کو موثر انداز میں پیش کرتی ہے۔

چونکہ ان میں سے اکثر مورخ دربار کے ملازم ہوتے تھے اس لیے ان کی تاریخوں میں حکمرانوں اور امراء کی تعریف خوشامدانہ حد تک ہے۔ لہذا یہ تاریخیں نہ صرف واقعات

کی یک رخی تصویر پیش کرتی ہیں بلکہ یہ موضوعات کے اعتبار سے بھی محدود ہیں ان میں صرف حکمرانوں اور امراء کی شخصیتیں ابھرتی ہیں اور ماضی کے تمام واقعات و حالات پر چھا جاتی ہیں اور یہ تاثر دیتی ہیں کہ تاریخ صرف اہم شخصیتوں کے کارناموں کا دوسرا نام ہے۔

آخری عہد مغلیہ میں تاریخ نویسی میں انتہائی اہم تبدیلیاں آئیں کیونکہ اس دور میں مغل دربار کی طاقت و اہمیت کمزور ہوچکی تھی اور مورخین جواب تک دربار کے ملازم تھے اپنی ملازمتیں کھونے کے بعد تلاش معاش میں ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے جارہے تھے اس کے نتائج یہ نکلے کہ ایک طرف تو وہ دربار کے ملازم نہیں رہے۔ دوسرے بادشاہ کی سیاسی کمزوری کے بعد اب انہیں اس کی خوشامد کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے تاریخی واقعات کو بیان کرتے وقت وہ بادشاہ' امراء اور منصب داروں پر تنقید کرنے لگے اس دور انتشار میں جب کہ ریاست و حکومت کے تمام ادارے ٹوٹ پھوٹ رہے تھے' تو اس کے ساتھ ہی حکومت اور مطلق العنان اداروں کی گرفت بھی کمزور ہورہی تھی جس کی وجہ سے مورخ نے خود کو پہلی مرتبہ ذہنی طور پر آزاد محسوس کیا' اور اس ذہنی آزادی کے ساتھ اس نے واقعات و حالات کو قلمبند کیا۔

اس کی جھلک ہمیں اس عہد کی تاریخ نویسی میں ملتی ہے۔ تاریخ' دربار حکمران اور سیاست کی جدوجہد سے بڑھ کر اب اس دور کی سماجی و معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ کرنے لگی۔ اس کی مثال مرشد قلی خان کی "مرقع دہلی" اور آنند رام مخلص کا سفر نامہ ہے۔ جن میں ہندوستانی معاشرہ کی سماجی و ثقافتی سرگرمیاں اور عام حالات بڑی خوبصورتی سے ملتے ہیں۔

اس عہد کی تاریخ نویسی میں دور زوال کی اداسیاں' مایوسیاں اور سیاسی انتشار پوری طرح جھلکتا نظر آتا ہے اور مورخوں کی تاریخوں کے اکثر نام "عبرت نامہ" سے شروع ہوتے ہیں معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ اور زوال کے عمل کو سمجھنے کے لیے یہ تاریخیں بڑی مدد گار ثابت ہوسکتی ہیں۔

مغل دربار کی مرکزی حیثیت ختم ہونے کے بعد ہندوستان میں جگہ جگہ خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں۔ اور ان کے حکمرانوں نے اپنے خاندان اور ریاست کی تاریخیں لکھوائیں تاکہ ان کے خاندان کی عظمت ثابت کرکے اور ان کی حکمرانی کا جواز پیدا کیا جائے۔ اور رعیت میں ان کے لیے عزت و احترام کے جذبات پیدا کیے جائیں اسی دوران

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی ہندوستانی مورخین سے تاریخیں لکھوائیں جن میں ہندوستان کی ریاستوں کی انتظامی ابتری اور ان کے حکمرانوں کی نااہلی کو بیان کیا گیا ہے تاکہ تاریخ کا یہ نظریہ کمپنی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو جائز ثابت کرے اس دور کی تاریخ نویسی میں یہ دو متضاد نظریے دو طاقتوں اور دو طبقوں کے مفادات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

اسی عہد میں تاریخ نویسی میں ایک اور تبدیلی جب آئی' جب مغل جاگیردار اور امراء بادشاہ کی سیاسی طاقت کے خاتمہ اور دربار کی کمزوری کے بعد' دارالحکومت اور بڑے شہروں کے بجائے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں آباد ہوئے اور یہاں انہوں نے شاعروں' ادیبوں اور مورخوں کی سرپرستی کی ان کی سرپرستی میں اس عہد میں چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں کی تاریخیں لکھی گئیں جس کی وجہ سے تاریخ نویسی میں مختلف جہتیں آئیں اور تاریخ کا دائرہ پہلے سے اور زیادہ وسیع ہوگیا۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں ایک بڑی تبدیلی ہم برطانوی اقتدار کے بعد دیکھتے ہیں' انہوں نے اپنے خاص مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کی تاریخ کو نئے سرے سے تشکیل کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو درست اور جائز ثابت کرنے کے لیے تاریخ سے مدد لی جائے اس مقصد کے تحت ہندوستان کے ماضی کی تاریک تصویر پیش کی گئی اور یہ ثابت کیا گیا کہ عالمی تہذیبوں کے مقابلے میں ہندوستان کی زیادہ اہمیت نہیں' اور سیاسی و معاشی و معاشرتی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر ہندوستان کا یہ مقدر رہا ہے کہ وہ غیر ملکی طاقتوں کے زیر نگیں رہے:

انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو ہندو' اور مسلم ادوار میں تقسیم کرکے تاریخ میں فرقہ وارانہ و مذہبی نقطہ نظر کو داخل کیا۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں بسنے والی اقوام کو نسلی' مذہبی اور جغرافیائی لحاظ سے تقسیم کرکے ان میں اختلافات پیدا کیے' بعض کو شورش پسند اور باغی' بعض کو لالچی و کینہ پرور بعض کو لٹیرے و ڈاکو ثابت کرکے ہندوستان کی اقوام کو اخلاقی لحاظ سے پست اور رذیل ثابت کیا تاکہ سفید اقوام کی برتری مستحکم ہو۔

اس کے ساتھ ہی برطانوی حکمران طبقوں کو اس کی بھی ضرورت تھی کہ وہ ہندوستانی نظام سے جو انہیں ورثہ میں ملا تھا اس کی حقیقت و ماہیت سے واقف ہوتے اس لیے انہوں نے خصوصیت سے فارسی ماخذوں اور زبانی روایات کی مدد سے ابتدائی تاریخیں تیار کرائیں

اکثر فارسی کی تاریخی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اگرچہ یہ تاریخی کتابیں کئی کمزوریوں کا شکار ہیں' مثلاً" فارسی سے ناواقفیت کی وجہ سے واقعات کو غلط سمجھنا اور تاریخ لکھتے وقت متعصبانہ ذہن رکھنا وغیرہ' اسی لئے انہوں نے تاریخ سے جو نتائج اخذ کیے وہ صحیح نہیں تھے۔ لیکن ان تاریخوں کا اثر یہ ہوا کہ اس سے تعلیم یافتہ طبقے میں تاریخ کا شوق پیدا ہوا اور یہ احساس بیدار ہوا کہ اپنی تاریخ کو قومی امنگوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے سرے سے تشکیل دیا جائے۔

لہٰذا انہیں تاریخوں کے رد عمل کے طور پر ہندوستانی مورخین نے تاریخ میں قومی نقطہ نظر کو استعمال کیا اور اس کے ذریعہ آگے چل کر سیاسی جدوجہد میں برطانوی سامراج سے نظریات کی جنگ لڑی' تاریخ کے سامراجی نقطہ نظر کے خلاف انہوں نے قدیم ماخذوں کو کھنگال کر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہندوستان کی تہذیب سب سے زیادہ قدیم ہے اور ہندو فلسفہ' مذہب اور ادب اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ زمانہ قدیم میں ہندوستان میں نہ صرف جمہوریت تھی بلکہ یہ سائنس اور صنعت میں بھی انتہائی ترقی یافتہ تھا۔ اس لیے ہندوستان کی تہذیب سے دوسری تمام تہذیبوں نے سیکھا ہے۔ موئن جودڑو کی دریافت کے بعد سے ہندوستانی تہذیب سے کی قدامت ثابت ہوگئی' اور ہندوستان بھی' بابل' اسیریا' مصر' یونان' اور روم کی تہذیبوں کے مقابلہ پر آگیا۔ اس لیے ہندوستانی مورخوں نے آثار قدیمہ کی دریافتوں کو تاریخی مواد میں استعمال کرکے مبالغہ کی حد تک ماضی کی تصویر کشی کی۔

قومی جدوجہد کا یہی دور تھا جب ہندوستانی مورخین نے نہ صرف قدیم ہندوستان کی شاندار تصویر پیش کی بلکہ مسلمانوں کے عہد کی عظمت کو بھی ابھارا اور اس نظریہ کو آگے بڑھایا کہ سلاطین و مغل حکمران متعصب اور مذہبی تشدد کے حامل حکمران نہیں تھے بلکہ انہوں نے ہندوستان کی ہندو مسلم رعیت کے ساتھ یکساں سلوک کیا اور ان کے عہد میں ہندوستان نے تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے بہت ترقی کی اس قومی نقطہ نظر سے انہوں نے برطانوی اور اس کی کامیابیوں کو اس طرح پیش کیا کہ معاشی و سیاسی و معاشرتی حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بجائے' انہیں انگریزوں کی چالاکی' دھوکہ بازی اور فریب سے منسوب کردیا۔ چونکہ انگریز مورخین نے ریاستوں کے حکمرانوں کو نالائق اور عیاش بتایا تھا' اس لیے قومی نقطہ نظر سے لکھنے والوں نے انہیں ہیرو اور مظلوم بنا کر پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تاریخی عمل میں جو نظریاتی عوامل کام کررہے تھے' ان کو اجاگر کرنے اور

سامنے لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مثلاً" انگریزوں کی فتوحات کو چند اشخاص کی غداری سے تعبیر کیا گیا۔ میر جعفر، میر صادق اور ناؤ مل کی انگریزوں سے حمایت کو بنگال میسور اور سندھ کی فتح قرار دیا جب کہ اس پس منظر کا تجزیہ نہیں کیا گیا کہ ان لوگوں نے کیوں غداری کی؟ اور وہ کون سے عوامل تھے کہ جن کی وجہ سے ہندوستان کے حکمران طبقوں میں غدار پیدا ہو رہے تھے؟

ہندوستان میں سیاسی جدوجہد اور آگے بڑھی تو اس خیال سے کہ انگریزوں کے بعد اقتدار کس کو منتقل ہوگا۔ ہندوؤں میں احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں ان تحریکوں کے پس منظر میں مذہبی تعصب، جنون اور فرقہ وارانہ جذبات کارفرما تھے لہٰذا ہندوؤں کو متحد کرنے کے لیے انہوں نے قدیم ہندوستان کی تاریخ نو تشکیل کا کام شروع کیا، ساتھ ہی مسلمانوں کے عہد حکومت کو تنقید کا ہدف بنایا گیا اور خصوصیت سے تاریخ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا شروع کیا جن سے مسلمانوں کے ظلم و ستم کو زیادہ سے زیادہ بیان کیا جائے۔ ان شخصیتوں کو ابھارا گیا جنہوں نے مسلمان حکمرانوں سے جنگیں لڑیں، اس کے نتیجہ میں رانا پرتاب سنگھ اور شیوا جی ہندو قوم کے ہیرو بن کر اٹھے۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ وارانہ جذبات بڑی شدت کے ساتھ آئے۔ اس فضا میں ان مورخین کو انتہائی دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو تاریخ کو معروضی انداز میں لکھنا چاہتے تھے۔

چنانچہ ڈانگے لکھتا ہے کہ:۔

"عمرانی نقطہ نظر سے قدیم روایات کی جانچ پڑتال کو رجعت پسند ہندو اور ہندوستانی بورژوا (ہندو و مسلمان) نے روکنے کی کوشش کی کیونکہ اس تحقیق کے ذریعہ کچھ ایسے حقائق سامنے آتے تھے جو ان کی موجودہ اخلاقیات پر کاری ضرب لگاتے ہیں اس لیے انہوں نے ان کو تاریخ کا ایک حصہ بنانے پر سخت اعتراضات کیے۔ وہ اس "شرم" کو برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ اس قسم کی چیزیں بھی تاریخ کا حصہ تھیں۔ (2)

جب مشہور مورخ راجواڑے (RAJWADE) نے ہندو خاندان اور شادی پر کام کرنا شروع کیا تو اس کے خلاف مرہٹی پریس میں زبردست ہنگامہ ہوا اور آخر ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ وہ یہ کام پورا نہیں کرسکا۔ یہی حال جے ساول (JAYSAWAL) کا ہوا کہ اس کا پورا پورا مسودہ ضائع کردیا گیا (3) اسی ماحول میں جب پروفیسر حبیب نے محمود غزنوی پر اپنی مشہور کتاب لکھی تو ان کے خلاف مسلمانوں نے شدت کے ساتھ تنقید کی فرقہ وارانہ

جذبات کے زیر اثر جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں تاریخ کو اس نفرت کے پھیلانے میں استعمال کیا جانے لگا۔ مثلاً" جادو ناتھ سرکار نے اورنگ زیب اور شیوا جی پر جب کتابیں لکھیں تو اس کے جواب میں فاروقی نے اورنگ زیب کی حمایت میں کتاب لکھی اور تفضل داؤد نے (REAL SEWAJI) اصلی سیوا جی لکھ کر اس پر سخت تنقید کی۔ اس کی بعد سے ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فرقہ وارانہ نفرت ایک اہم عنصر بن گئی ہے۔ جس سے اب تک ہماری تاریخ آزاد نہیں ہو سکی ہے۔

ہندو مورخین نے جب قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل کی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ انہوں نے قدیم ہندوستان کی ماضی اور اس کی تہذیبی و ثقافتی عظمت و بلندی کو اپنے لیے خطرہ سمجھا اس لیے اس کے رد عمل میں مسلمان مورخین نے قدیم اسلامی تاریخ کی تشکیل کی طرف توجہ دی اور اس کی شان و شوکت میں انہوں نے اپنا تشخص تلاش کرنا شروع کیا چنانچہ شبلی نعمانی' عبدالرزاق کانپوری اور دوسرے مسلمان مورخین نے اسلامی تاریخ کی عظمت اور مسلمان حکمرانوں' سیاستدانوں اور ادیبوں اور علماء کی تاریخیں لکھ کر ان کے کارناموں سے لوگوں کو روشناس کردیا۔

اسلامی تاریخ سے دلچسپی اس لیے اور بھی زیادہ بڑھی کہ انگریز مورخین نے اسلام پر اعتراض کرنا شروع کردیئے تھے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ مسلمان ان کا مذہب اور ان کی تاریخ کمتر درجہ پر ہیں۔ یہ نقطہ نظر ان کے سامراجی عزائم کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اس صورت حال میں سرسید نے سیرۃ رسول اللہ پر یورپی مورخوں کے اعتراضات کا جواب دیا پھر یہ کام شبلی نعمانی اور امیر علی نے پورا کیا۔ اسلامی تاریخ کے شوق نے اور اسلامی عظمت کے تذکروں نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری جڑیں ہندوستان سے اکھاڑ کر پھینک دیں اور ان میں پان اسلام ازم اور امت مسلمہ کے خیالات پہلے سے زیادہ مستحکم ہوگئے اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ انہیں ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے عہد سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی کیونکہ اسلامی تاریخ میں انہیں جو شان و شوکت اور خیرہ کن جگمگاہٹ نظر آرہی تھی وہ ان کے نزدیک عہد سلاطین و عہد مغلیہ میں نہیں تھی۔ دمشق' بغداد' قاہرہ اور قرطبہ کی ہمسری دہلی' لاہور' آگرہ و فتح پور سیکری' ان کے خیال میں نہیں کرسکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شبلی نعمانی' مورخ اسلام' ہندوستان کی تاریخ سے اس حد تک ناواقف تھے کہ انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ گلبدن بیگم کون تھی اور اس نے کون سی تاریخی کتاب

لکھی تھی۔ (۵)

سرسید نے اپنی مخصوص فکر کے ساتھ پیغمبر اسلام پر اعتراضات کا تو جواب دیا مگر وہ پان اسلام ازم کے تصور کے خلاف تھے کیونکہ یہ برطانوی حکومت کے مفاد میں نہیں تھا اس لیے انہوں نے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ میں دلچسپی لی اور تاریخ فیروز شاہی' آئین اکبری' توزک جہانگیری' جیسی اہم کتابوں کو تصحیح کے بعد شائع کرایا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب میں تاریخ کا مضمون شامل نہیں ہوتا تھا۔ اگر تھوڑی بہت تاریخ پڑھائی بھی جاتی تھی تو وہ ابتدائی اسلامی تاریخ تھی۔ ہندوستان کی تاریخ نصاب کا حصہ نہیں تھی۔ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ سے عدم دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ہاں "عرب تاریخ" کو اسلامی تاریخ سمجھا گیا' عہد عباسیہ کے بعد کی تاریخ چونکہ عربوں کی تاریخ نہیں تھی اس لیے اسے ترکوں' ایرانیوں' مغلوں اور بربروں کی تاریخ کہا گیا۔ بعد میں جب تاریخ میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر آیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تاریخ کے ذریعہ ہندوؤں پر اپنی برتری ثابت کردیں اور خود کا حکمران نسل سے تعلق بتائیں تو اسی وقت ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ سے ان میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آزادی کے بعد تاریخ نویسی کے یہ رجحانات ہمارے ورثہ میں آئے ان میں خصوصیت سے مذہبی اور فرقہ وارانہ نظریات انتہائی قوی ہیں کیونکہ پاکستان کے قیام کے بعد سے حکمران طبقوں کی سیاست میں مذہب اہم کردار ادا کررہا ہے۔ اسی لیے تاریخ کی مذہبی اور فرقہ وارانہ تعبیرو تفسیر ان حکمران طبقوں کو مزید زندگی دے رہی ہے۔

اس نظریہ کے تحت تاریخ لکھنے والوں کا موقف یہ ہے کہ برصغیر ہندوستان و پاکستان کی تاریخ کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے کرنا چاہیے' کیونکہ اس سے پہلے کی تاریخ ان کے لیے فضول ہے چونکہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کا اسلامی روایات عقائد اور ثقافت سے کوئی تعلق نہیں' اس لیے اس تاریخ کی تشکیل مسلم معاشرہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس نقطہ نظر کو ماننے والے جن میں جذبات کی شدت ہے وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ موئن جو دڑو' ہڑپہ اور گندھارا تمام آثاروں کو بالکل ختم کردینا چاہیے کیونکہ ان کا تعلق دور جاہلیت و وحشت سے ہے اور اسلامی معاشرے کے قائم ہونے کے بعد ان پر فخرو مباہات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے اسی نقطہ نظر کے تحت قدیم ہندوستان کی تاریخ' مذہب' فلسفہ

اور ثقافت میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔

لہٰذا اس نقطہ نظر سے تاریخ لکھنے والوں کی کوشش ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو اسلامی تاریخ سے ملا دیا جائے تاکہ برصغیر کی مسلم ثقافت کی جڑیں عربی تہذیب و تمدن اور ثقافت مل جائیں۔ اس طرح ان کا رشتہ ہندوستان سے کٹ کر عرب و ایران سے قائم ہوجائے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمران کو اسلامی بنانے کی کوششوں میں اہم بات یہ ہے کہ اب ان کی سیاسی فتوحات کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کا معاشی و معاشرتی تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ اس کے نتیجہ میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد سے سندھ "باب السلام" بن گیا۔ یہی صورت حال محمود غزنوی اور معزالدین غوری کی ہے کہ جن فتوحات کو اب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ اور یہ مسلمان حکمران مذہبی نقطہ نظر سے مجاہد' غازی' بت شکن کے القابات سے نوازے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا میں تاریخ نویسی کا یہ نقطہ نظر بڑا مقبول ہوا اور عام مسلمان ان سلاطین و شہنشاہوں کے کارنامے پڑھ کر خوشی و مسرت سے دوچار ہوا' اور ان کی شان و شوکت اور جاہ و جلال سے اس میں فخر اور بڑائی کے جذبات پیدا ہوئے۔

حکمرانوں اور امراء کے کارناموں کے ساتھ ساتھ' ہمارے مورخین نے علماء اور صوفیا کے تذکرے بھی لکھے ہیں جن میں ان کے افکار' ان کے اثرات اور ان کی شخصیتوں کو ابھارا ہے یہ تذکرے بھی عقیدت کے تحت لکھے گئے ہیں اور ان میں تنقیدی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔

تاریخ نویسی میں یہ رجحانات ہمارے معاشرے میں حکمران طبقوں کے اقتدار کو مستحکم کررہے ہیں کیونکہ جن طبقوں کی ماضی کی عظمت کو ابھارا جارہا ہے وہ حکمران طبقوں کا ماضی ہے عوام کا نہیں۔ اس لیے ان کی ماضی کی شان و شوکت' فارغ البالی' خوش حالی اور دولت کی فراوانی کے تذکروں سے ان طبقوں میں اعتماد پیدا ہورہا ہے اور تاریخ کا یہ نظریہ تشہیر پا رہا ہے کہ شخصیتیں تاریخ ساز ہوتی ہیں' عوام نہیں۔ اس لئے ماضی کی عظمت کی یہ محدود تصویر عام لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عام مسلمان اس ماضی پر کیوں فخر کرے جس میں اس کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا یا جس کی تشکیل میں اس نے کوئی کام نہیں کیا ہو۔ اس لیے جب ماضی کے احیاء کی بات ہو اور اس کا پرچار کیا جائے تو

ایک عام مسلمان کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ اگر وہ سنہری دور لوٹ آیا تو کیا اس میں اس کے لیے بھی کوئی باعزت مقام ہے کیونکہ ایک طبقاتی معاشرہ کے احیاء میں صرف اعلیٰ طبقوں کو فائدہ ہو گا اور نچلے طبقے ماضی کی طرح ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے۔

تاریخ نویسی کے یہ نظریات عوام کی حیثیت کو کمزور کر کے ان میں احساس کمتری پیدا کر رہے ہیں ان کے ذہنوں میں اس کے مطالعہ کے بعد یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ ان کی بہتری کے ذمہ دار حکمران' علماء اور صوفیا کی شخصیتیں ہیں جو اصلاحات' عدل گستری اور نیک دلی کے ساتھ ان کی حالت کو سدھار دیں گے اس کی وجہ سے ان کا اپنا اعتماد ختم ہو جاتا ہے وہ اپنے حقوق کے لیے کوئی جنگ نہیں کرتے اور جمہوریت کے بجائے انہیں آمرانہ طرز حکومت میں اپنے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ اب بھی وہ اپنے حکمرانوں کی شان و شوکت' اعلیٰ خاندان شرافت' اعلی نسبی و دولت سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں ماضی کے حکمرانوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم کی سچائی ان کے ذہنوں پر اس قدر غالب ہے کہ وہ اسے فطری اور قدرت کی طرف سے سمجھتے ہیں' ہماری تاریخ نے ان خیالات و نظریات کے پرچار کے بعد عوام کو ذلت کی گہرائیوں میں ڈال کر ان کی امنگوں' ولولوں اور خواہشات کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ تاریخ نویسی کے یہ رجحانات ہمارے معاشرے کے طبقاتی مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان طبقوں کے مفادات کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تبدیلی ہوئی مگر انہوں نے کسی بھی مرحلہ پر عوامی شعور میں نہ تو اضافہ کیا اور نہ اسے پورا کیا' بلکہ عوامی شعور و آگہی کو روکا' مثلاً" سلاطین و مغل بادشاہوں کے مورخوں نے حکمرانوں اور امراء کے مفادات کو ذہن میں رکھتے ہوئے تاریخ لکھی' تو انگریزی عہد کے مورخوں نے سامراج اور ان کی حمایتی جاگیرداروں کی حمایت کی۔ اور آزادی کے بعد سے ہمارے مورخ حکمران طبقوں کے مفادات اور نظریات کے سانچہ میں تاریخ کو ڈھالنے کا کام کر رہے ہیں۔ تاکہ جبر و استبداد کے ادارے اور استحصالی طبقے قائم و دائم رہیں۔

ان حالات سے ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو ان طبقاتی مفادات کی زنجیروں سے آزاد کرایا جائے اور اسے تنگ اور محدود دائرے سے نکال کر وسیع اور کھلی فضا میں لایا جائے تاکہ اس کے ذریعہ سوئے ہوئے عوامی شعور کو بیدار کیا جائے اور تاریخ میں اس کی

جڑیں تلاش کر کے انہیں بھی ایسی یادداشتیں دی جائیں جو ان میں عزت و وقار کے جذبات پیدا کریں کیونکہ ہماری تاریخی یادداشتیں معاشرے کے طبقوں کی نہیں بلکہ صرف حکمران طبقوں کی ہیں۔ عوام کی اگر کوئی تاریخی شہادتیں ہیں بھی تو ان میں سوائے مایوسی' اداسی' ذلت و حقارت اور تلخی کے کچھ نہیں۔ اس لیے تاریخ نے اگر عوام کو ماضی میں کوئی باعزت مقام نہیں دیا تو وہ بغیر ماضی کے کھوکھلی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں گے' اور ان سے توقع نہیں کی جاسکے گی کہ وہ اپنے حقوق کے لیے جابرانہ اور آمرانہ حکومتوں سے جنگ کر سکیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ کی جدلیاتی اور طبقاتی نقطہ نظر سے تعبیر و تفسیر کی جائے اور تاریخی واقعات کے پس منظر میں طبقاتی مفادات کی نشاندہی کر کے ان کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے۔ تاریخ کے اس عمل سے استحصالی طبقوں کی صحیح تصویر عوام کے سامنے آئے گی اور یہی تاریخ کی وہ تفسیر ہوگی جو ان میں شعور و آگہی پیدا کرے گی۔

حوالہ جات

1- ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور 1969ء ص نمبر۔ 47-48

2- S.A:Dange: India: from primitivve communism To slevery Dilhi, 6th Edition, P, 20.

3- ڈانگے - ص - 20

4- علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک نے ایک مرتبہ شبلی سے گلبدن بیگم کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں' تو انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ گلبدن بیگم اور اس کی کتاب "ہمایوں نامہ" سے بالکل ناواقف ہیں۔ بعد میں انہوں نے ایک مختصر مضمون گلبدن پر تحریر کیا۔

حوالے کے لیے دیکھیے۔ شیخ محمد اکرم - یاد گار شبلی

لاہور۔ 1971ء' ص۔ 165 (فٹ نوٹ 1)

قدیم ہندوستان کی تاریخ اور فرقہ واریت

رومیلا تھاپر

جب ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ یہ ان مورخوں کا موقف نہیں ہوگا جنہوں نے قدیم ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ سب تعصبات سے پاک ہوں گے۔ اور اگر ان میں تعصب ہوگا بھی تو اس کا ہمارے موجودہ دور سے زیادہ تعلق نہیں ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھنا اور پڑھنا اور اس کی تعبیرو تفسیر کرنا عہد وسطیٰ اور جدید دور ہی تک محدود نہیں ہے اس کا شکار قدیم ہندوستان کی تاریخ بھی ہے۔ اور اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور مطالعہ کیا جائے تو اس کے سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔ موجودہ فرقہ واریت کے نظریہ کے تجزیہ کے بعد صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے جواز کے لیے جو دلیلیں چاہئیں ان کے لیے یہ قدیم ماضی کی تاریخ سے مدد لیتا ہے۔

اسی پس منظر میں ہندو فرقہ پرست کوشش کرتے ہیں کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ سے ایک مثالی ہندو معاشرہ کی تشکیل کریں اور بعد میں اس میں جو جو تبدیلیاں آئیں اور برائیاں داخل ہوئیں ان کی ذمہ داری وہ مسلمانوں کی آمد کو ٹھہرائیں۔ اسی طرح مسلمان فرقہ پرست علیحدگی کے رجحانات کی جڑوں کو عہد وسطی میں 11 ویں اور 13 ویں صدیوں میں تلاش کرتے ہیں۔

ایک چیز جس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی وہ یہ ہے کہ تاریخ میں نقطہ نظر کی تبدیلی ہر زمانہ کے نظریات کے زیر اثر ہوتی ہے اور یہ بات ہم موجودہ دور کے نظریات کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کی تعبیرو تفسیر میں ان کا کتنا گہرا اثر ہے ایک زمانہ تک تاریخ محض واقعات کے بیان کرنے کا نام تھا۔ اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی

جہاں تک واقعات کا تعلق تھا تو یہ مورخ اپنی پسند اور مرضی سے منتخب کرتا تھا اور اس لئے اس انتخاب سے مورخ کی اپنی ذاتی رائے کا اظہار ہوتا تھا یہ انتخاب تاریخ کی تعبیرو تفسیر کو متاثر کرتا ہے کیونکہ یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مورخ کون سے ماخذوں کو ترجیح دے رہا ہے اور کس حد تک ان ماخذوں کا تنقیدی جائزہ لے رہا ہے؟

قدیم ہندوستان کی تاریخ پر لکھی جانے والی تحریروں میں فرقہ واریت کے سوال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پچھلی صدیوں میں ہندوستان کی تاریخ نویسی پر جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔ قدیم ہندوستانی تاریخ اور کلچر پر تحقیق اٹھارویں صدی میں شروع ہوئی اور جب سے لے کر بیسویں صدی کے شروع تک اس میں تین رجحانات نظر آتے ہیں ان کو مستشرقین' افادیت پرستوں (UTILITARIANS) اور قوم پرستوں کے خیالات اور نظریات کہا جاسکتا ہے۔

یورپ اور ایشیا میں بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات جو پندرھویں صدی میں شروع ہوئے۔ اس نے یورپی عالموں اور مشنریوں میں آہستہ آہستہ ایشیا اور اس کے کلچر کے بارے میں دلچسپی پیدا کی۔ ہندوستان کے معاملہ میں یہ دلچسپی زبانوں کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ خاص طور سے سنسکرت اور فارسی زبانوں کا مطالعہ اس کا باعث بنا۔ اس میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب اٹھارویں صدی میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور کلاسیکل ہندوستانی روایات پر باقاعدگی اور ترتیب کے ساتھ کام شروع ہوا۔ یہ کام ان علماء نے کیا جو بعد میں مستشرقین اور ماہر علوم ہندی کہلائے ان میں سے جن لوگوں نے سنسکرت پڑھی وہ آریہ کلچر کے بڑے زبردست مداح ہوگئے اور انہوں نے اس نظریہ کی تبلیغ کی کہ انڈو' یورپی کلچر کی جڑیں ایک ہیں اور یہ کہ یونانی و سنسکرت ثقافتوں کی بنیاد بھی ایک ہے۔ اس میں آریاؤں کو ایک نسلی گروہ کی حیثیت سے دیکھا گیا نہ کہ لوگوں کو ایک ایسی جماعت جو مختلف زبانیں بولتے تھے۔ ہندوستان میں آریہ کلچر اور یورپ میں یونانی کلچر کی متحرکانہ قوت کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا اس کے نتیجہ میں ویدوں کا زمانہ اعلیٰ و ارفع بن کر ابھرا مستشرقین نے قدیم ہندوستان کے لوگوں اور ان کے معاشرہ کو ایک مثالی معاشرہ تصور کیا اور اس کی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر محض اس کی خوبیوں کو بیان کرکے اسے پرشکوہ بنایا تاریخ کی یہ تعبیرو تفسیر قدامت پرست ہندوؤں کے نظریات سے میل کھاتی تھی۔ جو ویدوں کی عظمت' اور وہ تمام ادب جو اس سے متعلق تھا اس کی بڑائی پر یقین رکھتے تھے۔

ہندوستانی مورخ جنہوں نے بعد میں اس رجحان کو اختیار کیا انہوں نے اس پس منظر کو جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آخر مستشرقین نے کیوں قدیم ہندوستانی معاشرہ کو شاندار طریقہ سے پیش کیا؟ ان میں سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ اکثر مستشرقین وہ تھے جو اپنے معاشرے میں تنہائی کا شکار تھے اور اس تبدیلی کے بارے میں شکی تھے جو یورپ کے اندر ہو رہی تھی خاص طور پر صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں صنعتوں کے فروغ اور ترقی نے اس لیے مایوس ہو کر انہوں نے مثالی معاشرہ کو دوسری جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی ان میں سے اکثر کے لیے یہ مثالی معاشرہ مشرق کی قدیم تہذیبوں میں پوشیدہ تھا۔ مارکس ملر' جس نے اپنا نام بدل کر اسے سنسکرت شکل دے دی تھی اور "موکشا مولا" کے نام سے مشہور ہوگیا تھا' اس کی ایک مثال ہے کہ کس طرح اس نے خود کو قدیم ہندوستان کی ثقافت سے روشناس کرا دیا۔ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اگر ماکس ملر خود ہندوستان میں آتا اور انیسویں صدی کا معاشرہ دیکھتا تو اس کا کیا رد عمل ہوتا؟

ان مستشرقین کی تحریروں کا اثر ان ہندوستانی جماعتوں اور مذہبی و سماجی اصلاحات کی تحریکوں پر بھی پڑا اور جو انیسویں صدی میں ویدوں کے کلچر پر زور دے رہی تھیں اور اسے مثالی ثابت کرکے اس کی جڑیں ہندوستان کی روایات سے ملا رہی تھیں ان میں آریہ سماج کی مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ان تحریروں میں یورپی فکر کے کچھ پہلو بھی متاثر ہوئے جن کا اندازہ ان کی مختلف تحریکوں سے ہوتا ہے' جیسے یورپی ادب میں رومانوی تحریک یا انیسویں صدی کے یورپ میں نسل پرستی کا نظریہ' نسل پرست مفکر گوبینو (GOBINEAU) نے اپنے بہت سے افکار کو آریہ نسل اور ذات پات کی تقسیم پر تشکیل دیا۔ اس کا نقطہ عروج بالآخر جرمنی میں بیسویں صدی میں ہٹلرازم کی شکل میں ہوا۔

دوسری وجہ' جس کی وجہ سے مستشرقین نے قدیم ہندوستانی کلچر کا دفاع کیا وہ اس لیے تھا کہ وہ افادیت پرستوں سے ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے یہ انیسویں صدی کے وہ برطانوی مفکر تھے۔ جن کے خیالات کا غلبہ اس وقت تھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان میں اہل برطانیہ کا اقتدار خدا کی جانب سے ہے اور برطانوی انتظام بالآخر ہندوستان کی پس ماندگی کو ختم کردے گا' مطلق العنان حکمرانوں کی حکومتیں ختم ہوجائیں گی اور ہندوستان کے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو جائے گا۔

افادیت پرستوں میں جیمس مل (JAMES MILL) کا نام قابل ذکر ہے کیونکہ اس نے ہندوستان کی تاریخ نویسی کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ مل کی "برطانوی ہندوستان کی تاریخ" کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے تاریخ نویسی میں فرقہ وارانہ نظریہ کی بنیاد ڈالی اور اس طرح سے دو قومی نظریہ کے لیے تاریخی جواز فراہم کیا وہ پہلا مورخ ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیااور انہیں ہندو تہذیب مسلم تہذیب اور برطانوی تہذیب سے موسوم کیا (دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانوی دور کو عیسائی تہذیب نہیں کہا)

مل نے جس طرح ادوار کی تقسیم کو یک طرفہ انداز میں تشکیل دیا ہے اس سے افادیت پرستی کے فکری اور سیاسی پس منظر کو سمجھا جاسکتا ہے' دراصل حیرت کی بات یہ ہے کہ تاریخ میں ادوار کی تقسیم کو بعد میں آنے والے مورخوں نے بھی تسلیم کرلیا اور موجودہ زمانہ تک مشکل سے کوئی ایسا قدم اٹھایا گیا جس میں اس کو چیلنج کیا گیا ہو اور اس کا تجزیہ کیا گیا ہو' چونکہ مل ہندوستانی تاریخ کا پہلا تسلیم شدہ مورخ تھا اس لیے اس کی تحریروں کا اتنا اثر ہے کہ اس کے بہت سے مفروضوں کو اب تک کئی حلقوں میں صحیح مانا جاتا ہے۔

اور کچھ مورخ اب تک ہندوستان کی تاریخ میں قدیم' عہد وسطی اور جدید اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں لیکن اس تقسیم کی بنیاد وہی رہی جسے مل نے قائم کیا تھا۔ یعنی ہندوستان کے حکمران خاندانوں میں مذہبی تبدیلی۔ مل کی یہ تاریخ ہندوستان کے برطانوی منتظمین کے لیے بنیادی ٹیکسٹ بک تھی' اور ہندوستان پر انیسویں صدی میں زیادہ کام ان ہی منتظمین نے کیا۔

مل کی تاریخ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ہندو کلچر پر سخت تنقید کرتا ہے اور اسے ترقی و عقلیت کی راہ میں ایک رکاوٹ سمجھتا ہے جس نے ہندو معاشرہ کو پس ماندہ رکھا۔ اس کا رویہ مسلم تہذیب کی طرف ہمدردانہ ہے اگرچہ وہ جگہ جگہ چبھتے ہوئے تنقیدی فقرے لکھ جاتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ مستشرقین کی ایک جماعت نے' اور بعد میں ہندوستانی مورخوں نے' ہندو تہذیب کا دفاع کیا اور اس دفاع میں انہوں نے قدیم ماضی کو مبالغہ کی حد تک بڑھا دیا۔

ابتدائی بیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخ نویسی پر قومیت کی تحریک کے اثرات ہیں۔ اگرچہ یہ مورخ جنہوں نے تاریخ کی تعبیر و تفسیر قومی نقطہ نظر سے کی ہے خود کو قوم پرست کہلوانا پسند نہیں کرتے' انہوں نے بہت زیادہ مستشرقین کے کام پر بھروسہ کیا' اور

ان کی تحریروں میں قدیم ہندوستان کا حوالہ بحیثیت ہندو--- ہندوستان کے آیا۔ انہوں نے بھی اس کی عظمت کو ذرا بڑھا کر ہی پیش کیا۔ اس طرح سے مستشرقین کی تحریروں کے دو نتائج نکلے: بنیادی طور پر وہ اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے ماضی کو دوبارہ دریافت کیا اور قوم پرستوں کے لیے ماضی سے لگاؤ کے مواقع فراہم کیے اس کے ساتھ انہوں نے ہندوستانی کلچر کے دفاع کے لیے مواد فراہم کیا لیکن ان کی کمزوری یہ رہی کہ انہوں نے غیر تنقیدی انداز میں ماضی پر تحقیق کی۔

تمام قومی تحریکوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کی تلاش میں مقامی روایات کو ابھارتی ہیں۔ ان بنیادوں پر قدیم ماضی کی شان و شوکت کو ایک حد تک صحیح و جائز تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اس پس منظر میں مقامی روایات تاریخی کلچر کی ابتدائی شکل میں تسلیم کی جاتی ہیں۔ جہاں کہیں بھی قوم پرستی کا تعلق نو آبادیات سے ہو' اور سامراج کے خلاف ہو تو ماضی کی شان و شوکت پس ماندگی کے لیے ایک سہارا بن جاتی ہے اس ماحول سے جو لوگ ماضی کا تنقیدی نظریہ سے جائزہ لیتے ہیں ان کے اس رویہ کو قومی مفاد کے لیے نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔ شان و شوکت کے اس تصور کو ذہن میں رکھنے والا اس بات سے ہچکچاتا ہے کہ وہ ہندوستانی معاشرے کے ابتدائی دور کے تضادات کو تسلیم کرے' خاص طور سے سماجی و معاشی اور مذہبی اختلافات کو۔

اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ دھرم شاستر جیسی نظریاتی کتابوں کے ذریعہ قدیم ہندوستان زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور اسے ایک مثالی زندگی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ موجودہ تاریخ نویسی کا ایک اہم نظریہ ہے کہ اس میں لکھنے والے کے ذہن اور اس کے مقاصد کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے' ابتدائی مورخوں نے اس کا خیال نہیں کیا اگر اس پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی مورخوں کا تعلق برہمن اور کشتریا ذاتوں سے تھا کیونکہ سنسکرت سیکھنے کے مواقع انہیں ملتے تھے اور ان کے ذہن میں کلاسیکی ماخذوں کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے قومی آزادی کی جدوجہد میں' سامراج کے خلاف جن نظریات کی ضرورت تھی' وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں تلاش کیے' جیسے غیر ملکی اقتدار کا نہ ہونا اور سیاسی نمائندگی وغیرہ' خصوصیت سے غیر ملکی اقتدار کے مسئلہ کو شمالی ہندوستان کی تاریخ سے نظر انداز کرنا بڑا مشکل تھا کیونکہ اس علاقہ پر مسلسل حملے ہوئے اور 600 ق۔ م۔ سے 500 عیسوی کے دوران شمال مغرب سے

آنے والے اسے فتح کرتے رہے۔

قوم پرست مورخوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ انہوں نے مل کی تاریخ کے تقسیم ادوار کو نہیں بدلا یہ اس لیے بھی ہوا کہ صرف سیاسی اور شاہی خاندانوں کی تاریخ لکھی گئی اور تاریخ کے سماجی و معاشی پہلوؤں پر توجہ نہیں دی گئی اگر تاریخ کو شاہی خاندانوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تیرھویں صدی کے بعد سے مسلمان حکمران خاندانوں کے اقتدار کی وجہ سے یہ مسلم دور کہلائے گا اور قدیم ہندوستان کا تعلق ہندو دور سے ہوگا اور اس کی شان و شوکت سے ہندوؤں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوگا۔ ان وجوہات کی بنا پر تاریخ میں ان دو ادوار کی تقسیم گہری ہوتی چلی گئی۔

1920ء کے بعد سے مسلمانوں میں جو سیاسی علیحدگی کے جذبات پیدا ہوئے تو اس نے اس تقسیم کو مزید مستحکم کردیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہندو دور کا خاتمہ ہوگیا اور مسلمان دور کی ابتدا ہوئی۔

اس ضمن میں تاریخ لکھتے وقت اس قسم کی بہت کم کوششیں ہوئیں جن میں اس وقت کے معاشرے کا تجزیہ کرکے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ آخر وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے ترکوں نے اتنی جلدی اور آسانی سے یہاں اپنی حکومت قائم کرلی اس نقطہ نظر کے تحت مسلم دور کو ہندوستان کے زوال کا دور مانا گیا۔ مسلم دور کا منطقی انجام بھی یہ ہوا کہ یہ اپنی خرابیوں کے سبب زوال پذیر ہوا اور اس کی جگہ انگریزی اقتدار نے لے لی۔

یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ مسلم دور میں دو قومی نظریہ' یعنی ہندو اور مسلمان کی علیحدگی کا تصور پیدا ہوا۔ جس کا منطقی انجام برصغیر کی تقسیم پر ہوا ہندو اکثریتی علاقوں میں ہندو ریاست' اور مسلمان اکثریتی علاقوں میں مسلمان ریاست قائم ہوئی لیکن اس مسئلہ پر زیادہ بحث نہیں کی گئی کہ مذہبی جماعتوں کی بنیاد پر کوئی ریاست تشکیل نہیں دی جاسکتی ہے۔ 1930ء اور 1940ء کی دھائیوں میں فرقہ وارانہ سیاست سے اس نقطہ نظر کو اور زیادہ تقویت ملی اور علیحدگی کے رجحانات گہرے ہوتے چلے گئے۔ لیکن پاکستان کی تخلیق سے بھی فرقہ پرست مورخوں کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ ہندو فرقہ پرستوں کو اب بھی مسلمانوں کے کلچر کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ اس کی اہمیت کو کم کرکے اسے غیر ملکی کہتے ہیں۔

اس تجزیہ کا مقصد یہ تھا مختصراً" ہندوستان کی تاریخ میں اوووار کی تقسیم اور اس کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے اور اب یہ دیکھا جائے کہ ہندو دور اور مسلمان دور کی جو اصلاحات استعمال ہوئی ہیں وہ کس حد تک صحیح ہیں۔

یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ 1000 ق۔ م سے لے کر 1200ء تک دور ہندو دور تھا۔ کیونکہ اس وقت برصغیر کے حکمران خاندانوں کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ لیکن اگر تاریخ کو صرف خاندانوں کی بنیاد پر پرکھا جائے تب بھی اس دور کو خالص ہندو نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ کئی ایک اہم خاندان ایسے تھے جو اس کی تعریف میں نہیں آتے' مثلاً" موریہ' انڈویونانی' شک اور کشن ان میں اکثر بادشاہ بدھ مت کو ماننے والے تھے اگرچہ وہ ہندوؤں کے خلاف نہیں تھے تو کیا اس لحاظ سے ایک اور بھی دور ہو گا۔ جسے بدھ دور کہا جائے اور اسکی مدت 500 ق۔ م سے 300ء تک متعین کی جائے اگر آج ہندوستان میں بدھ مت کے ماننے والوں کی زیادہ تعداد ہوتی تو یہ بات ممکن ہوسکتی تھی۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ آخر ہندو کی اصطلاح کا مطلب کیا ہے؟ خاص طور سے جب اسے ادوار کی تقسیم میں استعمال کیا جاتا ہے یہ اصطلاح اسلام سے پہلے ماخذوں میں نہیں آتی' اس کو ابتداء میں عربوں نے استعمال کیا پھر بعد میں دوسرے لوگوں نے جو ہندوستان میں رہتے تھے اس اصطلاح کو لیا۔ لہٰذا ہندو کا تصور ان ہندوؤں نے نہیں ابھارا جو کہ ہندوستان میں رہتے تھے بلکہ یہ ایک غیر ملکی اصطلاح ہے جسے ہندوؤں نے لیا اور استعمال کیا۔ اس لیے آج ہندو سے جو مفہوم لیا جاتا ہے یہ مفہوم قدیم ہندوستان والوں کے لیے ناقابل تسلیم تھا۔ وہ ہندو جسے ہندو مانا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا "گپت دور" کے بعد پانچویں صدی میں ہوئی۔ اس سلسلہ میں کافی شواہد ہیں جن کی بنیاد قدیم ماخذ ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی فرقے اور جماعتیں مسلمانوں کی آمد سے قبل اپنے آپ کو ہندو نہیں کہتی تھیں اور نہ ہی ہندومت ان کو متحد کرنے والا مذہب تھا اس کی مثال بدھ مت کے پیروکاروں کے ہاں ملتی ہے جنہوں نے ہندومت کے برعکس مذہبی تنظیم کے ذریعہ خود کو روشناس کرایا۔ حقیقت میں جدید ہندو مذہب کی خصوصیات' خاص طور سے بھگتی فرقے کے بعد سے جو عہد وسطی میں ابھرا' تشکیل دی گئیں اور یہ وہ دور ہے جسے فرقہ پرست مورخ زوال کا دور کہتے ہیں۔

ہمارے مباحثہ کے تعلق سے یہ سوال بھی انتہائی اہم ہے کہ آخر وہ کون سی اصطلاح

تھی جو ابتدائی دور میں ہندو خود کو مسلمانوں سے ممتاز رکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے' یعنی ساتویں صدی سے تیرھویں صدی تک۔ ایک قابل غور بات یہ ہے کہ آج جب ہم تاریخ کے اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں تو عربوں' ترکوں اور ایرانیوں کو ملا کر ان سب کے لیے ایک لفظ "مسلمان" استعمال کرتے ہیں۔ تیرھویں صدی تک لفظ مسلمان کا استعمال ماخذوں میں شاذ و نادر ملتا ہے اس عہد کے ماخذ سیاسی اصطلاح کو استعمال کرتے تھے لہٰذا ترک "تورشک یا ترشک" کہلاتے تھے اور عربوں کے "یاوَن" کہا جاتا تھا لفظ یاون روایتاً" ان سب لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو مغربی ایشیا اور بحر روم کے علاقوں میں سے آئے تھے چاہے وہ یونانی ہوں یا رومی اور عرب۔ خود یاون کا لفظ سنسکرت میں دوسری زبان سے آیا یہ پراکت میں یون ہے جو درحقیقت "ایونیا" سے نکلا ایونین وہ یونانی تھے جن کا سب سے پہلا تعلق مغربی ایشیا سے ہوا۔

ایک دوسری اصطلاح جو ترکوں' ایرانیوں اور عربوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی وہ ملیچھ کی تھی۔ اس لفظ کی تاریخ بھی قدیم ہے سب سے پہلے یہ رگ وید میں آیا' اور ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا جو غیر آریائی زبان بولتے تھے اور آریائی کلچر سے ناواقف تھے۔ اس لیے ابتدائی ملیچھ وہ قبائل تھے جو شمالی اور وسط ہند میں رہتے تھے اور غیر آریائی زبانیں بولتے تھے۔ آگے چل کر اس کے استعمال میں اور وسعت ہوئی اور یہ اصطلاح تمام غیر ملکیوں کے لیے کہی جانے لگی۔ اس طرح ملیچھ کوئی مذہبی اصطلاح نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق ثقافتی اظہار سے تھا اس لیے جب عربوں اور ترکوں کو ملیچھ کہا گیا تو اس کا مطلب ان غیر ملکیوں سے تھا جن کا تعلق اجنبی کلچر سے تھا یا تو انہیں سیاسی دوست سمجھا جاتا تھا یا سیاسی دشمن' کیونکہ عربوں' ایرانیوں اور ترکوں کا تعلق برصغیر کے لوگوں سے جنگ اور تجارت کے سلسلہ میں رہا اس لیے انہیں دوست اور دشمن دونوں حقیقتوں سے پہچانا جاتا تھا ترکوں کے سیاسی اقتدار میں آنے کے بعد ان کی پہچان ایک علیحدہ مذہب کی وجہ سے ہوئی اس کی وجہ ہندو مذہب کا مذہبی ڈھانچہ تھا جس نے دوسرے مذہب والوں کی علیحدہ مذہبی بنیادوں پر ان کی شناخت کرائی۔

آخر میں دیکھنا یہ ہے کہ اگر حکمران خاندانوں کی تبدیلی کے اصول کو مان بھی لیا جائے تو کیا پھر بھی مل کی تقسیم ادوار کے نظریہ کو صحیح ثابت کیا جاسکے گا؟ اگر ہندوستان کی تاریخ کو محض خاندانوں کی تاریخ سمجھ لیا جائے تو پھر اس کا جغرافیائی محل وقوع صرف گنگا کی

وادی رہ جائے گا اس علاقہ میں ابتدائی تیرھویں صدی تک حکمران خاندانوں کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ اس کے بعد مسلمان خاندانوں کی حکومتیں آئیں' لیکن اگر برصغیر کی تاریخ کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو پھر ادوار کی یہ تقسیم ناقابل تسلیم ہوگی۔ برصغیر میں مسلمان خاندانوں کی آمد مختلف علاقوں میں' مختلف اوقات و ادوار میں ہوئی۔ مثلاً" عربوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ فتح کیا اور وہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ ترکوں نے گیارھویں صدی میں پنجاب کے ایک حصہ کو اپنے تسلط میں لے لیا اور پھر تیرھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ مسلمان خاندانوں نے چودھویں صدی میں دکن میں حکومت قائم کی اور جنوبی ہند کے آخری علاقوں میں ان کا اقتدار بہت بعد میں قائم ہوا۔ لہٰذا ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ایک وقت میں قائم نہیں ہوئی۔ نصاب کی کتابوں میں مسلمانوں کے اقتدار کے قیام کو 1000ء یا 1200ء مانا جاتا ہے حالانکہ اس کا تعلق صرف شمالی ہندوستان کے ایک حصہ کی تاریخ سے ہے۔

تاریخ کی تعبیر و تفسیر لوگوں کے تصور ثقافت اور قومیت کا ایک اٹوٹ انگ ہوتی ہے اس وجہ سے تاریخ کی تحریر کا تعلق ذہن کے بہت ہی حساس حصہ سے ہوتا ہے اور تاریخ کے گہرے اثرات قوم پرستی اور سیاسی عقائد پر پڑتے ہیں۔

تاریخی تحریروں میں سب سے خطرناک رجحان وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد فرقہ واریت یا فرقہ وارانہ مفروضات پر ہوتی ہے اور یہ مفروضے عام طور پر بغیر کسی تنقید کے اس طرح سے تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں کہ ان پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس لیے تاریخ کے وہ استاد جو اس علم کو پڑھاتے ہیں وہ ان مفروضوں کو تاریخی سچائی سمجھ لیتے ہیں اور اس سے گریز کرتے ہیں کہ ان کا مفروضی تجزیہ کریں اور ان مفروضوں کی تاریخی حیثیت کو سچ یا جھوٹ ثابت کریں اس بے توجہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تاریخ کے مضمون کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بہت کم اہمیت دی جاتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں تاریخ کا تصور اب تک پہلے سے منتخب کئے ہوئے واقعات کے بیان کا نام ہے۔ نہ تو ان واقعات کے انتخاب کی وجہ کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے اثرات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس طرح سے ایک خاص قسم کی معلومات حاصل کرتے ہیں اور وہ اس کو زبانی یاد کرلیتے ہیں جب یہی لوگ آگے چل کر تاریخ پڑھاتے ہیں

تو اس معلومات کو اسی طرح سے دہراتے ہیں۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ جدید تحقیق کے نتائج جو تاریخ کے ایک خاص پہلو میں نکالے جاتے ہیں انہیں نصابی کتابوں یا معیاری کتابوں میں بہت کم استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اکثر سکولوں اور کالجوں میں تاریخ کے طالب علم اب تک اس مضمون کو مواد اور ٹیکنیک کے اعتبار سے انہیں خطوط پر پڑھ رہے ہیں جیسا کہ ایک یا دو نسل پہلے پڑھایا جاتا تھا۔

آیئے اس کے بعد ہندوستانی تاریخ کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو لیا جائے یعنی آریاؤں کا مسئلہ اس بارے میں کچھ مستشرقین نے لسانیات کی بنیادوں اور شہادتوں پر آریاؤں کی نسل کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ یہ لوگ شمالی ہندوستان میں ہجرت کرکے آئے اور پنجاب و وادی گنگا میں آباد ہوئے یہاں انہوں نے جو کلچر پیدا کیا اس کا مواد ویدوں میں ہے۔ پچھلے تیس سال میں کافی مقدار میں آثار قدیمہ کی شہادتیں سامنے آئی ہیں جو ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم آریاؤں کے مسئلہ کو نئے انداز سے دیکھیں چونکہ آریا کلچر کو تنقیدی نقطہ نظر سے جانچا گیا ہے اس لیے اب اس کو بھی نئے انداز سے دیکھا جاسکتا ہے مثلاً" یہ بات ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ آریا کسی حدود کے علاقہ کی بالکل علیحدہ نسل تھے اس طرح آریاؤں کے کلچر کو خالص ثابت کرنا اور اس کا مقامی کلچر پر غالب آنے پر اصرار کرنا بھی مشکل ہے اگر ہم یہ کہیں کہ آریاؤں کی اصطلاح ایک زبان بولنے والی جماعت کے لیے تھی نہ کہ مخصوص نسل کے لیے تو اس میں سچائی ہوگی اس طرح ویدوں کا ادب بھی آریا اور غیر آریا کے ملاوٹی کلچر کی نمائندگی کرتا ہے اگرچہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ دو کلچر کبھی علیحدہ علیحدہ رہے ہوں۔

آج کل تاریخ پر جو کتابیں لکھی جارہی ہیں ان میں اس جدید تحقیق کا کوئی عکس نظر نہیں آتا بلکہ اس کے برعکس ان میں دو رجحانات ملتے ہیں جنہیں وہ لوگ اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں جو کہ آریا کلچر کی شان و شوکت کو بڑھانے اور اسے پر عظمت بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس قسم کی کوششیں بھی کی جارہی ہیں کہ ہڑپہ کا کلچر بھی آریائی تھا' جب کہ آثار قدیمہ کے شواہد اس تھیوری کے خلاف ہیں۔ یہ کوشش کہ ہندوستان ہی دراصل آریاؤں کا آبائی وطن تھا۔ درحقیقت ایک ایسی کوشش ہے کہ جس سے جھوٹے قومی فخر کو تسکین دی جائے اور اس پر اصرار کیا جائے کہ آریا کلچر مکمل طور پر مقامی تھا' یہ اس لیے

بھی ہے کہ وہ لوگ جو ہندوستان کو تہذیب کا مرکز مانتے ہیں یہ ان کے لیے باعث شرم ہے کہ ویدوں کی فکری بنیاد ہندوستان نہیں تھی۔ دراصل آریا کلچر کے اعلیٰ اور پر عظمت ہونے کا تعلق ہندوستان کی تاریخ کے ہندو نقطہ نظر سے ہے اس لیے وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ویدوں کے ادب میں جو کلچر ملتا ہے وہ مقامی ہے۔ ویسے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ویدوں سے پہلے کے کلچر کو آثار قدیمہ کی شہادتوں کی بنیاد پر دیکھا جاتا' اور یہ پرکھا جاتا کہ کس حد تک ویدوں کا کلچر ان سے متاثر ہوا جب قدیم ادب کا غیر تنقیدی مطالعہ کیا گیا تو اس کے نتیجہ میں بھی ہندوستان کی تاریخ میں آریائی کلچر کی اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا اور اس ضمن میں آثار قدیمہ کے شواہد کو بالکل نظر انداز کردیا گیا۔ اس لیے آریاؤں کے طرز معاشرت کی جو تصویر تشکیل دی گئی وہ بالکل صحیح نہیں ہے مثلاً" اگر اس سے انکار کیا جائے کہ آریا کچھ موقعوں پر گائے کا گوشت کھاتے تھے اور شراب پیتے تھے تو یہ ادبی اور آثار قدیمہ کی شہادتوں سے انکار ہوگا۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں آریاؤں کا مسئلہ ہی کوئی ایک مسئلہ نہیں کہ جس پر غور کیا جائے اس کے علاوہ بھی دوسرے مسائل ہیں جو پیچیدہ الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً" گپت کے دور حکومت کو سنہری زمانہ کہنا بھی ان میں سے ایک ہے اسے ہندو نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جاتا ہے جب کہ اس دور کے فنی و آرٹسٹک کارنامے بدھ مت کے ماننے والوں کے تھے (مجسمہ سازی۔ مصوری) اور ان کا تعلق خانقاہوں سے تھا۔ سائنسی کارنامے جزوی طور پر مقامی تھے اور جزوی طور پر عالمی جیسا کہ چرک' ششرت اور آریہ بھٹ کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے جو بعد میں وراہامی ہیر میں پائی گئیں۔ ہندو مذہب کے عدم تشدد اصول کے برخلاف سمدر گپت کی شان و شوکت کی بنیاد اس کی بہادری اور فتوحات کو بتایا جاتا ہے۔ کالید اس کی تحریروں' ابتدائی پورانوں اور گپت عہد کے سکوں اور کتبوں میں ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہندو طریقے کی سرپرستی کرتے ہیں تو کیا اس صورت میں یہ ہندو نشاۃ ثانیہ گپت عہد کے سنہری دور کا ایک حصہ تھی؟

اس کے علاوہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے بہت سے مفروضے پیدا ہوگئے ہیں جو اگر بلا واسطہ فرقہ وارانہ نہیں لیکن ان کو آسانی سے فرقہ وارانہ نقطہ نظر میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ان مفروضات کو بہت کم صحیح تاریخی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ مثلاً" ہندوستان کے کلچر کی روحانیت پر عقیدہ ایک مفروضہ ہے۔ اب یہ ایک تسلیم شدہ

حقیقت ہے کہ اہل ہندوستان ہمیشہ سے مابعد الطبیعاتی اور فلسفیانہ مسائل کے غور و فکر میں مشغول رہے اور روزمرہ کے دنیاوی معاملات میں نہیں الجھے' لیکن یہ نظریہ مقابلتاً" نیا ہے اور اسے انیسویں صدی کے مصنفین نے وسیع پیانہ پر اپنی تحریروں میں سب سے پہلے پیش کیا۔ ابتداء میں اسے ان لوگوں نے پیش کیا جو قدیم ہندوستانی معاشرہ میں یوٹوپیا کی تلاش میں تھے اس کے بعد ان لوگوں نے اس کی تبلیغ کی جو یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ ایک ایسا موثر طریقہ ہے جس کے زیر اثر ہندوستانیوں کو اہم دنیاوی چیزوں سے جیسے صنعتی ترقی' ٹیکنالوجی' اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی سے روکا جاسکے اس خیال کو ہندوستانی اسکالرز نے بڑے شوق سے قبول کیا کیونکہ اس میں انہیں اس احساس کمتری کا توڑ ملا جو کہ ایک غیر ملکی طاقت کے ماتحت رہنے سے پیدا ہوجاتا ہے بہت کم ایسے تھے جنہوں نے مسئلہ کے اس پہلو پر غور کیا ہو کہ آخر روحانیت کا مطلب کیا ہے؟ اور اس کا تمام کلچر پر کیسے اطلاق کیا جائے؟ لوگوں کی اکثریت کے مطابق ہندوستانی کلچر کی روح کو اس طرح سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں لامحدود کے بارے میں غور و فکر کیا جاتا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ہندوستانی کلچر کی روحانیت پر کوئی اجارہ داری نہیں وہ خصوصیات جن کا تعلق ہندوستانی روحانیت سے ہے وہ دوسرے قدیم کلچروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ قدیم ہندوستان کے لوگوں نے خود کو اپنے قریبی ہمسایوں یا دور کے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ روحانی نہیں سمجھا اور نہ ہی ان سیاحوں نے جن میں یونانی' چینی اور عرب تھے اور تقریباً" مساوی کلچر کے نمائندہ تھے' انہوں نے سیاحت کے دوران ہندوستانی معاشرہ کی کسی خاص روحانی خصوصیت کا کوئی ذکر نہیں پھر سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کے کس طبقہ کو روحانی سرگرمیوں کی اجازت تھی کہ وہ لامحدودیت پر غور کرسکیں' یا تصوف اور فلسفہ کے امور پر بحث کریں؟ ظاہر ہے کہ یہ آزادی معاشرے کے ایک بہت اقلیتی جماعت کو حاصل تھی۔ بہت کم لوگوں کو اس پر عبور تھا کہ وہ اپنشد کے وعظ دے سکیں۔ رگ وید کے گیت بھی ایک چھوٹے سے گروہ ہی نے نظم کیے' اسی لیے اس روشنی میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کا تمام معاشرہ مذہبی علماء اور رشیوں پر مشتمل تھا؟ ویدوں کے ادب سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے کہ لوگوں کا تعلق روز مرہ کے معاملات سے تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک دنیاوی زندگی گزارتے تھے یہ صحیح ہے کہ بعد مسیح کی ابتدائی صدیوں میں فلسفہ کے مختلف مکاتیب فکر اور مذہب کے نئے فرقوں میں روحانی سرگرمیاں ضرور پائی جاتی

تھیں۔ ورنہ اس عہد میں جو ادب تخلیق ہوا جیسے کالیداس کے ڈرامے ان میں دربار کی سرگرمیوں کے علاوہ مشکل ہی سے روحانیت کا کوئی سراغ ملے گا۔ ہندوستان کی روحانیت پر سب سے اہم اشارہ خود ہندوروایات کے اندر ہے۔ جس میں انسان کی زندگی کے چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

دھرم' ارتھ' کام اور موکش

ان میں سے صرف آخری روحانیت پر زور دیتا ہے' ان میں مادی فوائد اور مسرت کو اہمیتیں دی گئی ہے اور ان چاروں مقاصد کے ذریعہ زندگی میں توازن پر زور دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے روحانی کلچر کی ایک اہم بنیاد عدم تشدد ہے اس کو اس وقت زیادہ اہمیت ملی جب گاندھی نے عدم تشدد کے اصول کو قومی تحریک سے ملا دیا۔ عدم تشدد کے فلسفہ کی بنیادیں ہندوستانی فکر کی طویل تاریخ میں ملتی ہیں۔ اس کو ابتداء میں بدھ مت اور جین مت میں ایک اہم فکر کے لحاظ سے ابھارا گیا۔ لیکن جہاں تک اس کے فلسفیانہ تصور کا تعلق ہے تو یہ کوئی ہندوستان کی اپنی اپج نہیں تھی' ابتدائی عیسائیوں نے بھی اس خیال کی تبلیغ کی تھی۔ اگرچہ یہ اصول بمقابلہ عیسائیت کے بدھ مت کی تعلیمات سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن بدھ مت ہندوستان میں زندہ نہیں رہا۔

اس میں بھی فرق کرنا پڑے گا کہ ایک تو عدم تشدد بحیثیت فکر کے ہے اور دوسرا یہ پہلو کہ اس پر کس حد تک عمل ہوا ہے۔ اس کی شہادتیں بہت کم ملیں گی کہ ہندوستان کی تاریخ میں تشدد کو اختیار نہ کیا گیا ہو' حملوں کی صورت میں اکثر تشدد کو اختیار کیا گیا اور ہندوستان کی روایات کے اہم واقعات کا تعلق تشدد سے ہے جیسے کہ بھگوت گیتا اور مہابھارت میں جنگ کے تذکرے۔

اس میں صرف ایک غیر معمولی استثنیٰ ہے (اور حقیقت میں یہ شخصیت ہندوستانی کلچر سے بالکل علیحدہ ہے) وہ بادشاہ اشوک ہے' جو ظالمانہ فوجی مہموں کے بعد آہستہ آہستہ عدم تشدد کی پالیسی کا قائل ہوتا گیا اور پھر اس نے اپنی سیاسی پالیسی کو اس اصول پر تشکیل دیا' اور وہ واحد اور تنہا تاریخی شخصیت رہا جس نے طاقت میں رہتے ہوئے اس اصول کو اختیار کیا۔ لیکن اس کے تعلق سے بہت سی متضاد باتیں ہیں ایک طرف تو اسے عدم تشدد کی پالیسی کی وجہ سے سراہا جاتا ہے تو دوسری جانب اسے موریہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا الزام دیا جاتا ہے اور یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس کے عدم تشدد کے اصول کی وجہ سے

فوج کمزور ہوئی اور ملک میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ وہ شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکتا۔

ہندوستان کی ابتدائی تاریخ کے عظیم ہیرو' اجاتا شر' چندر گپت موریہ' کنشک' سمدر گپت' ہرش' پولا کیش دوم' مہندر ورمن پلاؤ اور راجندر چولا وغیرہ تمام اس لیے ہیرو ہیں کہ یہ بنیادی طور پر فاتح تھے۔ سالوں بعد ہندوستانی تاریخ کے طالب علموں نے سمدر گپت کو ہندوستانی نپولین کہا۔ (ونسنٹ اسمتھ کے بعد سے) کیونکہ اس نے ایک ایک کرکے بادشاہوں اور قبائلی سرداروں کی بیخ کنی کی۔ جب اس کے اس عمل کو شاندار کہا جاتا ہے تو یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے آخر عدم تشدد کی پالیسی کہاں گئی؟

نقطہ نظر کی یہ یک رخی ایک دوسرے موضوع میں بھی نظر آتی ہے۔ بہت سی معیاری کتابوں میں محمود غزنوی کو مندروں کو تباہ کرنے والا اور بتوں کو توڑنے والا بتایا گیا ہے اور وہ ان باتوں کا ذمہ دار اس لیے تھا کہ وہ مسلمان تھا اس موقع پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ صرف مسلمان مندروں کو تباہ کرتے اور بتوں کو توڑتے تھے۔ کیونکہ اسلام میں بتوں کی پرستش منع ہے ایک اور بات جو فرض کرلی جاتی ہے وہ یہ کہ تمام مسلمان حکمران بتوں کو توڑ سکتے تھے اگر ان کی راہ میں دوسری رکاوٹیں نہ ہوتیں اس بات کی بہت کم کوشش کی گئی ہے کہ محمود کے اس رویہ کے دوسرے پہلوؤں پر بھی تحقیق کی جاتی۔ اس سلسلہ میں دوسرے دلائل بھی تلاش کئے جاسکتے تھے اور اس کا دوسرے نقطہ نظر سے بھی مطالعہ ہو سکتا تھا اگر اس سلسلہ میں ہندو بادشاہوں کی روایات کا مطالعہ کیا جاتا اور یہ دیکھا جاتا کہ کیا ان میں سے بھی کسی نے مندروں کو تباہ کیا اور بتوں کو توڑا؟ یہاں ہم ایک ہندو بادشاہ ہرش کی مثال دیتے ہیں جو گیارھویں صدی میں کشمیر کا بادشاہ تھا' مندروں کو تباہ کرنے کا کام اس نے منظم شکل میں کیا' کلہن نے راج ترنگی میں ہمیں بتایا کہ اس نے ایک خاص عہدے دار مقرر کیا تھا جو دیوت پتن انیک کہلاتا تھا (اس کے معنی تھے وہ عہدے دار جس کا کام دیوتاؤں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہو) اس کا خاص کام یہ تھا کہ مندروں میں لوٹ مار کی جائے اور بتوں کو توڑا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مذہبی بت شکن تھا لیکن یہ ضرور تھا کہ مندروں کو تباہ کرنے سے اس کا مقصد ان کی دولت حاصل کرنا تھی اور اس نے دولت کو سلطنت کے دوسرے کاموں میں استعمال کیا۔

اب تک جو باتیں کی گئی ہیں اس کا مقصد محض یہ نہیں کہ فرقہ وارانہ نقطہ نظر پر

تنقید کی جائے بلکہ اس کے پس منظر میں جو دو عوامل کام کر رہے ہیں ان پر نظر ڈالی جائے:

اول یہ کہ جو کتابیں فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں تاریخی اہمیت کے لحاظ سے ان کا معیار انتہائی پست ہے ان میں بھی جن میں بلاواسطہ کوئی فرقہ وارانہ جذبات نہیں لیکن انہوں نے مقبول عام نظریات کو تسلیم کرلیا ہے اور یہ چیز ان کے ذہن کے انتشار کو ظاہر کرتی ہے اور اس کے نتیجہ میں غیر معیاری کتابیں لکھی جاتی ہیں جب کہ تاریخ کا علم ایک ترقی پذیر علم ہے اور اس میں اب نئی تیکنیک اور نئے تجزیاتی طریقے استعمال ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری تاریخ نویسی کا احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے پرانی تیکنیک اور طریقوں کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ جس انداز میں ان مفروضوں کو پیش کیا گیا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مفروضوں جن کی حمایت میں کمزور شہادتیں ہوں' ان کو نہ صرف چیلنج کرنا چاہیے بلکہ انہیں ترک بھی کردینا چاہیے۔

دوسری اہم وجہ جو ہماری تاریخ نویسی میں ہے اس کا تعلق ہماری موجودہ صورت حال سے ہے۔ مورخوں کو کبھی بھی اس صورت حال پر تیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ تاریخ کو اتنا گرا دیں کہ جھوٹی تاریخ سیاسی نظریات پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے چونکہ مورخ شعوری اور غیر شعوری طور پر سیاسی عقائد کے ذہنی مبلغ نہیں بن سکتے اس لیے تاریخ کا تجزیہ خاص طور سے سیاسی نظریات کے لیے انتہائی اہم بن جاتا ہے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ آہستہ آہستہ تحقیق کی نئی تیکنیک اور نئے ماخذوں کے استعمال کے بعد تبدیل ہورہا ہے اور یہ تبدیلی صرف قدیم ہندوستان کی تاریخ میں ہی نہیں ہے بلکہ اسے تمام قدیم کلچروں کے مطالعہ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے' خاص طور سے سماجی علوم میں نئی تحقیق کی پیش رفت کے بعد اور ان میں بھی علم بشریات اور آثار قدیمہ کی نئی دریافتیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ دوسرے مختلف معاشروں کے مطالعہ نے قدیم معاشروں کے تاریخی کردار کو بہت واضح کردیا ہے۔

سماجی علوم میں جدید تحقیق کے نتیجہ میں ادبی ماخذوں پر خاصا تنقیدی کام ہورہا ہے جس سے قدیم ماضی کو نئے انداز سے دیکھا اور جانچا جاسکتا ہے اس قسم کا تجزیاتی مطالعہ ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔ مثلاً" پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ مواد جسے ایک ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا جارہا ہے کیا ذہنی تخلیق ہے یا حقیقی صورت حال کا بیان ہے؟ اس قسم کا سوال خاص طور سے دھرم شاستر کے بارے میں اٹھتا ہے جسے بنیادی ماخذ

کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ وہ یہ قانونی دستاویز ہیں جو کہ معاشرے کے رویہ اور اس کے روایات کو ظاہر کرتی ہیں اور یہ حقیقی صورت حال کا بیان نہیں ہے تو اس صورت میں قدیم ہندوستان کا مطالعہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔ دھرم شاستر میں ذات پات کی تقسیم اور ڈھانچہ کو جسے ورن (رنگ) کا نظام کہا گیا ہے اب اسے بھی چیلنج کیا جارہا ہے خاص طور سے ہندوستانی معاشرے کے سماجی تجزیہ کے بعد سے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ماخذوں کو ان کے سماجی پس منظر میں دیکھا جائے گا؟ اور یہ کہ کیا کہ ماخذ تمام معاشرے کی مجموعی حیثیت سے نمائندگی کرتے ہیں یا کسی ایک خاص اور محدود گروہ کی؟ اکثر ماخذ جو زمانے کے ہاتھوں محفوظ رہ کر ہم تک پہنچے ہیں' ان کا تعلق طبقہ خاص سے ہے یعنی بادشاہوں' اہم مذہبی راہنماؤں' خانقاہوں کے پجاریوں اور دولت مند تاجروں وغیرہ سے اس طرح ان میں معاشرے کے اعلیٰ طبقہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قدیم معاشروں میں عام طور سے چیدہ چیدہ طبقوں ہی کو تعلیم کے مواقع ملتے تھے اس لیے وہی اس قابل ہوئے تھے کہ اپنی سرگرمیوں کو ادبی شکل میں محفوظ رکھ سکیں مثلاً" کالیداس کے ڈرامے دربار اور اس کے اداروں و روایات کے لیے بہترین مواد فراہم کرتے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ عام ہندوستانی معاشرہ اس طریقہ سے رہتا تھا جیسا کہ اس میں طبقہ امرا کے بارے میں بتایا گیا ہے تو یہ ایک تاریخی غلطی ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے ماخذوں کو بھی استعمال کیا جائے تاکہ معاشرے کی مکمل تصویر سامنے آئے۔

ابتدائی بدھ ادب برہمنی ادب کے مقابلہ میں اپنے عہد کی بہت عمدہ تصویر کشی کرتا ہے کیونکہ برہمنی ادب میں معاشرہ کے ایک مخصوص طبقہ کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے اور اس وجہ سے اس کا نقطہ نظر یک رخا ہوجاتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلسل دوسرے ماخذوں کی تلاش کرتے رہنا چاہیے' کیونکہ اگر صرف برہمنوں کے ماخذوں پر بھروسہ کیا جاتا تو اس صورت میں اشوک کا پورا دور ہمارے سامنے نہیں آتا۔ کیونکہ پرانوں میں اس کا نام موریہ بادشاہی کی فہرست میں شامل ہے اور بس' اس کے بارے میں برہمنی ادب سے ہمیں کوئی معلومات نہیں ملتیں یہ معلومات اس کے اپنے کتبوں اور بدھوں کے ماخذوں سے ملتی ہیں۔

اس سے ملتی جلتی صورت حال یہ ہے کہ برہمنی ادب میں چارواک لوکایت فلسفیوں

کے بحث و مباحث و افکار تقریباً" ناپید ہیں ان فلسفیوں کے وجود کی شہادتیں جو مادی فکر کے حامی تھے' بدھ' جین' اجی وک اور مختلف کتبات جمع کرنے پر ملے ہیں جن میں ان کا ذکر ادھر ادھر اتفاقیہ طور پر آگیا ہے۔

قدیم ہندوستان کے مورخوں کے لیے تاریخی مواد کا اہم ذریعہ آثار قدیمہ ہیں آثار قدیمہ کی کھدائی کی تیکنیک اب اس قدر ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ ان کی معلومات کی بنیاد پر تاریخ کی تشکیل بہتر طریقہ سے کی جاسکتی ہے یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے قدیم ہندوستان کے مورخوں نے آثار قدیمہ کی معلومات کو بہت کم استعمال کیا ہے جب کہ ان سے جو شہادتیں ملی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ ہندوستان کے قدیم ادب کی شہادتوں کا تعلق صرف خاص طبقوں سے متعلق ہے اس کے مقابلہ میں آثار قدیمہ کی شہادتیں نہ صرف خاص طبقوں سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں بلکہ ان سے عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے۔ شہروں اور رہائش کی جگہوں کی جب کھدائی ہوئی تو ان سے عوام کے تمام طبقوں کے بارے میں شہادتیں ملیں ادب سے جو مواد ملا ان سے صرف بادشاہوں کے ناموں کی فہرست اور ان کے کارنامے معلوم ہوجاتے ہیں' لیکن آثار قدیمہ کی بدولت اب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کتنے طبقوں کے لوگ ہڑپہ تہذیب کے شہروں میں رہتے تھے اور یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ان کی آثار کی مدد سے ان کی روز مرہ زندگی کو تشکیل دے دیا جائے۔ اور یہ وہ تاریخ ہوگی کہ جس میں کسی بادشاہ کا ذکر نہیں ہوگا' کیونکہ یہ آثار بادشاہوں کے ناموں کے سلسلہ میں خاموش ہیں۔ آثار قدیمہ کا علم اس کا اظہار کرتا ہے کہ حکمرانوں کی فہرست مرتب کرنا کچھ کے لیے دلچسپ کام ہوسکتا ہے مگر سب کے لیے نہیں اور یہ کہ یہ ماضی کے مطالعہ کے لیے انتہائی غیر اہم چیز ہے آثار قدیمہ کی شہادتوں نے قدیم تاریخ کے مطالعہ کے لیے نئے نئے راستوں کو ہموار کیا ہے۔

ایک اور وجہ جو اس کی اہمیت کی ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعہ ہماری معلومات میں جو کمی رہ گئی تھی وہ پوری ہوتی ہے۔ اس کی بدولت اب ہندوستان کی تاریخ کی ابتداء کو دور تک یعنی قدیم زمانہ تک لے جایا جاسکتا ہے۔ اور اس تاریخ کی بنیاد اب قدیم ادب اور دیومالائی تصورات پر نہیں بلکہ ٹھوس شہادتوں پر ہوگی جو ہمیں آثار قدیمہ نے فراہم کی ہیں اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کی ابتداء' ارتقاء' ترقی کے بارے میں آسانی سے بتایا جائے۔ جب تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وادی گنگا و جمنا کی وادی میں آریہ کلچر کا

ظہور ایسے ماحول میں نہیں ہوا جہاں پہلے سے کوئی دوسرا کلچر موجود نہ ہو' اس کا مطالعہ یہ ٹھوس شہادتیں دیتا ہے کہ یہاں پہلے سے ایک کلچر موجود تھا۔

مواد کی کمی کی وجہ سے اس وقت جن واقعات کو حقیقت سمجھا جاتا ہے' یا جن کے بارے میں شبہ ہے' آثار قدیمہ کے مطالعہ کے بعد ان کی تصدیق یا نفی ہوسکتی ہے۔ آریاؤں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مواد کی کمی ہے گنگا کے میدان میں جو منقش چیزیں ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سیدھے سادھے لوگ تھے' قدیم زمانے کے اور کاشتکاروں کی طرح جن کا طرز رہائش ترقی یافتہ نہیں تھا ان کے بارے میں ویدوں میں جو شان و شوکت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اسے محض ادبی لفاظی کہا جاسکتا ہے۔ تاریخ میں واقعات کی تصدیق کے لئے اہم واقعہ ہستنا پور کی کھدائی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تباہی سیلاب کی وجہ سے ہوئی جیسا کہ مہابھارت میں لکھا ہے۔ دارالحکومت کی تبدیلی کی بھی اس سے تصدیق ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا جب ہستنا پور میں سیلاب آیا تھا موریہ دور کے کچھ واقعات سے ادبی آثار قدیمہ کی باہمی شہادتوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

آثار قدیمہ کی ایک اور دریافت اعداد و شمار کی معلومات ہیں کھدائی کے بعد روز مرہ کی استعمال کی چیزیں جیسے برتن زیوارت' سیپ گھونگے کے ہار اور استعمال کی دوسری اشیاء بڑی تعداد میں ملی ہیں ان میں برتنوں کے اعداد و شمار کے ذریعہ روز مرہ کی زندگی کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ان کی ساخت' خوبصورتی' اور شکل نہ صرف اس وقت کے طرز معاشرت کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں بلکہ ایک خاص قسم کے برتنوں کی مختلف جغرافیائی علاقوں میں تقسیم اس کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ تجارتی سلسلہ میں ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں گئے یا لوگ ہجرت کے وقت انہیں اپنے ساتھ لائے۔ مثلاً" شمال کے مشہور کالی پاش کی چیزوں کی تقسیم' جو کہ موریہ عہد سے پہلے اور بعد کی پر تعیش چیزیں تھیں ان سے موریہ سلطنت کے اصل رقبہ کے بارے میں پتہ چلتا ہے اس طرح سکوں کو بھی اعداد و شمار کے ذریعہ معلومات کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

کتبات جو آثار قدیمہ کا ایک حصہ ہیں' یہ تاریخ اور آثار قدیمہ کے درمیان ایک رشتہ قائم کرتے ہیں۔ کتبات کسی عہد کے بارے میں اعداد و شمار کے ذریعہ معلومات فراہم کرنے میں جو بمقابلہ ادبی معلومات کے ٹھوس اور درست ہوتے ہیں ان کا مواد مختصر ہوتا

ہے کیونکہ پتھر پر کھدائی کا عمل دشوار ترین ہوتا ہے اس لیے بادشاہوں کی تعریف کے علاوہ یہ اہم معلومات کو اختصار کے ساتھ دیتے ہیں ان کتبات کو ادبی مواد پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کہ ایک مرتبہ جب ان پر کھدائی ہو چکتی ہے تو پھر ان میں ردوبدل نہیں ہو سکتا ہے۔ نہ تو ان کی عبارت تبدیل ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قدیم ادبی تحریروں میں ہوا جنہیں کئی صدیوں کے دوران دوبارہ لکھتے وقت یا مرتب کرتے وقت کئی بار تبدیل کیا گیا۔

کتبات میں نہ صرف سیاسی معلومات ہوتی ہیں بلکہ ان میں سماجی اور معاشی حالت کے بارے میں بھی کافی مواد ہوتا ہے۔ وہ کتبات جن میں گپت دور کے بعد زمینوں کی تقسیم کا ذکر ہے' یہ ایک لحاظ سے قومی دستاویزات ہیں اور اس لحاظ سے اس دور کے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات فراہم کرتے ہیں اگر یہی چیزیں تحریری شکل میں ہوتیں تو اس دور کی تاریخ کا مطالعہ بالکل بدل سکتا تھا۔ مثلاً" اس بات کو بار بار کہا جاتا ہے اس عہد میں ذات پات کا نظام بہت سخت ہو گیا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ ترکوں اور افغانوں کے حملوں کی مزاحمت کرتا' حالانکہ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سخت ہونے کے بجائے اس دور کے ذات پات کے نظام میں خاصی لچک تھی۔

آثار قدیمہ کی معلومات کا سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ اس نے مورخوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ حکمرانوں اور بادشاہوں کے خشک مطالعہ سے آگے بڑھ کر معاشرہ کا مجموعی طور پر بامقصد مطالعہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ آثار قدیمہ کا تعلق اس مواد سے ہے جو زمانہ کی دست برد سے بچ گیا ہے اور اس کی مدد سے فنی و ٹیکنالوجی کی تبدیلی کو بنیاد بنا کر کلچر اور دوسری معاشرتی تبدیلیوں کو جو اب تک فراموش کردی گئیں تھیں' جیسے کہ سماجی ڈھانچہ' معیشت اور صنعت و حرفت' ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے' شاہی خاندانوں کی تاریخ اس طویل کہانی کا صرف ایک حصہ ہے جو تاریخ بیان کرتی ہے۔

لیکن ادبی مواد کا تنقیدی جائزہ یا آثار قدیمہ کی نئی دریافتیں بذات خود کافی نہیں ہیں اس لیے تحقیق کرتے وقت موضوع کے تعلق سے ماخذوں پر نئے نقطہ نظر سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اگر دیکھا جائے تو شاہی خاندان یا بادشاہوں کا حسب نسب تاریخ کا اصل مرکز نہیں ہوتا بلکہ اس کی تہہ میں طاقت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کو یعنی طاقت اور طاقت کی تقسیم کو دیکھنا چاہیے۔ کیا بادشاہ طاقت کا مرکز تھا یا طاقت مختلف

اداروں اور عہدے داروں میں تقسیم ہوگئی تھی؟ اگر "مشرقی مطلق العنانیت" کی تھیوری یا قدیم ہندوستان کے بادشاہ کی فیض رسانی کو چیلنج کیا جائے تو وہ تاریخ کا کامیاب تجزیہ ہوسکتا ہے لیکن طاقت کے جذبہ کا مطالعہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ معاشی ڈھانچہ کو صحیح طریقہ سے نہیں سمجھا جائے گا۔ ریونیو / مالیہ کے ذرائع یعنی انسانی محنت کو پیداواری شکل میں وصول کرنا' اور پھر اس آمدنی کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنا' اس کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ طاقت ایک جگہ جمع تھی یا اسے تقسیم کیا ہوا تھا۔ معاشی عوامل کے علاوہ مذہبی اثرات اپنا علیحدہ کردار ادا کرتے ہیں اور اس کے کردار کو بھی اس دائرہ میں رہ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سماجی ڈھانچہ میں چونکہ ذات پات کا ہونا ضروری ہے اس لیے دیکھنا چاہئے کہ کیا حقیقت میں سماجی ڈھانچہ "ورن شرم' دھرم" کے اصولوں پر قائم ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر غیر کشتر یا حکمران کیسے بن گئے؟ یہ صرف ایک مثال ہے جس سے تھیوری اور عمل کے تضاد کو دیکھا جاسکتا ہے کیا اس تضاد کا تعلق سیاسی طاقت میں تھا؟ اور وہ کون سی بنیادیں ہیں جن پر معاشی ڈھانچہ اور ذات پات کے نظام کو سمجھا جائے؟

اس سے بھی زیادہ اہم وہ موضوع ہے جس پر ہندوستان کے مورخوں نے بہت کم کام کیا ہے' یعنی مختلف جماعتوں اور گروہوں کے درمیان کشمکش کی وجوہات' ہر معاشرے میں کش مکش اور ہیجان کے جذبات ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم ہندوستان کے سلسلہ میں اس کی نہ تو خاص تعریف کی گئی ہے اور نہ ہی اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا گیا ہے بلکہ اکثر اس رجحان کو دیکھا گیا ہے کہ کش مکش کو چھپایا جائے یہاں تک کہ عہد وسطیٰ تک آجاتے ہیں۔ اور اس عہد کے بارے میں کچھ مورخ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور کوشش کرکے ہندو مسلمان تناؤ کے واقعات لے آتے ہیں۔ لیکن ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش کو 1206ء کے بعد سے بھی جب کہ اس میں مذہب کا عمل دخل ہوگیا تھا' صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ جب تک ہم ابتدائی زمانہ کے تضادات کو پوری طرح سے نہیں سمجھ لیں۔ قدیم زمانہ میں اس سیاسی تناؤ کی شہادتیں بالکل واضح ہیں اور اس کی مثالیں تخت و تاج پر قبضہ کرنے' بادشاہوں کے قتل اور باہمی جنگوں میں ملتی ہیں اس ضمن میں دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے کس حد تک معاشرہ کو متاثر کیا؟ گاہے بگاہے جنگیں یقیناً" معاشی بحران پیدا کرتی ہوں گی۔ مختلف مذہبی فرقوں میں اختلافات سے دباؤ پیدا ہوتا ہوگا اشوک کی مسلسل رواداری کی اپیل بلاوجہ نہیں ہوسکتی تھی اگر یہاں مختلف جماعتوں میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ

ہوتا۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ برہمنوں اور چارواک کے درمیان اختلافات کن کن بنیادوں پر تھے کہ جن کی وجہ سے ان کے بارے میں تمام حوالے برہمنوں کے فلسفیانہ ادب سے ختم کردیئے گئے اور کیا وجوہات تھیں کہ کچھ مذہبوں نے خاص خاص جماعتوں کو متاثر کیا جیسے بدھ مت نے تجارتی طبقوں کو اور شاہی خاندانوں کی عورتوں کو؟ اور آخر کیوں پورے برصغیر میں جین مت کے ماننے والوں کا تعلق تاجر برادری سے ہے؟

اور اس بات کے مطالعہ کی بھی ضروت ہے کہ ان حالات میں یہ کش مکش کن کن مرحلوں سے گزری؟ مثلاً" آریاؤں اور داسیوس (DASYUS) اور (PANIS) کے درمیان کش مکش کی کیا وجوہات تھیں' کیا یہ نسلی تھا جیسا کہ تسلیم کیا جاتا ہے اور یا یہ کلچر کی اجنبیت کی وجہ سے ہوا؟ یا یہ غیر ملکی اور ملکی کش مکش کی ایک صورت تھی؟ اور وہ کون سی وجوہات تھیں کہ یونانیوں اور اس کے تھینوں کو درایت کشتری کہا جانے لگا؟ اور وہ کس طرح سے ہندوستانی معاشرے میں گھل مل گئے؟ تیرھویں صدی سے پہلے اہل ہندوستان عربوں اور ترکوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟ اس قسم کے سوالات اٹھانے کا یہ مقصد نہیں کہ اس سے صرف ذہنی ورزش ہو بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان سوالات کے مطالعہ کے بعد تاریخ کا مطالعہ با مقصد ہو سکے گا۔

ان سوالات کی وضاحت دو طریقوں سے ہو سکتی ہے اول ان کو ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور کے سلسلہ میں پوچھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ وہ سوالات ہیں جن کا تعلق معاشرہ کے ہر دور سے ہو سکتا ہے ان سوالات کے جوابات جو تجزیاتی مطالعہ کے بعد تشکیل دیئے جائیں گے' وہ ہندوستان کی تاریخ اور اس کے عمل کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔ دوم' یہ سوالات ماضی کے مختلف پہلوؤں کو واضح طور پر سامنے لا کر ان کے بارے میں سمجھنے کے مواقع فراہم کریں گے اور ان کے جوابات کی تلاش میں گہرائی تک جایا جا سکے گا اور اہم و غیر اہم عوامل کو پرکھا جا سکے گا جو ہندوستان کی تاریخ میں کام کر رہے ہیں اور اس کی راہوں کو متعین کر رہے ہیں۔ صرف اس صورت میں ہم ہندوستان کی تاریخ میں اسلام کے صحیح اثرات کا جائزہ لے سکیں گے اور ان تمام عوامل اور طاقتوں کو بھی سمجھ سکیں گے جنھوں نے ہندوستان کے ماضی کی تخلیق کی۔

عہد وسطیٰ کی تاریخ اور فرقہ وارانہ نقطہ نظر

ہربنس مکھیا

مسلم ہندوستان کی اصطلاح ہمارے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سات صدیوں سے زیادہ زمانہ کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور اب نہ صرف اس اصطلاح کو تسلیم کرلیا گیا ہے بلکہ اسے مقبول بھی بنایا جارہا ہے۔

ہمارے عہد وسطیٰ کی اس فرقہ وارانہ تاریخ کی جو عقلی دلیل دی جاتی ہے وہ یہ کہ نئے حکمرانوں کا مذہب جنھوں نے گیارھویں یا تیرھویں صدی میں ہندوستان پر حکومت کی مذہب اسلام تھا جب کہ ان سے پہلے حکمران ہندو تھے۔ ادوار کی اس تقسیم میں جو اہم غلطیاں ہیں ان کی جانب ڈاکٹر تھاپر نے اشارہ کیا ہے لیکن اس کے علاوہ اس میں دو چھپے ہوئے مفروضے ہیں جن پر سوال کیا جاسکتا ہے۔

1- حکمران کی زندگی' یا حکمران خاندان' یا حکمران طبقوں کی تاریخ کو ہندوستان کی تاریخ سمجھ لیا گیا ہے اور حکمران کے مذہب کو فیصلہ کن عنصر مان لیا گیا ہے۔

2- ہندوستان میں اسلام کے کردار کو منجمد اور ٹھہرا ہوا سمجھ لیا گیا اور صدیوں کے عمل اور عرب سے فاصلوں کی دوری سے اسلام میں جو تبدیلیاں آئیں ان کو فراموش کردیا گیا۔

مثلاً" ساتویں صدی میں عرب میں اسلام کا بنیادی تصور سماجی مساوات تھا' جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ مطلق العنان بادشاہوں کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ساتھ ہی حکمران طبقے تشکیل پائے' ہندوستان میں تیرھویں صدی کے بعد سے مسلمان

بادشاہوں اور حکمران طبقوں کی حکومت رہی۔ مطلق العنان بادشاہت اور حکمران طبقوں کی موجودگی میں سماجی مساوات کا تصور ختم ہوگیا۔ پھر اسلام کی تعبیر و تفسیر مختلف طبقوں کے لیے مختلف رہی۔ یہ با آسانی دیکھا جاسکتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی سے محمد تغلق' اکبر سے اورنگ زیب' اور علماء سے صوفیا تک اسلام کا تصور بدلتا رہا۔

اس لیے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو جس انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ تاریخ کا صرف ایک حصہ ہے اور اس میں جس عنصر کو فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے حقیقت میں وہ بالکل غیر اہم ہے۔

تاریخ میں ہمیں جس چیز کا مطالعہ کرنا چاہئے وہ معاشرہ کا ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں ارتقاء و ترقی ہے' معاشرہ کے پیداواری نظام کی تبدیلی اور اس کے نتیجہ میں سماجی نظام کی تشکیل کا مطالعہ ضروری ہے اور یہی مطالعہ قدیم معاشرہ کا مکمل مطالعہ ہوگا اور اس کے بعد حکمران خاندان کا ذاتی مذہب غیر اہم ہو کر رہ جائے گا۔

حقیقت میں سیاسی تاریخ بھی جو ہم پڑھاتے ہیں وہ حکمران خاندانوں کی تاریخ ہے۔ اس میں مختلف مذہبی' نسلی اور مقامی جماعتوں کے بارے میں بہت کم تجزیہ کیا گیا ہے جو کہ حکمران طبقوں پر مشتمل ہوتی تھیں اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان حالات کا تجزیہ کرنا ہوگا کہ جن کے نتیجہ میں مختلف وقتوں میں حکمرانوں پر دباؤ پڑتا تھا کہ وہ اپنی پالیسی کو تبدیل کریں۔

عہد وسطیٰ کی تاریخ لکھتے وقت جو سہولت ہے وہ یہ کہ ہم عصر مورخوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی وجہ سے اس عہد کے بارے میں کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر معلومات دربار اور حکمران سے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً" ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی' ابوالفضل کا اکبر نامہ وغیرہ لیکن ان ہم عصر تاریخوں کے مواد کو استعمال کرنے سے پہلے بہت کم ان کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

ہم عصر مورخین' جن کی معلومات پر ہمارا انحصار ہے ان کی اہم خصوصیات یہ تھیں کہ وہ سب یا تو درباری تھے یا دربار میں جانے کے خواہش مند اس وجہ سے وہ دربار کی کسی نہ کسی جماعت سے وابستہ تھے اور ان کی توجہ کا مرکز دربار تھا' اس لیے ان کی کتابوں میں تمام واقعات کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق دربار سے تھا ان کے ہاں استعمال ہونے والی اصطلاحات تک دربار سے متعلق تھیں۔ مثال کے طور پر ان میں سب سے زیادہ حساس

اصطلاح ہندو کی ہے۔ مورخ جو کہ درباری تھے اور ان کا تعلق امراء کے طبقہ سے بھی تھا' اس لیے یہ ان کے مفاد میں تھا کہ نظام سلطنت اور حکومتی ڈھانچہ کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے' کیونکہ یہ نہ صرف امراء کے لیے سود مند تھا بلکہ اس نظام میں ان کے اور حکمرانوں کے تعلقات مستحکم رہتے تھے۔ ضیاء الدین برنی جو کہ چودھویں صدی کا اہم مورخ تھا اور ساتھ ہی میں ایک بڑا نظریاتی عالم بھی تھا اس نے اپنی کتاب فتاویٰ جہانداری میں اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک طرف برنی کہتا ہے کہ صرف ان ہی اشخاص کو امراء کے زمرے میں لیا جائے جن کا تعلق اعلیٰ خاندان سے ہوتا کہ امراء کے طبقہ کو جو تشکیل ہے وہ اسی طرح باقی رہے۔ دوسری جانب وہ سلطان کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ ایک مشاورتی کونسل تشکیل دے جس کے اراکین وہ ہوں جن کی پیدائش اعلیٰ خاندان میں ہوئی ہو۔ اس کونسل کی کارروائی مرتب شدہ اصولوں کے تحت ہو اور اراکین کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ اپنی رائے بغیر کسی ڈر اور خوف کے دے سکیں۔ اس طرح یہ کونسل امراء اور سلطان کے تعلقات کو ایک ادارے کی شکل دے دے گی اور ان کی مرضی ہی سے کوئی تبدیلی ممکن ہو سکے گی۔

اس نظام کو جن سے سب سے زیادہ خطرہ تھا ان میں ہندو راجہ' راؤ' رانا رئیس اور زمیندار تھے جو کہ خود بھی حکمران طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ہم عصر مورخین' ہندوؤں کو تباہ و برباد کرنے پر زور دیتے ہیں تو ان کا مطلب ہندو معاشرے کے صرف ایک طبقہ سے ہوتا تھا تمام ہندو معاشرے سے نہیں جن میں کسان بھی شامل ہوتے تھے اور ان کے ٹیکسوں کی ادائیگی پر ان مورخوں کی گزر اوقات ہوتی تھی اور ان ہی کی کمائی پر ہندو راجہ اور مسلمان جاگیر دار عیاشی کی زندگی گزارتے تھے اس لیے ہم عصر مورخوں کی ہندو اصطلاح کا اطلاق صرف اس طبقہ پر ہوتا تھا جو سیاسی اور معاشی لحاظ سے اہم تھے' اس لحاظ سے یہ اصطلاح مذہبی نہیں بلکہ خالصتاً" سیاسی ہے۔

ہم عصر مورخوں کی اصطلاحات کا تعلق حکمران طبقوں سے تھا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے ان اصطلاحات کے ذریعہ ان طبقوں کے درمیان کش مکش' تصادم' یک جہتی اور اشتراک کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ ان ہم عصر مورخوں کی کتابوں میں ان کی ذاتی رائے کو بھی بڑا دخل ہے وہ یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ کیا وقوع پذیر ہوا بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ کیا ہونا چاہیے تھا؟

ہمارے جدید مورخ' وہ بھی جو شعوری طور پر سیکولر نظریات کو ماننے والے ہیں' ہم عصر مورخوں کی ان اصطلاحوں کو پورے معاشرے کے لیے صحیح سمجھ لیتے ہیں' اس وجہ سے حکمران طبقوں کی کش مکش کو سطحی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً" علاؤالدین خلجی جس نے ہندو زمینداروں کی بغاوت ختم کرنے کے لیے سخت اقدامات کیے (یہی سخت اقدامات اس نے مسلمان جاگیرداروں کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے کیے' جن میں ایسے نیک لوگ بھی تھے کہ جن کا بغاوت سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا) اس بنیاد پر اسے مذہبی جنونی کہا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا حالانکہ اس کا ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی مسلسل اس بات پر آنسو بہاتا رہا کہ علاؤ الدین خلجی ایسا بادشاہ ہے کہ جو ریاست کے معاملہ میں اور ذاتی زندگی میں اسلامی قوانین کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا' اسی طرح شاہ جہاں اور عالمگیر کی چند سیاسی خاندانوں کو مسلمان کرنے کی کوشش کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ عوامی سطح پر ہندوستان کے تمام ہندوؤں کو مسلمان کرنا چاہتے تھے۔

جدید مورخ' ان ہم عصر مورخوں میں اور مذہبی متعصب مورخوں کے درمیان کوئی شناخت نہیں کرسکے' اور ان کے ہر لفظ کو جو انہوں نے لکھ دیا' اس پر یقین کرلیا' حالانکہ اس قسم کا اعتماد صحیح تاریخی مطالعہ کے اصول کے خلاف ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنا' ہندو متعصب اور فرقہ پرست ہوگا اتنا ہی وہ ہم عصر اور رجعت پرست مسلمان مورخ پر بھروسہ کرے گا۔

1920ء میں 30 اور 40 کی دھائیوں میں قوم پرست مورخوں نے اس بات کی سنجیدگی سے کوشش کی کہ وہ فرقہ پرستوں کے چیلنج کا مقابلہ کریں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ جنگ انہوں نے مخالفین کے میدان میں لڑی یعنی فرقہ پرستوں کی طرح وہ بھی دربار کی زندگی سے آگے نہیں بڑھے اور معاشرہ کا مجموعی طور پر مطالعہ نہیں کیا فرقہ پرست مورخوں نے یا تو مخالفانہ واقعات کو نظرانداز کردیا یا انہیں جان بوجھ کر فراموش کردیا' قوم پرستوں نے بھی یہی کیا۔ اگرچہ ان کے مقاصد ان کے مقابلے میں اچھے تھے اس لیے بنیادی طور پر فرقہ پرست اور قوم پرست مورخوں کا نقطہ نظر ایک جیسا رہا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مرحلہ پر جاکر قوم پرستوں نے فرقہ پرستوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

اب تک عہد وسطی کی تاریخ کو انفرادی حکمرانوں اور ان کی خواہشات کے تحت تاریخی تبدیلیوں تک محدود رکھا جاتا تھا مثلاً" علاؤ الدین خلجی کی فتوحات کو اس کی توسیع پسند

خواہشات کی وجہ سمجھا جاتا تھا۔ یا محمد تغلق کے احمقانہ منصوبوں کو اس کی متضاد فطرت کی وجہ مانا جاتا تھا' یا اکبر نے اس لیے آزادی کی پالیسی اختیار کی کیونکہ اس کی فطرت میں رواداری تھی وغیرہ۔ یہ وہ بنیادیں تھیں جن پر فرقہ پرست اور قوم پرست مورخ تاریخ کی تعبیر کرتے تھے۔ اگر ایک مرتبہ اس اصول کو تسلیم کرلیا گیا کہ اکبر کی آزاد مذہبی پالیسی اس کی فطری رواداری کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تو یہ بھی ممکن ہوجاتا ہے کہ اورنگ زیب کی متعصبانہ پالیسی اس کی تنگ نظر مذہبی عادات کی وجہ سے تشکیل پائی۔

اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ روشن خیالی اور رجعت پرستی کا جب حکمران کی پالیسی میں دخل ہوتا ہے تو یہ محض اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کے پس منظر میں آزاد خیال یا تنگ نظر حکمراں تھا' بلکہ اس کی تشکیل میں سیاسی صورت حال' مختلف جماعتوں کے مفادات اور مختلف فرقوں کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک فرقہ پرست مورخ جب اکبر کی آزاد خیالی کی دل کھول کر تعریف کرتا ہے تو اس کے بعد وہ آزاد ہوجاتا ہے کہ دوسرے حکمرانوں کو ان کے عقیدہ پرستی کی بنا پر برا کہے اکبر کی بحیثیت سیکولر اور قومی ہیرو ہی تعریف کرنا غیر تاریخی ہے کیونکہ عہد وسطی کی ہندوستانی ریاست (یا عہد وسطی کی کوئی بھی ریاست) سیکولر ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ یہ تصور ایک جدید تصور ہے اتنا جدید کہ ہم میں سے بہت سے اب تک اس سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوسکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نقطہ نظر خود اپنی شکست کے جواز فراہم کرتا ہے یعنی اکبر کے دور حکومت کو نکال کر ساڑھے چھ سو سال کا دور سیکولر نہیں ہوا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ اکبر کا دور محض ایک اتفاق تھا اور اس عہد کی روح سے انحراف تھا۔

تاریخ کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر حقیقت میں اور منطقی طور پر اس وقت سیکولر ہوسکتا ہے جب ہم تاریخ کے بارے میں مجموعی طور پر اپنے خیالات کو بدلیں۔ اور صرف ایک حکمران کے عہد یا حکمرانوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے پورے معاشرے کا مطالعہ کریں۔ مکمل معاشرے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی تشکیل اور کردار کو دیکھیں کہ جس کی وجہ سے مختلف مذہبی فرقوں میں ہم آہنگی یا اختلافات ہوئے' اور پھر اس کو بھی دیکھیں کہ یہ ہم آہنگی یا اختلافات ایک خاص وقت پر کیوں ہوئے؟ اگر ہم پورے معاشرے کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی کہ ایک واقعہ کو چھپائیں اور دوسرے واقعات کو اجاگر کریں۔ جیسا کہ قوم پرست اور فرقہ پرست مورخ کررہے ہیں۔

2

ساتویں صدی میں عرب میں اسلام کے عروج نے اس وقت کی عالمی حالات پر ترقی پسند اثرات ڈالے جبکہ پیغمبر محمدؐ نے توحید کی تبلیغ کی کہ سوائے خدا کے اور کوئی دوسرا خدا نہیں تو وہ ایک مکمل سماجی تبدیلی کا پیغام دے رہے تھے کیونکہ ایک خدا کا مطلب سماجی مساوات تھا اگر ایک خدا ہے اور اس نے ہی ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے تو اس کے ماننے والے سب برابر ہیں اس بنیاد پر اسلامی اخوت (ملت) کا تصور ابھرا۔ اسلام نہ تو علیحدہ سے کسی حکمران طبقہ کے اقتدار کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی کسی جماعت کی اجارہ داری کی۔

ساتویں اور آٹھی صدی کے بعد اسلام کے پھیلنے اور عظیم الشان سلطنتوں کے قائم ہونے کے بعد، خاص طور پر ایران کی فتح کے بعد جہاں اعلیٰ تمدن موجود تھا، اور جہاں انتظامی ادارے مستحکم روایات پر کام کررہے تھے۔ اسلام میں ایک علیحدہ حکمران طبقہ، مطلق العنان بادشاہی کی سربراہی میں ظاہر ہوا اور سماجی مساوات کا تصور سکڑتے سکڑتے پس منظر میں چلا گیا کیونکہ اب ضرورت کے تحت سماجی مساوات کو اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی جگہ ایک متضاد تصور کو جگہ دینی پڑی، یہ حکمران طبقے تھے جن کے اوپر ایک مطلق العنان بادشاہ تھا جو ان کی حفاظت کرتا تھا اس نظام کے ساتھ ہی اسلامی معاشرے سے مساوات کے تصور اور عمل کا خاتمہ ہوگیا۔

گیارھویں سے تیرھویں صدیوں اور اس کے بعد کے دور میں وہ فاتحین وجود میں آئے جو بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیادیں ڈال رہے تھے وہ ایک دوسرے کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے علاوہ کافروں کے ملکوں پر بھی قابض ہورہے تھے۔ ہندوستان میں یہی فاتحین ترک جنگ جو اور حکمران طبقے کی حیثیت سے آئے ان کا مقصد یہاں قطعی اسلام کی تبلیغ نہیں تھا بلکہ یہاں کے علاقوں پر قبضہ کرنا تھا اس لئے یہ مذہبی مبلغ نہیں، جنگ جو تھے کہ جن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کیسے وجود میں آئی؟ کیا یہ ہندوؤں کے قتل عام کے نتیجہ میں قائم ہوئی؟ یا اس نے ہندوؤں کو مسلمان کیا، اور اس کی کیا خاص وجہ تھی کہ یہاں ترکوں کے حملوں کی کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی؟

ترکوں نے یہاں بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں حکومت قائم کی وہ ہندوستان میں اندازاً" بارہ ہزار فوجیوں کے ساتھ آئے تھے اور اپنی اعلیٰ فوجی تنظیم، جنگی حربوں اور چالوں

کی وجہ سے انہوں نے ہندو حکمرانوں کو شکستیں دیں' جہاں تک فوجی اور معاشی ذرائع کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے حکمراں ترکوں سے زیادہ ان کے مالک تھے۔ لیکن میدان جنگ میں فتح دراصل ایک سلطنت کے قیام کے برابر نہیں ہوتی ہے' ترکوں' نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ دشمن کی مجموعی قوت کو میدان جنگ میں شکست دینا زیادہ آسان تھا' اگر وہ اس بات کی کوشش کرتے کہ مفتوح علاقوں کے انتظامی عہدے داروں کو مرکز سے لے کر گاؤں کی سطح تک تبدیل کردیا جائے تو اس صورت میں ان کے خلاف مزاحمت پیدا ہوئی اور اتنی بڑھ سکتی تھی کہ اس پر قابو پانا ان کے لیے مشکل ہوجاتا۔ اس لیے انہوں نے حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد نچلی سطح پر ہندو حکمران طبقوں سے سمجھوتہ کرلیا جن میں راجہ' رانا' زمیندار اور چودھری شامل تھے۔ یہاں سمجھوتہ کی اصطلاح سے مراد ہے کہ زمینداروں کو ان کی زمینوں سے محروم نہیں کیا گیا' ان پر یہ شرط لگائی گئی کہ وہ سلطان کو مقررہ سالانہ خراج ادا کرتے ہیں اور سلطان کے اقتدار کو مانتے رہیں اس وقت تک ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کی گئی اور نہ ہی انہیں ان کی زمینوں سے محروم کیا گیا' اور نہ ہی ان کی زمینوں کے انتظام میں دخل اندازی کی گئی۔

اس طرح نچلی سطح کا انتظام مکمل طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا اور ان ہندوؤں کی مدد سے ترکوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کی اور ان سے انتظام سلطنت میں مدد لی۔ ان کی مدد کے بغیر ترک اس حیثیت میں نہیں تھے کہ وہ ہندوستان میں زیادہ عرصہ ٹھہر سکتے۔ اس طرح یہ ہندو بھی حکمران طبقے کا ایک حصہ بن گئے اور دونوں نے مل کر کسانوں کی محنت کی کمائی کو لوٹا۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ برنی اور دوسرے مورخ ہندو کی اصطلاح ہندو معاشرے کے صرف ایک حصہ کے لیے استعمال کرتے تھے جو کہ حکمران طبقہ کا ایک اہم جز بن گیا تھا۔

اکثر حکمران طبقوں کی کش مکش کو جو سیاسی یا معاشی وجوہات کی بنا پر ہوتی تھیں اسے مذہبی یا نظریاتی رنگ دے دیا جاتا ہے مثال کے طور پر ہم یہاں علی شاہ ناتھو کی بغاوت کا تذکرہ کریں گے جو محمد تغلق کے دور حکومت میں ہوئی۔ ناتھو جس کا تعلق خلجی قبیلہ سے تھا۔ اس کے پاس کچھ زمین تھی جس کا لگان وہ جمع کراتا رہتا تھا کچھ عرصہ بعد ایک ہندو بھرن نے حکومت کے عہدے داروں کی توجہ اس غبن کی جانب کرائی جس کی وجہ سے ناتھو نے دولت اکٹھی کرلی تھی۔ اس پر یہ اس سے چھین کر بھرن کو دے دی گئی۔ ناتھو اور اس

کے بھائیوں نے اس پر سلطان سے سخت احتجاج کیا کہ اس نے ایک کافر کو ان پر بحیثیت منتظم کے مسلط کردیا' جب سلطان نے ان کی بات کو نہیں سنا تو انہوں نے بغاوت کردی۔

اس قسم کی کوئی شہادت نہیں کہ جس کی بنیاد پر کہا جائے کہ مسلمان حکومت نے ایسا کوئی منصوبہ بنایا ہو کہ جس کے تحت تمام ہندو آبادی کو مجبور کرکے مسلمان بنا لیا جائے' یا کہ حکمرانوں میں تبلیغ کا جذبہ اور جوش ہو اس قسم کے واقعات ضرور ہیں کہ جن میں ریاست نے اہم سیاسی خاندانوں یا افراد کو مسلمان کیا ہو' لیکن عوامی سطح پر مسلمان بنانے کی کوشش نہیں ہوئی۔ اس پر یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ ان اہم سیاسی خاندانوں اور افراد کو مسلمان بنا کر حکمران کو یہ توقع ہوتی ہو کہ ان کے پیرو کار بھی ان کے ساتھ مسلمان ہوجائیں گے' اس سوال کے جواب میں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اکثر انہیں افراد کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا جنہوں نے یا تو بغاوت کی یا ریاست کے ساتھ وفادار نہیں رہے ان کی اہم حیثیت کی وجہ سے ریاست انہیں معاف کرنا چاہتی تھی اور ریاست سے وفاداری کے بدلے میں وہ ان سے کچھ چاہتے تھے۔ چونکہ عہد وسطیٰ میں مذہب زندگی کی سب سے اعلیٰ و ارفع چیز سمجھی جاتی تھی۔ اس کے لیے اپنے مذہب کو چھوڑنا اور بادشاہ کا مذہب اختیار کرنا سب سے بڑی قربانی سمجھی جاتی تھی اور اس تبدیلی کو ریاست کی وفاداری کی اہم علامت سمجھا جاتا تھا ورنہ کیا وجہ تھی کہ دوسری ہندو رعایا جن میں راجہ' رانا اور راجپوت امراء تھے اور بادشاہ و سلطنت کے وفادار تھے ان سے کبھی اسلام قبول کرنے کو نہیں کہا گیا؟

ہم اس پر بھی روشنی ڈالیں گے کہ جزیہ کی ادائیگی چونکہ ہندوؤں کے لئے لازمی تھی' اس لیے اس مجبوری کی وجہ سے بھی لوگ مسلمان ہوئے لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد انہیں زکوۃ دینی پڑتی تھی جو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جزیہ کے بارے میں ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ بہت الجھی ہوئی ہیں۔ چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ نے لکھا کہ جنوبی ہندوستان میں ایک ہندو حکمران (زمورن) اپنی یہودی رعیت سے جزیہ لیتا ہے۔ ہندوستان سے باہر کے بارے میں ہمارے پاس ایسی شہادتیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مسلمان رعیت سے جزیہ لیا۔ جزیہ عورتوں' بچوں' معذوروں' برہمنوں' (سوائے فیروز تغلق کے عہد کے) اور فوجیوں سے نہیں لیا جاتا تھا لیکن اگر یہ فرض کرلیا بھی جائے کہ جزیہ ایک خالص مذہبی ٹیکس تھا تو کیا ہندو اپنے مذہب کو اتنا

ستا سمجھتے تھے کہ ایک معمولی رقم کے عوض اپنا مذہب چھوڑ دیتے تھے؟ اور اگر اس کو تسلیم کرلیا جائے کہ ہندوستان اس رقم کو بچانے کے لیے مسلمان ہوجاتے تھے تو اس سے یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ ریاست کا مقصد جزیہ کے ذریعہ پیسے جمع کرنا تھا اور تبلیغ نہیں تھا۔

اس کے بعد مندروں کی تباہی کا مسئلہ ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ آج کے رجعت پسند ہندو مورخ اسی کا جذبہ اور جوش سے مسلمان بادشاہوں کے ہاتھوں مندروں کی تباہی کا ذکر کررہے ہیں کہ جس کا ذکر ہم عصر رجعت پرست مورخوں نے اپنی تاریخوں میں کیا تھا ظاہر ہے کہ مندروں کو گرانے کا قطعی یہ مقصد نہیں تھا کہ اس کے ذریعہ سے ہندوؤں کو مسلمان کیا جائے کیونکہ لوگوں کے دل جیتنے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ ان کی مذہبی عمارتوں کو مسمار کیا جائے۔ تباہی نفرت کا باعث ہوتی ہے اور اس عمل سے یقیناً" ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے کوئی محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا ہوگا اس لیے مندروں کی تباہی کا مقصد قطعی مذہب کی تبدیلی نہیں ہوگا بلکہ اس کے دوسرے مقاصد ہوں گے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ مندر صرف دشمنوں کے علاقوں میں تباہ کئے گئے اور سلطان کے اپنے علاقوں میں یہ محفوظ رہے اور دشمن کے علاقوں میں بھی ان مندروں کو اس وقت گرایا گیا جبکہ یہ سازش اور بغاوت کے گڑھ بن گئے۔ یہ صورت حال اورنگ زیب کے زمانے میں ہوگئی تھی اس کے علاوہ دشمن کے علاقوں میں مندروں کا گرانا فتح کی علامت بن گیا تھا۔ حقیقت میں بہت سے ہندو حکمرانوں نے بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے دشمن کے علاقوں میں مندروں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ سبھاتا ورمن پرمر (1210 - 1193ء) نے گجرات پر حملہ کرکے دھبوتی اور کمبے کے مقامات پر بہت سے جین مندروں کو لوٹا تھا ہرش جو کشمیر کا حکمران تھا جس کا ذکر کہ پہلے بھی آچکا ہے اس نے سوائے چار مندروں کے اپنی سلطنت کے بقایا سب مندروں کو لوٹا تھا تاکہ ان کی دولت سے اپنے خزانہ کو بھرسکے اس کے اس رویہ کے خلاف ایک لفظ بھی احتجاج کا نہیں کیا گیا۔ لیکن جب اسے اور پیسوں کی ضرورت ہوئی اور اس نے اپنے ماتحت جاگیرداروں کے خراج میں اضافہ کردیا تو اس کے خلاف بغاوت ہوگئی اور اسے سری نگر کی گلیوں میں گھسیٹا گیا یہاں تک کہ وہ مرگیا۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تبدیلی مذہب کے واقعات ہوئے اور لوگوں نے کافی تعداد میں اسلام قبول کیا مگر اس کی وجہ سے صوفیا کی تبلیغ اور ان کی گفتگو تھی جو وہ لوگوں کی اپنی زبان میں کرتے تھے لیکن ریاست نے عام لوگوں میں تبلیغ کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا

اگر ریاست ایسا کرتی تو ہم عصر مورخ جو کہ رجعت پرست تھے وہ اس کا ذکر بڑے مبالغہ کے ساتھ کرتے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اشوک جس نے بدھ مت کو پھیلانے میں حکومت کے اداروں کو استعمال کیا اسے تو ہم ایک عظیم حکمران مانتے ہیں مگر جبکہ عہد وسطی میں ریاست کو اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا گیا پھر بھی اسے مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور لوگوں کے ذہن میں اس خیال کو پیدا کیا جاتا ہے کہ اس کا مقصد لوگوں کو مسلمان بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا دراصل اس کے پس منظر میں ہمارا آج کا فرقہ وارانہ ذہن ہے جو موجودہ ماحول میں کسی تبدیلی مذہب کو پسند نہیں کرتا اور اس کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار رہتا ہے۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ عہد وسطی کی ریاست مکمل طور پر سیکولر تھی یہ سیکولر ہو نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ یہ تصور بالکل جدید ہے اور تاریخی طور پر اس کا اطلاق عہد وسطی یا اس سے پہلے کی ریاستوں پر نہیں ہوسکتا ہے اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ریاست تبلیغ مذہب میں مصروف تھی تو اس کی وجہ آسانی سے اشوک کی پالیسی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

عہد وسطی کی ہندوستانی ریاست کو ہم ان معنوں میں سیکولر کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مذہب کو سیاست کے ماتحت کردیا تھا سلطان علماء کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھ لیتا تھا۔ اور ان کے ذمہ کوئی خاص کام نہیں ہوا کرتے تھے۔ سلطان اس طرح سے علماء کے اثر و رسوخ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور ان علماء کی اکثریت سوائے چند کے اس کی خواہش مند رہتی تھی کہ سلطان کے ہر فرمان کی تعمیل کریں۔ اور اس کی خواہش کے مطابق اسلامی قوانین کی تعبیر کریں اسی وجہ سے صوفیا نے علماء پر کڑی تنقید کی کہ انہوں نے چند سکوں کی خاطر خود کو بیچ دیا اس تنقید میں وہ حق بجانب تھے اگرچہ واقعات تو بہت ہیں مگر مثال کے طور پر یہاں ایک واقعہ دیا جاتا ہے۔

بدایونی' جو اکبر کا درباری مورخ تھا اس نے بیان کیا ہے کہ اکبر کی نو بیویاں تھیں جب کہ اسلام میں صرف چار کی اجازت ہے اکبر نے اس مسئلہ کو علماء کے سامنے پیش کیا ان میں سے ایک جو اکبر کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہت زیادہ مشتاق تھا کہا کہ مذہب میں اس بات کی اجازت ہے کہ مسلمان 2-2' 3-3' 4-4 بیویاں رکھ سکتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ 18 بیویوں تک کی اجازت ہے دوسرے نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس نے زیادہ ہی

فیاضی دکھائی ہے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ - 2، 3، 4، یعنی نو بیویوں تک کی اجازت ہے۔

3

بہر حال تبدیلی مذہب کسی وجہ سے ہوا ہو، چاہے رضا کارانہ ہو یا جبری، حقیقت میں نچلے درجہ کے جو لوگ مسلمان ہوئے انھیں طبقہ اعلیٰ کے مسلمانوں نے ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ برنی نے ایک نقلی فرمان کی روشنی میں جو اس نے خلیفہ مامون کے نام پر اپنے ذہن میں گھڑا تھا (اس فرمان کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوتا ہے چونکہ اسے مامون سے منسوب کیا گیا تھا) لکھا ہے کہ:

"ریچھوں کے گلوں میں گلو بند نہ پہنائیں یعنی کمینوں، رذیلوں، اور نکموں کو، دوکانداروں اور کم اصلوں کو نماز، روزہ، اور حج کے ارکان اور قرآن کے کچھ پاروں اور کچھ دینی عقائد سے زیادہ تعلیم نہ دیں"۔

ہندوستان میں حکمران طبقے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان اقطاع داروں (منصبداروں) اور زمینداروں پر مبنی تھا۔ اقطاع دار تقریباً" تمام ترک تھے اور کوئی غیر ترک چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اسے سیاسی عہدوں کے لئے اہل قرار نہیں دیا جاتا تھا بعد میں جا کر ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام اعلیٰ عہدوں میں نظر آتے ہیں۔ مغلوں کے زمانہ میں راجپوتوں اور دوسرے ہندوؤں کے نام اعلیٰ منصب داروں میں ملتے ہیں۔

تاریخ میں ہمیں مختلف جماعتوں اور افراد کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی جنگوں کی تفصیلات ملتی ہیں یہ جنگیں کئی بنیادوں پر ہوتی تھیں: مقامی جھگڑے اور مذہبی و نسلی تعصبات وغیرہ مسلمان امراء نے سلطان کے خلاف بغاوتیں کیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے لڑے یہی حال ہندوؤں کا تھا وہ بھی مالیہ کی ادائیگی اور سیاسی طاقت کے لیے ایک دوسرے سے لڑے اس لحاظ سے ان دونوں طبقوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں: ان دونوں کی دولت و خوشحالی کا انحصار کسانوں کی محنت پر تھا یہ اس کی کمائی لوٹ کھسوٹ کرلیتے تھے یہ دونوں اپنی ضروریات سے زیادہ اپنی شان و شوکت پر خرچ کرتے تھے قرضہ کا

زیادہ ہونا ان کے لیے عزت کی بات تھی جس پر جتنا زیادہ قرضہ ہوتا تھا اتنا ہی اس کے احترام میں اضافہ ہوتا تھا ان کا طرز رہائش بادشاہ کے نمونہ پر ہوا کرتا تھا فن اور آرٹ کی سرپرستی محض اس وجہ سے کرتے تھے کہ یہ دستور بن گیا تھا اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے یہ شاعروں و موسیقاروں کی ایک بڑی تعداد کو ملازم رکھتے تھے دونوں ہندو اور مسلمان عوام کے لیے حقارت کا جذبہ رکھتے تھے۔

ابتداء میں ہم نے ایک سوال اٹھایا تو آخر یہاں ترکوں یا مغلوں کے خلاف کوئی مقبول تحریک کیوں نہیں اٹھی؟

صرف سترھویں صدی میں کچھ مقبول تحریکوں کا ذکر ملتا ہے کہ جب کسانوں نے مہارا شٹر پنجاب اور آگرہ اور متھرا میں معاشی دباؤ کے تحت بغاوتیں کیں۔ تحریک نہ چلنے کی دو اہم وجوہات ہو سکتی ہیں۔

1- ہندوستان کا سماجی اور سیاسی نظام لوگوں کو اس پر ابھارنے میں ناکام رہا کہ وہ اپنے راجپوت حکمرانوں کا دفاع کریں کیونکہ آج بھی راجستھان میں راجپوت آبادی کا صرف 8 فیصد حصہ ہیں۔ عوام ترکوں سے اچھی طرح سے واقف تھے کیونکہ ان کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا جہاں سے کہ راجپوت آئے تھے اور ان کا تہذیبی معیار بھی یکساں تھا اس لیے ان کے لیے ترک راجپوتوں سے زیادہ خطرناک نہ تھے۔

2- اقتدار میں آنے کے بعد ترکوں نے سماجی و سیاسی نظام کو نہیں چھیڑا اور اسے اسی طرح رہنے دیا اگر کوئی تبدیلی کی بھی تو بہت معمولی۔

اس لیے دراصل جھگڑا صرف حکمران طبقوں میں محدود رہا اور اگر بغاوتیں ہوئیں بھی تو ہندو زمینداروں یا مسلمان جاگیرداروں نے اپنے مفادات کے تحت کیں یا سیاسی تصادم دو حکمرانوں کے درمیان ہوا جیسے کہ رانا پرتاب اور اکبر۔ یہ حقیقت ہے کہ رانا پرتاب نہ تو راجپوتانہ کے لیے لڑ رہا تھا اور نہ ہندوستان کے لیے بلکہ اس کی جدوجہد اپنی حکومت کے قیام کے لیے تھی۔

سترھویں صدی میں جب کہ مرہٹوں' سکھوں اور جاٹوں کی تحریکیں مغلوں کے خلاف اٹھیں اور زبردست تصادم ہوا تو اورنگ زیب کے خراب ترین زمانہ میں بھی یہ تصادم فرقہ وارانہ شکل میں نہیں ابھرا فرقہ وارانہ فسادات جیسا کہ ہمارے اپنے زمانہ میں ہو رہے ہیں اور جنہوں نے غیر انسانی جذبات اور رجعت پرستانہ خیالات کو ابھارا ہے یہ سب اس وقت

ہورہا ہے جب کہ ہماری ریاست سرکاری طور پر سیکولر ہے۔ دراصل' مرہٹوں' سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتیں مذہبی نہیں سیاسی تھیں اسی لئے یہ تصادم سیاست تک محدود رہا اور اس سے آگے نہیں بڑھا۔

آخر میں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ راجپوت جو ترکوں سے پہلے ہندوستان میں ہجرت کرکے آئے تھے آج اپنی انفرادیت کو باقی رکھے ہوئے ہیں' چوہان' پری ہار' اور سولانکی وغیرہ وہ نام ہیں جن سے ہم آج بھی بخوبی واقف ہیں لیکن جن ترک خاندانوں نے حکومت کی ان کے جانشین آج کہاں ہیں؟ خاندان غلاماں' خلجی' تغلق' لودھی اور آخر میں مغل جو سو سال پہلے تک غدر کا مرکز تھے ظاہر ہے کہ یہ سب ہندوستان کی زندگی کے دھارے میں مدغم ہوگئے اور اپنی انفرادیت کو ختم کرتے ہوئے انہوں نے ہماری زندگی کو اتنا مالا مال کردیا کہ جو دوسرے نہیں کرسکے۔

○

جدید ہندوستانی مورخ
اور فرقہ واریت

بپن چندر

ابتدا ہی میں' میں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مضمون میں اس بات پر بحث نہیں کی گئی ہے کہ موجودہ ہندوستان میں فرقہ واریت کیوں پیدا ہوئی اور کیوں پھیلی؟ بلکہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ لکھنے اور پڑھانے کے درمیان جو فرق ہے اسے واضح کیا جائے اور اس روشنی میں ہندوستان میں فرقہ واریت جس طرح سے پروان چڑھی اس کو دیکھا جائے۔

مضمون میں اس سوال کی جانب بھی توجہ دی جائے گی: کہ آخر ہندوستانی مورخ کیوں فرقہ وارانہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں؟ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پچھلے سو سال میں فرقہ واریت کو پھیلانے میں تاریخ کا بڑا دخل رہا ہے اور یہ بات کتنا حقیقت پر مبنی ہے کہ تاریخ کا فرقہ وارانہ نقطہ نظر ہندوستان میں فرقہ واریت کی اہم بنیاد رہا ہے اور اب بھی اگر تاریخ سے اسے نکال دیا جائے تو فرقہ پرستی کے نظریہ کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔

I

مضمون کے شروع میں' میں اس بات کی جانب بھی اشارہ کردوں کہ قوم پرستی اور فرقہ واریت ایک ہی جیسے حالات میں پیدا ہوئے۔ جب ملک میں معاشی' سیاسی اور انتظامی اتحاد ہوا تو اس عمل نے تعلقات اور وفاداریوں کی بنیادوں کو پھیلا دیا اور لوگوں میں

وفاداری کی بنیاد اس اتحاد اور ہم آہنگی کے نتیجہ میں نئے اصولوں اور علامتوں پر ہونے لگی۔ قوم پرستی اور فرقہ پرستی دونوں جدید نظریہ ہیں اور اٹھارویں صدی کی پیداوار ہیں ان دونوں نظریات کی مدد سے قوم پرستوں اور فرقہ پرستوں نے اپنی تحریک کی جڑیں ماضی سے ملائیں اور ماضی کو شاندار بنا کر پیش کیا حالانکہ ان دونوں نظریات کا ماضی میں کوئی وجود نہ تھا ڈاکٹر رومیلا تھاپر اور شری ہربنس کھیا نے اپنے مضامین میں اس بات کی نشاندہی کردی ہے کہ فرقہ واریت قدیم یا عہد وسطیٰ کی ہندوستان کی تاریخ میں موجود نہیں تھی۔

قوم پرستی بھی ایک نیا اور جدید نظریہ ہے اور اس بات کو ابتدائی قوم پرست راہنماؤں نے جن میں سرندر ناتھ بنرجی اور لوکانیہ تلک شامل تھے، تسلیم کرلیا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم کی تشکیل ہورہی ہے قوم پرستی دراصل خود کو ایک نظریہ کی حیثیت سے اسی لیے جائز قرار دیتی ہے کیونکہ یہ معروضی حقیقت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کے مفاہمی مفاد اور ترقی کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے خاص طور سے اس کی مدد سے غیر ملکی امپریلزم کے خلاف کامیاب جنگ لڑی گئی۔

اس کے مقابلہ میں فرقہ وارانہ جذبات ان خاص علاقوں اور معاشرے کے ان طبقوں میں پیدا ہوئے جہاں جدید قوم پرستی اپنا شعور بیدار کرنے میں ناکام ہوگئی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ فرقہ واریت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ قوم پرستی کا نقطہ نظر اور نظریہ ان میں گہرائی کے ساتھ نہیں اتر سکا۔

ایک ایسی صورت حال میں جب کہ لوگوں میں وسیع اتحاد اور تعلقات لازمی ہوتے جارہے ہیں تو معاشی اور ثقافتی زندگی میں سب سے پہلے موجود علیحدگی پسندی کے رجحانات کو نئی ابھرتی ہوئی سیاسی زندگی میں فروغ ملتا ہے اور اس صورت میں اسے مزید تقویت ملتی ہے کہ جب قوم پرستی کے نئے اصول بھی ان کو متاثر کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تشخص کی تلاش ہو اور قومی تشخص موجود نہ ہو تو اس صورت میں کسی قدیم تشخص کو تلاش کیا جاتا ہے۔ صرف مذہبی تشخص ہی ایسا جذبہ نہیں کہ جسے قبول کیا جائے اس کے علاوہ ذات پات، زبان، قبیلہ اور علاقائیت بھی اس جذبہ کو پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً" مہاراشٹر میں جہاں کبھی ہندو فرقہ واریت بڑی مستحکم تھی، اور آج بھی ہے مگر حالات کے بدلنے کے ساتھ ہی یہاں برہمنوں کے خلاف تحریک چلائی گئی اسی قسم کی صورت حال مدارس میں ہوئی اور یہی کچھ جنوبی پنجاب (ہریانہ) میں ہوا۔ جاٹوں میں

جب ذات پات کے جذبات بیدار ہوئے تو اس نے ہندو فرقہ پرست اور قوم پرست دونوں کے اثر کو ختم کردیا۔

اس لیے غلطی ہوگی اگر فرقہ واریت کو ماضی کا یا روایتی نظریات کا احیاء سمجھ لیا جائے' فرقہ واریت دراصل سو سال کے تاریخی عمل کے غلط شعور کا نتیجہ ہے اور موجودہ فرقہ واریت کے زیر اثر جدید مورخین ماضی کی غلط نمائندگی کررہے ہیں۔

2

دونوں پہلوؤں میں یعنی موجودہ سیاست اور جدید ہندوستان کی تاریخ نویسی میں' فرقہ واریت اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ہندوستان میں مختلف مذہبی جماعتیں ہیں جن کے علیحدہ سے سماجی' معاشی اور سیاسی مفادات ہیں اور یہ اپنے مفادات کے تحت متحد ہو کر کام کرتے ہیں۔ عام طور پر ہندو مورخ مسلمانوں کی "فکر" اور "اظہار" کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہیں' اور کبھی کبھی وہ ہندو راہنما اور مسلمان راہنما کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دو قومی نظریہ (کچھ اس میں سکھوں کو بھی شامل کرلیتے ہیں) عہد وسطی اور جدید ہندوستان کی ریاست اور معاشرے میں فرقہ واریت کے نظریات کو پیدا کرتے ہیں۔

اس مفروضے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی علاقہ' شہر اور گاؤں کی سطح پر چونکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اجتماعی طور پر ساتھ نہیں رہے' اس لیے فرقہ پرست مورخ اس خیال کی نفی کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان مذہب اور فرقہ کی بنیادوں پر کسی قسم کا اشتراک برقرار رکھ سکتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانوی مورخوں اور منتظمین نے ہندوستان کی تاریخ میں جس ہندو اور مسلمان نقطہ نظر کی ابتداء کی وہ ذات پات اور نسل کی تھی (بنگالی نسل' پنجابی نسل' اور مرہٹی نسل) جیسے کہ یہ ہندوستانی سیاست اور معاشرہ کی تشکیل کے اہم عناصر ہوں انہوں نے اٹھارویں صدی میں مرہٹہ سلطنت میں برہمنوں کے اقتدار کے سلسلہ میں اسی انداز میں لکھا کہ جیسے دہلی پر سلاطین اور مغل بادشاہوں کے اقتدار کے بارے میں لکھا تھا' اور یہ لکھتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کی حکومت' مسلمانوں کا عمل' اور مسلمانوں کے

خیالات کی اصطلاحات استعمال کی تھیں' اسی بنیاد پر انہوں نے مرہٹہ سلطنت میں برہمنوں کی حکومت' برہمنوں کا عمل اور برہمنوں کے خیالات کی اصطلاحات استعمال کیں۔

ہندوستان کے جدید مورخوں نے اس آخری برطانوی نقطہ نظر کو تو رد کردیا مثلاً" جی ایس سرڈیسائی لکھتے ہیں کہ: "یہ کہا جاتا ہے کہ مادھے راؤ اور نارائن راؤ کے دور حکومت میں دھشرٹ اور کون کتھ (برہمن) ایک دوسرے کے خلاف تھے" دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کو مذہبی بنیادوں پر ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھا گیا اور اسے ایک نہیں سمجھا گیا' لیکن ہندو معاشرے کو ایک یونٹ کے طور پر دیکھا گیا' دراصل اس کا تاریخی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ڈیسائی اور اس جیسے مورخین کے ذہن کی پیداوار ہے۔

فرقہ پرست مورخوں نے سوائے مذہب کے معاشرے کی تشکیل کے دوسرے تمام عناصر کو فراموش کردیا لیکن اس میں بھی کبھی کبھی مذہب کی جگہ ذات پات لے لیتی ہے۔

حقیقت میں بہت سے مغربی مصنفین آج کل ذات پات اور زبان پر زور دے رہے ہیں مثلاً" وہ ہندوستان میں قومیت کی تحریک کو قوم پرستی سامراج دشمنی یا فرقہ وارانہ و مذہبی اتحاد کا نتیجہ نہیں مانتے اور اس پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ ذات پات اور زبان کے اتحاد کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ بہت سے ہندوستانی جو ذات پات اور زبان کے حامی ہیں یا فرقہ پرست جیسا کہ سکھ' وہ ان خیالات کی پرزور تائید کرتے ہیں۔

3

فرقہ وارانہ خیالات جدید ہندوستان کے شعور میں اس قدر سرایت نہیں کرتے اگر اس کے پس منظر میں چند اہم عوامل کام نہیں کررہے ہوتے لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان چند عوامل کے بارے میں بات کریں میں اس جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان عوامل کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ ہم ان کے اثرات کو پوری طرح نہیں سمجھ لیں میرے ایک طالب علم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ ہر مرتبہ وہ جب مجھ سے فرقہ واریت پر بحث کرکے جاتا ہے تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ اس کا ذہن فرقہ وارانہ جذبات سے دھل گیا ہے لیکن دوسری مرتبہ بحث کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن

میں اب تک اس کے اثرات باقی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے جو خود کو پکا قوم پرست سمجھتے ہیں اور وہ بھی جنھوں نے قومی یک جہتی کے فروغ میں عملی حصہ لیا ہے ان میں بھی فرقہ وارانہ جذبات کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں اس کی اہم وجہ تاریخ، ثقافت اور معاشرے کے دوسرے پہلوؤں میں فرقہ واریت کے جذبات ہیں جن کے زیر اثر ہم بچپن سے پرورش پاتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قومی نظریہ کا گہرائی تک اثر انداز نہ ہونا فرقہ واریت کی پیداوار کا باعث ہے ایک سائنٹفک قوم پرستی کے نظریہ کی غیر موجودگی میں قوم پرست فرقہ واریت کے خلاف موثر طور پر نہیں لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی لوگوں پر کوئی اثر ڈال سکتے ہیں اس صورت میں قوم پرستی موجودہ شعور کو تبدیل نہیں کرسکتی ہے جبکہ فرقہ واریت اس ماحول میں اس لیے اثر انداز ہوتی ہے کہ مذہب وہ اہم عنصر ہے جس سے ہر شخص روز مرہ کی زندگی میں متاثر ہوتا ہے اس نقطہ کو ابتدائی قوم پرست راہنماؤں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اس لیے انہوں نے نہ صرف قومیت کے ذریعہ لوگوں کو اثر انداز کیا بلکہ ان میں قومی شعور بھی پیدا کیا جبکہ 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں قوم پرست راہنماؤں نے جیسا کہ جواہر لال نہرو نے یہ فرض کرلیا تھا کہ قوم پرستی معاشرہ میں گہرائی کے ساتھ سرایت کرچکی ہے جیسا کہ مغربی ملکوں میں ہے اور ان کا کام محض یہ ہے کہ اسے ابھار کر غیر ملکی اقتدار سے جنگ میں استعمال کیا جائے اس لیے فرقہ واریت کے خلاف لڑنے کی شکل صرف یہ ہوئی کہ لوگوں سے کہا گیا کہ یہ قوم پرستی کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا جو قوم پرست نہیں تھے اس غلطی کو 1947ء کے بعد بھی مستقل طور پر قائم رکھا گیا۔ ہمارے تعلیمی ادارے، ذرائع ابلاغ عامہ جن میں اخبارات اور آل انڈیا ریڈیو اور سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ انہوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ وہ لوگوں میں جدید سائنٹفک قوم پرستی کا شعور پیدا کریں چونکہ وہ ایک قومی نقطہ نظر کو پھیلانے میں ناکام رہے اس لیے قوم پرستی کے نام پر فرقہ پرستی کے خلاف اپیل کا لوگوں کی اکثریت پر کم اثر ہوا بلکہ اس کے الٹ یہ ہوا کہ قوم پرستی کے نام پر فرقہ پرستی کے خلاف اپیل کرتے ہوئے انہوں نے فرقہ پرستی کو مزید طاقتور بنایا۔ کیونکہ ان کے اپنے قومیت کے بارے میں خیالات الجھے ہوئے تھے۔

4

بہت سے قومی راہنماؤں نے' جدید قومیت کی روح کو جو کہ نئی اور توانا تھی اور جو عوام میں سامراج کے خلاف استعمال ہوسکتی تھی اسے عوام میں بیدار کرنے کے بجائے اس کو آسان سمجھا کہ وہ پرانے شعور سے جو کہ مذہبی تھا اس سے مدد لیں یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اس جذبہ کو قابل تعریف مقصد کے لیے استعمال کیا لیکن ان کے اس عمل سے مقبول عام قومیت کی تحریک کمزور ہوگئی' ان کی فکر' اور ان کی تحریریں فرقہ واریت کی تابع ہوگئیں۔ ان میں لوکانیہ تلک کا یہی نقطہ نظر تھا اور کسی نہ کسی حد تک یہی کچھ آرو بندر گھوش اور گاندھی جی کا تھا۔ مثلاً" گاندھی جی کا رام راج پر زور تھا' اس نقطہ نظر نے کسی نہ کسی پہلو سے قومی یک جہتی کو نقصان پہنچایا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مسلمان کس طرح ایسی قومی تحریک میں پرجوش ہوسکتے ہیں کہ جس کی بنیاد مذہبی تصورات الہیات اور ہندو رسومات پر ہو! حقیقت میں نچلی ذاتیں کچلی ہوئی تھیں اور ان میں شعور کی کمی تھی۔ ورنہ وہ ان علامتوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتیں جو کہ اونچی ذات کے مفادات کی نمائندگی کررہی تھیں۔

اہل برطانیہ نے تاریخ کو اس لیے استعمال کیا تاکہ اس کے ذریعہ وہ ہندوستان کے قومی کردار کو مسخ کریں اور یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ ہندوستان، آزادی اور جمہوریت کے لائق نہیں انہوں نے ہندوستان کی تاریخ نویسی اور سیاست میں مزید بگاڑ پیدا کئے۔ اہل ہندوستان نے اس غیر سائنٹفک اور غیر تاریخی نقطہ نظر کا جواب بھی اسی طرح غیر تاریخی نقطہ نظر سے دیا اور جواب میں اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کیا میں نہیں چاہتا کہ اس جگہ اس نقطہ نظر کے جائز یا ناجائز ہونے پر کچھ کہوں بہر حال یہ بات ظاہر ہے کہ اس کی وجہ اور ضرورت قومی تشخص اور قومی فخر تھا لیکن قومی نقطہ نظر سے جو خرابی ہوئی وہ یہ کہ جس ماضی کی شان و شوکت کو بیان کیا گیا وہ قدیم ماضی تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مغل حکومت کی یادیں ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں کیونکہ اس کا زمانہ زیادہ پرانا نہیں ہوا تھا اور اس لیے اسے زیادہ پر شکوہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں قدیم ماضی بہت دور تھا اور اس کی معلومات صرف سرکاری اور نیم سرکاری ذرائع ہی سے مل سکتی تھیں۔ پھر جو بات مغل حکومت کے لیے کہی جاسکتی تھی وہی بات مرہٹہ

امپائر اور رنجیت سنگھ کے لیے بھی صحیح تھی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ فرقہ واریت کو پوری طرح سے پروان چڑھایا جائے تاکہ ان حکومتوں کو پرشوکت و پرشکوہ بنایا جائے اس طرح آہستہ آہستہ مختلف قصے' کہانیاں پیدا ہوئے اور ان میں سے ہر ایک نے صحت مند اور سیکولر قومیت کو کمزور کیا انہوں نے اگرچہ فرقہ واریت کو مضبوط تو نہیں کیا مگر اس کے لیے راہیں ضرور ہموار کیں اس طرح ہر خیالی قصہ مستحکم ہوتا چلا گیا اور اس میں اتنی وسعت آگئی کہ وہ آسانی سے نقصان پہنچا سکتا تھا پھر ان کی تبلیغ اور تشہیر کرنے والے اکثر پکے قوم پرست اور سیکولر ذہن کے لوگ تھے۔ ان میں سے ایک مفروضہ جو بعد میں ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر گیا وہ یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرہ اور کلچر' یعنی ہندو تہذیب اپنی بلندی پر پہنچ چکی تھی اور یہ کہ عہد قدیم ہندوستان کا سنہری دور تھا اس بلندی سے یہ آہستہ آہستہ گرتے ہوئے عہد وسطیٰ میں زوال پذیر ہوا یہ زوال کا دور غیر ملکی اقتدار کا دور تھا۔ یہ زوال جاری تھا کہ اس کو احیاء کی تحریکوں نے روک دیا اور ہندو تمدن میں ایک نئی زندگی ڈالی لیکن ماضی کی شان و شوکت کو واپس لانے اور ہندو تہذیب و تمدن کے احیاء کا کام ابھی باقی ہے۔ میں اس پر حیران ہوں کہ کتنے تعلیم یافتہ ہندو ہیں جو ان خیالات کو صحیح سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں اس زوال کا سبب اسلام کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تعلیم یافتہ مسلمان رد عمل کے طور پر عرب دور کے کارناموں میں سنہری دور تلاش کرتا ہے کیونکہ وہ کس طرح برداشت کرسکتے ہیں کہ ان کا مذہب ہندوستان کی تہذیب کے زوال کی ایک وجہ بن جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اگر فرقہ وارانہ نظریات کو جڑ سے اکھاڑا جائے تو ہمارا تعلیمی نظام سیاسی جماعتیں' اور ذرائع ابلاغ عامہ کو چاہئے کہ وہ اس غیر منطقی اور غیر تاریخی خیالات کی تشہیر چھوڑ دیں' اور ہندوستانی کلچر کے ارتقاء و ترقی کو جو مختلف مرحلوں' عہدوں اور راہوں سے ہوا ہے اس پر زور دیں میں اس بات کی ایک بار اور نشان دہی کروں کہ اس وقت جو صورت حال ہے یہ آگے چل کر فسادات کا موجب بنے گی مدراس میں ڈی۔ ایم۔ کے کی تحریک اس نقطہ نظر کو رد کرچکی ہے۔ جب کبھی بھی نچلی ذات کے لوگوں میں شعور آئے گا اور وہ آزادانہ اپنی بات کہہ سکیں گے تو وہ اس سنہری دور کے ماڈل کے خلاف بغاوت کریں گے کیونکہ یہ اونچی ذاتوں کے مفادات پر مبنی ہے۔ نچلی ذات کے لوگوں کے علاوہ قبائلی لوگ بھی اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ قدیم ماضی نے اپنے سنہری دور میں دنیا کی تہذیب میں سب

سے بڑھ کر کارنامے سرانجام دیئے لیکن یہ بات مادی تہذیب کے بارے میں نہیں۔ اس لیے جو خبطی اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں ایٹم بم' اور جہاز تھے وہ بھی اس پر خاموش ہوجاتے ہیں اس لیے یہ بات کہی گئی کہ ہندوستان کی فکری ذہانت روحانیت میں تھی اور اس لحاظ سے یہ مغربی مادیت اور مغربی تہذیب سے برتر و افضل ہے آروبند گھوش نے کہا کہ اگرچہ مغرب نے عقل اور سائنس میں کمال حاصل کرلیا ہے لیکن ہندوستان نے روحانیت کو معراج کمال تک پہنچایا ہے اور اسکی وجہ سے دوسری انسانی طاقتوں میں ترقی ہوئی۔ وجدان دھرم فلسفہ کی ہم آہنگی اور مذہبی روح نے ابدی اور آفاقی احساسات کو پیدا کیا۔ ہندوستان کا ذات پات کا نظام مغربی طبقاتی تقسیم سے بہتر ہے' کیونکہ اس کی بنیاد مادی ہے جب کہ ذات پات روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چین میں اعلیٰ عہدے داروں نے اس وقت اور اسی زمانہ میں اس قسم کے نعرے ایجاد کئے تھے وہ بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کنفیوشس کا چین تہذیب کی بلندیوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "بنیادی اصولوں کے لیے چینی تعلیمات کی ضرورت ہے جبکہ عملی کاموں کے لئے مغربی علوم کی" اس نقطہ نظر کو ہندوستان اور چین دونوں ملکوں میں مغربی مصنفین اور منتظمین نے آگے بڑھایا' کیونکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ان ملکوں کے لوگ انتظامی امور کے مادی کام اور معاشیات کا انتظام سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیں اور خود اپنے روحانی امور میں مدہوش ہوجائیں۔

تیسرا مفروضہ آریاؤں کا ہے جو ٹیوٹونوں اور اینگلو سیکسن مفروضہ کی نقل ہے' اور یہ سفید نسل کے نظریہ کے رد عمل میں پیدا ہوا۔ اس نظریہ کے تحت یہ کہا گیا کہ ہندوستان کے لوگ آریہ تھے اور ہندوستان کا خالص کلچر اور معاشرہ ویدوں کا عہد تھا۔

ان تینوں مفروضوں نے رجعت پرستانہ نقطہ نظر کو آگے بڑھایا اور ترقی کے عقیدے کو کمزور کیا۔ انہوں نے اس بات کی ہمت افزائی نہیں کی کہ لوگ جرات کے ساتھ اپنے معاشرے کی تاریخی کمزوریوں کو تسلیم کرلیں اور حال و مستقبل میں ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بجائے انہوں نے اس احساس کو پیدا کیا کہ وہ ماضی میں عظیم و بلند و بالا اور برتر تھے ان مفروضات نے اس خیال کو تقویت دی کہ ہندوستان کی تاریخ کا عمل سب سے علیحدہ تھا اور اس طرح وہ عالمی تاریخ کے عمل کا ایک حصہ نہیں ہے۔

یہ مفروضات اپنی فطرت کے لحاظ سے ہندوستان کی اکثریت کے لیے قابل قبول نہیں

تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تینوں مفروضے باوجود اس کے کہ انہیں خالص ہندوستانی کہا جاتا ہے' یہ مغرب سے لیے گئے۔ سنہری دور کا تصور اور ماضی کے ذریعہ لوگوں کو ابھارنے کا تصور یورپ کی قومی تحریکوں سے لئے گئے۔ ہندوستان کی روحانیت کا تصور سب سے پہلے اہل برطانیہ نے مشتہر کیا تھا تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ اہل ہندوستان انتظامی امور کے اہل نہیں۔ آریہ قوم کا مفروضہ کوئی راز کی بات نہیں۔ ان مفروضوں نے اٹلی' یونان' اور پولینڈ کو اتنا نقصان نہیں پہنچا کیونکہ ان کے معاشروں میں اتنے مختلف مذہب ثقافتی عناصر اور ذاتیں نہیں تھیں۔ ہمارے ہاں ان کے مثبت اثرات پیدا نہیں ہوئے اور اکثر قومی راہنماؤں کی دوسری نسل ہی نے ان کو مضمحل اور ختم ہوتے ہوئے دیکھا اور اس کی بھاری قیمت اب تک ادا کی جارہی ہے ہر وہ جائز کوشش کہ جس میں تاریخ کو فرقہ وارانہ استعمال سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے' وہ ان مفروضوں کے شکنجوں میں جکڑ جاتی ہے۔

5

اس مضمون میں' میں اس بات کی وضاحت کروں گا کہ ہندوستان کے لوگوں کے ایک طبقہ میں' اور خاص طور سے مورخوں میں فرقہ واریت کے جذبات اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ رجعت پرست قوم پرستی اس کا مقابلہ نہیں کرسکی اور فرقہ واریت نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ سامراج کی مخالفت کئے بغیر جو اس وقت ہندوستان پر حکومت کررہی تھی اور عوام کو کچل رہی تھی وہ قوم پرستی کے بھی پرستار رہ سکتے ہیں۔ میں اس کی ذرا وضاحت کروں گا۔

شمالی ہندوستان کے اکثر جدید مورخوں نے خود کو بہت کم واضح اور صاف طریقہ سے قوم پرستی سے وابستہ کیا۔ وہ اہم مسائل کہ جن سے ہندوستانی عوام کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ نہ تو ان کی پسند کے موضوع بن سکے نہ ان کی تحقیق کے دائرے میں آئے' اور نہ ہی ان کا تجزیہ ہوا۔ انہوں نے اس پر تشدد قومی جدوجہد کو جو اس وقت زوروں پر تھی اور تاریخ کا موضوع بن سکتی تھی اس پر توجہ نہیں دی' بہت سے مورخوں نے اگر اس وقت کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش بھی کی تو قومی جدوجہد کی روشنی میں نہیں بلکہ دستوری تبدیلی

کی صورت میں جس میں اہل برطانیہ آہستہ آہستہ اور مرحلہ وار روشن خیال مطلق العنانیت کو روشن خیال جمہوریت میں تبدیل کررہے تھے۔

وہ بنیادی جدوجہد جو حکمرانوں اور محکوموں میں 1870ء کی دھائی اور خاص طور سے 1905ء سے جاری تھی یہ دراصل غیر ملکی سامراج اور ابھرتی ہوئی قومی تحریک کے درمیان ایک کشمکش تھی اس شدید دباؤ اور مخالفت کے زمانہ میں رہتے ہوئے بھی بہت سے ہندوستانی مورخوں نے' کیونکہ یا تو وہ حکومت کے ملازم تھے یا غیر سرکاری اداروں میں حکومت کے زیر اثر کام کررہے تھے' جوش و ولولہ کے ساتھ عوام کا ساتھ نہیں دیا ان میں سے چند نے حکومت کا بھی ساتھ نہیں دیا کیونکہ وہ ایک قومی دور کا حصہ تھے اور اس لحاظ سے ان کے اندر قوم پرستانہ جذبات چھپے ہوئے تھے اور انہیں ان کے اظہار کی بھی ضرورت تھی اس لیے ان جذبات کے اظہار کے لیے انہیں پسماندہ جھوٹی قومیت یا اس کے قائم مقام کی ضرورت تھی اس لیے علاقائیت اور فرقہ واریت نے یہ جگہ لے لی۔ جو ان کی قومی امنگوں کو بھی پورا کرسکتی تھی اور اس میں حکومت کے عہدے داروں کا بھی ڈر نہیں تھا جو کہ پس پردہ ان تمام کوششوں کی ہمت افزائی کرتے تھے جو کہ ہندوستان کے معاشرے کو ٹکڑوں میں تقسیم کردے اس لیے اس صورت حال میں حقیقی قوم پرستی اور سامراج دشمنی پیدا نہیں ہوئی اور اس کی جگہ تصوراتی قوم پرست پیدا ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومیت کے عروج کے زمانہ میں برطانوی خطابات حاصل کرنے کے خواہش مند تھے انہوں نے یہ خطابات بھی حاصل کیے اور انہیں مورخوں نے جب راجپوتوں' سکھوں اور مرہٹوں کے حکمرانوں پر لکھا تو اپنے تجزیہ میں سخت قوم پرست ہوگئے۔ یہ بات 1947ء سے پہلے کی فرقہ پرست جماعتوں اور افراد پر بھی صادق آتی ہے با عمل فرقہ پرست بہت کم با عمل قوم پرست تھے خاص طور سے 1919ء کی جدوجہد میں۔

ان نیابتی قومی مورخوں کے ہاں قوم پرستی کا اظہار حکومت برطانیہ پر تنقید میں نہیں بلکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی بلکہ اور ابتدائی زمانہ کے حکمرانوں کی تعریف میں ہے ان کے قوم پرستانہ خیالات نے سامراج کے خلاف کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ برطانوی حکومت کی ذہنیت اس کے مقاصد اور استحصالی پالیسیوں پر سے پردہ نہیں اٹھایا اس کے بجائے ان کے ہاں نیابتی قوم پرستی نے ہندوستان کی قدیم اور عہد وسطی کی سلطنتوں' ان کے حکمرانوں' اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہندوستانی ریاستوں

کے حکمرانوں کی شان و شوکت کو ابھارا۔ ان کے ہاں قومیت' پنجاب' راجپوتانہ' میسور یا جاٹوں اور مرہٹوں میں پائی گئی جس کی بنیاد پر بہت سے ہندوستانی حکمرانوں کے کردار میں روشن خیالی کی بنیادیں تلاش کی گئیں۔ اس مرحلہ پر ہمارا واسطہ ان خوش کن جملوں سے پڑتا ہے جیسے "مادر وطن کی آزادی" "سر زمین کے بچے" "قومی مفاد" اور مقبول عام راہنما" مگر ان نعرے لگانے والوں میں بہت کم ایسے لوگ تھے جنھوں نے حقیقت میں برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کی ہو۔ مثلاً" 1857ء کے راہنماؤں کو بڑھا چڑھا کر نہیں پیش کیا گیا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تعلیمی اداروں کے مورخوں میں سے کسی نے قومی تحریک کے کسی پہلو پر کچھ نہیں لکھا' بلکہ انہوں نے نیا بتی قوم پرستی کے جذبہ کے تحت واقعات کو مسخ کیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ نویسی اور سیاست کو بڑا نقصان پہنچا۔

6

ہندوستان کے بہت سے جدید مورخ موجودہ فرقہ وارانہ سیاست کو ماضی کے ذریعہ ابھارتے ہیں' اس سے اس رجحان کو تقویت ہوتی ہے کہ اٹھارویں صدی کی سیاست میں ہندو مسلمان تصادم سب سے اہم تھا' اور یہی تصادم انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں جاری رہا۔ فرقہ وارانہ جذبات کو اس خیال نے تقویت دی کہ جس میں ہندوؤں' سکھوں اور مسلمانوں کو ایک سماجی و سیاسی شخصیت مانا گیا اور اس کی انتہا پسند شکل میں اسلام بھی ایک حقیقی ہستی بن گیا۔ مثلاً" اسلام فتح کرتا ہے' اسلام سوچتا ہے' اسلام فیصلہ کرتا ہے' اور اسلام فائدہ پہنچاتا ہے' قسم کے جملے مسلسل استعمال کیے جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ رجحان بھی پیدا ہوا کہ مغلوں اور عہد وسطی کے دوسرے حکمرانوں کو غیر ملکی سمجھا گیا جب کہ مرہٹوں' راجپوتوں اور جاٹ ریاستوں کو ملا کر اسے ہندو ریاست کی شکل دے دی۔ جنوبی اور شمالی ہندوستان کی وہ ریاستیں جن کے مسلمان حکمران تھے وہ سب مسلمان ریاستیں کہلائیں اس سلسلہ میں ہمیں برطانوی مورخوں کا شکر گزار ہونا چاہئے جنھوں نے ہمیں ان خصوصیات سے آشنا کرایا اور ہم یہ تک بھول گئے کہ شاید دنیا کے کسی اور حصہ میں تاریخ

کی تقسیم ان خطوط پر نہیں ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے برطانوی دور کو عیسائی نہیں کہا جبکہ ان کی بیوروکریسی کے طبقہ اعلیٰ میں سب عیسائی تھے اس کے برعکس مغلوں کے دور میں اعلیٰ امراء سب مسلمان نہیں تھے۔

حقیقت میں فرقہ پرست مورخوں نے ہر واقعہ اور شہادت کو توڑ مروڑ کر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مرہٹہ' راجپوت ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کی خصوصیات ہندووانہ تھیں' یہاں تک کہ رنجیت سنگھ کی پنجاب میں حکومت بھی ہندو تھی۔ اس مقصد کے لیے ایک فریم ورک تشکیل دیا گیا اور پھر واقعات کو اس میں جڑ دیا۔ وہ واقعات جو اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے' یا وہ سردار اور حکمران جو اس فریم ورک میں ٹھیک نہیں آتے تھے انہیں برا انسان' برا ہندو' سماج یا قوم کا دشمن 'غدار' اور خود غرض کہا گیا۔ اچھے ہندو حکمرانوں کے ایسے کام جو ان مورخوں کے لیے تکلیف کا باعث تھے انہیں اس کی اصل پالیسی سے انحراف قرار دیا گیا۔

7

تاریخ نویسی میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر اس طرح سے نیابتی قوم پرستی اور موجودہ فرقہ وارانہ جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور اس میں ہندو مسلمان قوم پرستی غالب آجاتی ہے جو رجعت پرستی کی طرف دھکیلتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں یورپی تاریخ کا بھی اثر ہے یورپی تاریخ کا طالب علم کیتھولک پروٹسٹنٹ تصادم کو ہندوستان میں ہندو مسلمان کش مکش کی صورت میں دیکھتا ہے۔ برطانوی مورخیں اور مبلغین نے ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارویں صدی اور اس سے پہلے یا انیسویں و بیسویں صدی میں ہندو مسلم اختلافات کو اجاگر کیا۔ ہندوستانیوں نے محض ان کی تقلید کی ان کے لیے یہ اس لیے بھی آسان تھا کہ برطانوی عہدے داروں کو تاریخ کے اس فرقہ وارانہ نقطہ نظر اور قدیم و عہد وسطیٰ کے حکمرانوں اور شخصیتوں کے ابھارنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے صرف ان کوششوں کو روکا جن کے ذریعہ برطانوی سامراج پر تنقید ہوتی تھی۔

ان مورخوں کے ہاں فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے پیدا ہونے کی وجہ' کچھ حد تک ان کا فوجی و سیاسی تاریخ پر تحقیق کرنا بھی تھا جس میں مذہب ایک اہم عنصر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ ڈپلومیٹک اور فوجی معاہدوں میں بہت سے عناصر کام کرتے ہیں: شادی بیاہ کے رشتوں کا اثر' رشتہ داری' زبان' نسل' ذات پات اور مذہب لیکن اگر ان میں کوئی نہ ہو تب بھی معاہدوں کی تہہ میں جو بنیادی اہمیت ہوتی ہے وہ مفاد ہوتا ہے۔

اگر تاریخ کا مطالعہ اور تاریخ نویسی کو وسعت دی جائے تو فرقہ وارانہ نقطہ نظر بالکل ختم ہوجائے۔ مثلاً" معاشی تاریخ طبقاتی مفادات طبقاتی اتحاد اور طبقاتی کشمکش کی نشاندہی کرے گی جو مذہب کی حدود سے باہر چلی جاتی ہے۔ تاریخ کا یہ پہلو معاشی استحصال کو واضح کرتے ہوئے فرقہ پرستی کے مساوات کے جذبہ کو ختم کردے گا۔ اور یہ تصور کہ ایک مذہب کے ماننے والوں میں بھی بھائی چارہ ہوتا ہے۔ یہ تصور اس وضاحت کے بعد ٹوٹ جائے گا۔

معاشرے کی تقسیم دو طبقوں میں ہوتی ہے ایک وہ جو معاشی طور پر قدر زائد پیدا کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو ان سے ان کی محنت کی کمائی چھین لیتے ہیں اور ان دونوں طبقوں میں ہر مذہب کے ماننے والے ہوتے ہیں۔

سماجی تاریخ اس کا اظہار کرے گی کہ سلاطین یا مغلوں کے دور کو مسلمان کہنا کسی طرح بھی درست نہیں' کیونکہ تمام مسلمانوں کا تعلق حکمران طبقوں سے نہیں تھا۔ مسلمان عوام بھی اس طرح سے غریب تھے جیسے کہ ہندو عوام اور دونوں حکمران' امراء' سردار اور زمیندار جو مسلمان ہوں یا ہندو انتہائی حقارت سے دیکھتے تھے۔ سماجی تاریخ اس جانب اشارہ کرے گی کہ اگر ہندو ذات پات میں تقسیم تھے تو مسلمانوں میں شریف مسلمانوں کا طبقہ' نچلے طبقوں یعنی اجلاف سے برتر تھا۔

انتظامی تاریخ' ملازمت کی پالیسی کی وضاحت کرے گی اور اس سے مالیہ اور انتظامی بنیادوں کا پتہ چلے گا۔ یہ ہندو اور مسلمان ریاستوں کے کردار کا کھوکھلا پن ظاہر کرے گی اور اس سے مرہٹہ' مغل' اور برطانیہ کے مالیہ کے انتظام کی مشابہتیں معلوم ہوں گی اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ عملی انتظام میں کسی بھی قسم کے فرقہ وارانہ جذبات کام نہیں کرتے تھے۔

اگر سیاسی تاریخ کا احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے ہندوستان کی ریاستوں کی سیاست واضح ہوگی۔ دنیا کی سیاست میں واقعات و حالات معاشی و سیاسی مفادات کے تحت گردش کرتے ہیں اس میں مذہبی اثرات کا دخل نہیں ہوتا مگر اکثر حکمراں اور باغی اپنے مادی

مفادات اور خواہشات کو چھپانے کے لیے مذہب کو استعمال کرتے ہیں۔

سماجی اور ثقافتی تاریخ ان عناصر کو سامنے لے کر آئے گی۔ جو باہمی تعاون اور اشتراک کو بڑھاتے ہیں تاکہ اس کے نتیجہ میں ایک مشترکہ ثقافت پیدا ہو اور ساتھ ساتھ نچلی اور گاؤں کی سطح پر ہندو مسلمان تعلقات میں ہم آہنگی ہو یہ اس کی نشاندہی کرے گی کہ اٹھارویں صدی یا بیسویں صدی میں اعلیٰ طبقہ کا مسلمان ثقافتی طور پر نچلی طبقہ کے مسلمان کی بجائے اونچی ذات کے ہندو کے برابر تھا یا پنجابی ہندو ثقافتی طور پر پنجابی مسلمان کے زیادہ قریب تھا نہ کہ بنگالی ہندو کے اور یہی بات بنگالی مسلمان اور پنجابی مسلمان کے لیے درست ہے۔

سماجی اور ثقافتی تاریخ علیحدگی کے ان رجحانات سے پردہ اٹھائے گی جو مذہب کے علاوہ بھی تھے اور جن کا تعلق ذات پات یا فرقہ سے تھا مثلاً" اٹھارویں صدی میں مدراس میں دائیں بازو کی ذاتوں اور بائیں بازو کی ذاتوں میں سخت تصادم ہوا اگر آبادی کے سادہ تناسب سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ راجپوتانہ میں راجپوتوں کی آبادی 1901ء میں صرف 4ء6 تھی اس وجہ سے اگر عہد وسطی میں راجپوت ریاستوں کی جدوجہد کو نام نہاد قومی یا ہندو جدوجہد کہا جائے تو تعجب کی بات ہوگی۔

سب سے بڑھ کر یہ عام آدمی کی زندگی' اس کا سماجی' معاشی اور سیاسی ترقی میں کردار کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے فرقہ وارانہ نقطہ نظر کو تاریخ پر اطلاق کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ اگر مورخ سامراج اور قومی تحریک پر لکھے گا تو وہ مجبور ہوگا کہ وہ عام انسانوں اور ان کے مفادات کا جائزہ لے اور انہوں نے سامراج کے خلاف جدوجہد میں جو حصہ لیا ہے اس کو تسلیم کرے۔

1920ء اور 1930ء کی دھائیوں کے مورخ جنہوں نے فرقہ وارانہ نقطہ نظر کو اختیار کیا' ان کو پوری طرح سے برا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ان میں سے بہت سے اپنے نقطہ نظر کی کمزوری سے واقف نہیں تھے اس کا احساس جب ہوا جب تاریخی مطالعہ اور تحقیق اپنی تکمیل کو پہنچی تو اس وقت واقعات کی الجھنیں اور مختلف مکاتیب فکر کی سوچ واضح ہوئی لیکن ہم جنہوں نے 1947ء میں ملک کی تقسیم کو دیکھا ہے اور جنہیں ہر روز قومی یک جہتی کا احساس ہوتا ہے انہیں سوچنا چاہئے کہ فرقہ وارانہ نقطہ نظر مشکل سے کسی مسئلہ کا حل ہوسکتا ہے' اور یہ نہ صرف آج نقصان پہنچا رہا ہے بلکہ مستقبل میں اور زیادہ نقصان

پہنچائے گا۔ مثلاً" اس سے بہت پہلے کہ مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کو پیش کیا۔ ہندوستانی اور برطانوی مورخین اس کا مواد فراہم کرچکے تھے یعنی ایک قومی نظریہ کی صورت میں ان کے ہاں ہندوستانی قوم سے مراد ہندو قوم تھی اور ہندوستانی لوگوں سے مراد ہندو تھے اور یہ کہ مسلمانوں کی حکومت غیر ملکی تھی اور مسلمان باہر سے آنے والے تھے۔

8

ہندوستان کی قومی تحریک اور سماجی مذہبی اصلاحات کی تحریکیں تاریخی عمل کی پیداوار تھیں ان کی تخلیق مسلسل بدلتے ہوئے حالات کے درمیان ہوئی اس لیے یہ فطری بات تھی کہ ان کے خیالات و افکار میں تضاد آجائے یہ اس بات پر مجبور تھیں کہ صحت مند اور غیر صحت مند رجحانات کو پیدا کریں۔ اس وقت جب کہ ہندوستان سنبھل سنبھل کر قوم پرستی کی طرف جارہا تھا۔ یہ لازمی ہوگیا تھا کہ فرقہ واریت' ذات پات' قوم پرستی کے ارتقاء اور ترقی میں گھل مل جائے بعد میں آنے والی نسلوں کے راہنما جنھوں نے ترقی یافتہ قومی تحریک کو سنبھالا یہ ان کا فرض تھا کہ وہ مسلسل سونے کو میل سے صاف کرتے رہتے مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوگئے اس لیے انہیں اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں زیادہ الزام دیا جاتا ہے اگرچہ غلط سوچ اور فکر کی سزا انہیں بھی ملی۔

بدقسمتی سے یہ رجحان کہ ماضی کو بغیر تنقید کہ شاندار تسلیم کرلیا جائے اس نے تاریخی عمل کو سمجھنے میں دشواری پیدا کی ہم نے انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں اور بیسویں صدی کی سیاسی تحریکوں کو بغیر کسی تنقید کے تسلیم کرلیا اور اب تک ہم اس فرسودہ فکر سے چمٹے ہوئے ہیں کہ جس سے راجہ رام موہن رائے' سوامی دیانند' دیوک نند' اوردبندو گھوش' لوکمانیہ تلک' راجہ لاجپت رائے گاندھی جی اور دوسروں کا تعلق تھا۔ ہمارے ذرائع ابلاغ عامہ' اسکول کی نصابی کتابوں' اور آل انڈیا ریڈیو کی یہ روایت ہوگئی ہے کہ وہ ان پر بغیر کسی تنقید کے صرف تعریف کرتے ہیں اس کی وجہ سے فرقہ پرست ان کے منفی پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ہم نے اپنے لوگوں کو خاص طور سے نوجوانوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہ بڑے لوگ بحیثیت انسان نامکمل سمجھ رکھتے تھے اور ان سے نامکمل عمل بھی سرزد ہوئے۔

ہم ایک وقت انہیں کمزوریوں کی وجہ سے معاف کرسکتے ہیں اگرچہ ان کی غلطیوں نے حالات پر خراب اثر ڈالا لیکن ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ ان کی ناپختگی کسی اور حوالہ سے تباہی کرسکتی ہے ہم ان کے اس کارنامے کو تسلیم کرتے ہیں جو کہ انہوں نے قومیت کی ترقی کے لیے کیا لیکن انہوں نے سختی کے ساتھ سامراج کی مخالفت نہیں کی' اس کے ساتھ ہی ان میں فکر کی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ مذہب اور سیاست کے تعلق' ذات پات کے کردار مذہبی اقلیتوں کی اہمیت' اور ہندوستانی معاشرے کی تاریخ میں تشکیل کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری نصابی کتابیں' اخبارات' آل انڈیا ریڈیو اور سیاسی جماعتیں اس رجحان کو روکیں کہ ہر شخص کو خوش کیا جائے اور کسی پر کوئی تنقید نہیں کی جائے اس طرح یہ قومی یک جہتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

9

تاریخ کا فرقہ وارانہ نقطہ نظر' نیابتی قوم پرستی' یہ کوشش کہ غیر ملکی آقاؤں کو ناراض کیے بغیر قوم پرست رہا جائے۔ سیکولر اور قوم پرست لوگوں کے ذہنوں پر فرقہ پرستی کی گہری چھاپ' فرقہ پرستی کے سامنے مسلسل ہتھیار ڈالنا ذرائع ابلاغ عامہ اور تعلیمی نظام میں فرقہ پرستی کا پرچار' یہ کوشش کہ ایسی بات کہی جائے کہ ہر شخص خوش ہوجائے' ماضی کو جانچنے کے غیر تنقیدی معیار (اس میں قریبی ماضی کو بھی شامل کرلیا جائے' اور قومی تحریکوں کا غیر تجزیاتی مطالعہ' یہ وہ مثالیں ہیں کہ جن سے ہم اچھی طرح سے واقف ہیں ان میں سب سے بڑھ کر قومی ہیروؤں کی تخلیق اور ان کی تشہیر ہے۔

جب انیسویں صدی کی دوسری دھائی میں قوم پرستی ابھر کر سامنے آئی تو اس وقت قومی شعور کو پھیلانے کا ذمہ قومی ہیروؤں نے لیا کیونکہ یہ قومی ہیرو عوام کے لیے جذباتی مرکز بن سکتے تھے کیونکہ قومی راہنما اپنے قومی احساسات اور فرائض کو کوئی فکری رنگ نہیں دے سکے اس لئے قومی ہیرو جذباتی علامتوں کے طور پر استعمال ہوئے اس مقصد کے لیے یہ آج تک استعمال ہورہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک بڑی تعداد میں مصنفوں' صحافیوں اور اساتذہ نے ہیروؤں

کو تخلیق کیا اور ان کی تشہیر کا بیڑا اٹھایا اور ان کے ذریعہ اپنی قومیت کے جذبہ کا اظہار کیا۔ اس کے پس منظر میں یہ جذبہ بھی تھا کہ برطانیہ کے اس پروپیگنڈے کا جواب دیا جائے کہ ہندوستانیوں میں نہ تو حکومت چلانے کی صلاحیت ہے اور نہ ان میں انتظامی معاملات کو سمجھنے کا کوئی جذبہ ہے اس کے جواب میں یہ ہندوستان کی تاریخی شخصیتوں کو ابھار کر اس کا جواب دینا چاہتے تھے تاکہ لوگوں میں جدوجہد کا جذبہ پیدا ہو اور آخری بات یہ تھی کہ فرقہ پرست اور سیاسی راہنماؤں کو علامتوں کی ضرورت تھی تاکہ ان کے ذریعہ تاریخی اور سیاسی خیالات پھیلا کر نئے ابھرتے ہوئے قومی تحریک کے زندہ ہیروؤں کی مخالفت کی جائے لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی تاریخی شخصیتیں خاص طور پر رانا پرتاب شیوا جی اور گرد گو بند سنگھ' ظاہر ہوئیں۔ اخباروں' کتابچوں' کہانیوں' نظموں' ڈراموں' نصابی کتابوں اور آل انڈیا ریڈیو سے قومی ہیروؤں کی حیثیت سے ان کی تشہیر ہوئی۔

اس بات کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ تخلیق کے عمل میں کوئی تاریخی تجزیہ یا فیصلہ شامل نہیں ہوتا ہے یہ ایک سیاسی معاملہ ہوتا ہے اس لیے اسے سیاسی حربہ یا سیاسی تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ اس کے جائز ہونے' مفید ہونے اور یہ دیکھنے کے لیے سیاسی سماجی ضروریات کے لئے ہیرو صحیح ہے یا غلط اس میں کسی تاریخی شہادت اس کے تاریخی کردار اور تجزیہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے چونکہ ان شخصیتوں کو ہندوستان کی سیاست میں ایک خاص کردار ادا کرنا تھا اس لیے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ان کی تخلیق ہوئی اس لیے ان کی ضرورت کو سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ان کا تاریخی بنیادوں پر کوئی تجزیہ نہیں کیا گیا۔

اس مرحلہ پر ہم اس کی نشاندہی کریں گے کہ جن شخصیتوں کو سیاسی ضرورت کے طور پر ابھارا گیا ان میں ان تاریخی شخصیتوں کو نہیں لیا گیا جنھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی اور ان سے جنگیں لڑیں۔ 1857ء کے باغی بہادر شاہ ظفر' رانی جھانسی' نانا صاحب' تانتیا ٹوپی' مولوی احمد اللہ فیض آبادی' کنور سنگھ' رانی جنداں' دیوان مول راج' داسو دیو' بی فدکی' چاپے کربرادر' مستحل بغاوت کے ہیرو یا نیل کی کاشت کے باغی اور خدی رام بوس' کلپنا دت اور قومی راہنماؤں کی ایک طویل قطار

شمالی ہندوستان کے ادب میں جوشیلا اور آگ سے بھرا ہوا جدید قومی ڈرامہ نیل درپن جس میں نیل کے کاشتکاروں کی جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے یہ نہ تو سٹیج ہوا اور نہ ہی

شائع ہو کر فروخت ہوا اس کی بجائے قوم پرستی کو اس قسم کے مقبول ڈراموں کے ذریعے ابھارا گیا' جیسے پرتھوی راج وغیرہ اس کے جواب میں مسلمان فرقہ پرستوں نے اپنے ہیرو علیحدہ سے پیدا کیے جن کا تعلق صلیبی جنگوں سے تھا۔ اور جو عیسائیوں کے خلاف لڑے تھے آخر یہ کیوں ہوا؟ اس میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جب ان شخصیتوں کو تخلیق کیا گیا تھا وہ برطانوی حکومت کا رویہ تھا۔ وہ صحیح اور حقیقی قوم پرستی پر ناک بھوں چڑھاتی تھی اور سامراج دشمنی کو برداشت نہیں کرتی تھی خاص طور سے وہ ان شخصیتوں کے تاریخی کردار سے خوفزدہ تھے جنہوں نے ان کے اقتدار کے قیام کی مخالفت کی تھی جن لوگوں نے اٹھارہ سو ستاون (1857ء) کی شخصیتوں پر کچھ لکھا ان کے خلاف اقدامات کرتے ہوئے انہوں نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔

اکثر سکولوں کالجوں کے استاد 'مصنفین' صحافی' سرکاری سرپرستی کے خواہشمند رہتے تھے اس لیے وہ اس قسم کے موضوعات لے کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے اور نہ ہی برطانوی عہدے داروں کو ناراض کرنا چاہتے تھے اس کے برعکس یہ عہدے دار نیابتی قوم پرستی کی ہمت افزائی کرتے تھے کیونکہ یہ ان کے اصول (پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) پر پورا اترتی تھی اس لیے تاریخ کی کتابوں نصابی کتابوں اور ادب کی کتابوں میں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ فرقہ وارانہ ذات پات اور علاقائی شخصیتوں کو ابھارے۔ صرف ایک شرط یہ تھی کہ برطانوی راج کے مخالفین کو کسی بھی صورت میں اجاگر نہیں کیا جائے۔ اس لیے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ نہ صرف نظریاتی بلکہ سیاست میں برطانوی عہدے دار ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں اور ذات پات پر عقیدہ رکھنے والوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا خاص طور سے سیکولر قوم پرستی کے خلاف۔

یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ شخصیت پرستی کا عروج ہندوستان میں قوم پرستی کے دور اعتدال میں ہوا۔ سریندر ناتھ بینرجی' جسٹس رانا ڈے مدن موہن مالویہ آر۔ سی۔ دت اور تلک نے اعتدال کے زمانہ میں شیوا جی' گرد گوبند سنگھ اور رانا پرتاب کو قومی ہیرو بنایا ان قوم پرستوں کی نسل برطانوی حکومت کو تاریخی اعتبار سے ترقی یافتہ سمجھتی تھی اس لیے انہوں نے ان شخصیتوں کو نہیں ابھارا جنہوں نے ان کے قیام کی مخالفت کی تھی وہ اس مرحلہ پر یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ حکومت کی مخالفت کریں اس موقع پر ہم 1897ء کے اس ایکشن کی یاد دلائیں گے جو برطانوی حکومت نے تلک کے خلاف لیا تھا۔ برطانوی

حکومت اور اس کے عہدیداروں نے شیوا جی کے کردار کو ابھارنے کی کوشش کی مخالفت نہیں کی کیونکہ یہ مسلمانوں کی مخالفت میں جاتا تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ تلک شیوا جی کی شخصیت کو برطانوی حکومت کے خلاف استعمال کر رہا ہے تو اسے انہوں نے فوراً روک دیا۔

میں ایک بار پھر اس کو دہراؤں گا کہ ابتدائی قوم پرست راہنما ایک حد تک شخصیت کی تخلیق میں درست تھے کہ انہوں نے تحریک کی ابتداء کی تھی اور وہ اپنے عمل کے پورے نتائج اور عواقب سے بے خبر تھے یہ بعد میں آنے والے قوم پرستوں کا کام تھا کہ وہ ان کی غلطیوں کو درست کرتے اور اس طرح وہ عوامی سطح پر اپنے مقصد کو زیادہ اچھی طرح سے پھیلاتے۔

رانا پرتاب' شیوا جی اور گرو گوبند سنگھ وہ شخصیتیں تھیں جن کا تعلق عہد وسطی سے تھا اور یہ مغل حکومت کے خلاف لڑے تھے اور انہوں نے سیکولر ازم اور قومی یکجہتی کو اتنا ہی نقصان پہنچایا جتنا کہ کوئی نظریاتی عنصر کو پہنچاتا ہے ان شخصیتوں کے مفروضوں نے ایک ہی حملہ میں دو قومی نظریہ کو صحیح ثابت کردیا اور ان کی بنیادوں پر فرقہ وارانہ نقطہ نظر کو تقویت پہنچی۔ یہاں یہ سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں کہ کس حیثیت سے ان کو قومی ہیرو کہا جائے؟ کیا وہ غیر ملکیوں سے لڑے تھے؟ اور کیا مغل غیر ملکی تھے؟ رانا پرتاب' شیوا جی اور گرو گوبند سنگھ کی قوم پرستی میں کون سی قدر مشترک تھی؟ کیا ان کا ہندو یا غیر مسلم ہونا؟ لیکن یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ ان شخصیتوں کے مفروضوں نے فرقہ پرستی کو جنم دیا۔

جب بھی کوئی بچہ یا بالغ رانا پرتاب یا شیوا جی کا ذکر سنتا ہے تو وہ ان کا قومی راہنماؤں کی حیثیت سے احترام کرتا ہے اور اس بات کو قبول کرلیتا ہے کہ عہد وسطی میں ہندو قوم اپنا وجود رکھتی تھی اور مسلمانوں سے جو غیر ملکی تھے ان سے اس کا دائمی تصادم تھا آج تک ہماری نصابی کتابیں ہمارے سیاسی راہنما ہمارے ذرائع ابلاغ عامہ خصوصیت سے آل انڈیا ریڈیو' مسلسل عہد وسطی کے ہیروؤں کے مفروضوں کی تبلیغ کرکے قوم پرستی کو ابھار رہا ہے خصوصیت سے اس وقت جب کہ کوئی بحرانی حالت پیدا ہو جائے لیکن اس پروپیگنڈہ کا ابتدائی قومی راہنماؤں کے مقابلہ میں بہت کم جواز ہے اب حالات بدل چکے ہیں اور وہ تاریخی شخصیتیں جو کہ حقیقی معنوں میں برطانوی سامراج سے لڑیں ان کے کارنامے معلوم ہوچکے ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو ابھارا جائے تاکہ فرقہ وارانہ

نقطہ نظر سے شخصیتوں کے مفروضے اور ان کا کھوکھلا پن ظاہر ہوکر سامنے آجائے آل انڈیا ریڈیو سے سیٹھ گونداس کے ایسے ڈرامے نشر کیے گئے جن میں ہر اس معمولی جدوجہد کو جو کسی زمیندار یا جاگیردار کی جانب سے ہوئی اسے قومی جدوجہد کہا گیا اور اگر لڑنے والا زمیندار راجپوت ہندو ہو اور حکمران مسلمان تو اس کی مبالغہ آمیز تعریف کی گئی۔

مجھے پھر اس بات کو دہرانے دیجئے کہ ان شخصیتوں کی تخلیق میں تاریخی دیانت اور تاریخی معروضیت کا دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ سیاسی مفادات کی پیداوار ہوتی ہیں اور ان ہی مفادات کو پورا کرنے کا کام کرتی ہیں اس لیے ایسی شخصیتوں کو قومی ہیرو کا درجہ نہیں دینا چاہئے۔ میرا مقصد کسی بھی صورت میں یہ نہیں کہ ان کا مقام پست کیا جائے یا ان کے تاریخی کردار سے انکار کیا جائے یقیناً" رانا پرتاب' شیوا جی اور گروگوبند سنگھ اپنے تاریخی ماحول میں اہم شخصیتیں تھیں لیکن وہ ماحول قومی جدوجہد کا نہیں تھا اگر ہم نے فرقہ واریت کے تحت انہیں ہندو قوم پرست کہا تو سیکولر اور قومی یک جہتی کے نام پر ان کے کردار پر بحث کرکے انہیں ہندوستان کے اتحاد ہندوستانی ریاست اور قومیت کا دشمن کہا جائے گا تو دونوں ہی نقطہ نظر اپنی جگہ کھوکھلے اور لغو ہیں لیکن اگر یہ بات کہی جائے کہ ان کے اپنے زمانہ میں چونکہ قوم پرستی کا وجود نہیں تھا اس لیے وہ قوم پرست نہیں تھے اس لیے ان کا تاریخی مقام کسی حیثیت سے کم نہیں ہوتا کیونکہ قومی ہیرو بننے کے علاوہ بھی دوسرے پہلو ہیں جن میں عزت و احترام ہوتا ہے ورنہ ہم کیوں اس بات کا اعلان نہیں کردیتے کہ جو اشوک' ہرش' گرونانک' چتیا یا اکبر کو قومی ہیرو نہیں کہے گا تو وہ ان کی بے عزتی کرے گا۔

حقیقت میں' میں اس بات کی کوشش کررہا ہوں کہ شیوا جی' رانا پرتاب اور گروگوبند سنگھ کو ان کے غیر مفید استعمال سے نجات دلاؤں جس کا وہ شکار ہوگئے ہیں۔ اور اب تک فرقہ پرستوں کے ہاتھوں ہورہے ہیں حقیقت میں رانا پرتاب بھی اس سے زیادہ قومی ہیرو نہیں تھا جتنا کہ اکبر یا شیوا جی کے مقابلہ میں اورنگ زیب۔ تاریخ میں انہیں ایک جھوٹے قسم کا قومی ہیرو کا درجہ دینے کا مطلب ہے کہ ہم جدید اور موجودہ تاریخ میں قوم دشمن جذبات پیدا کرنے اور یک جہتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں مدد کررہے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ فرقہ پرستوں نے بہت کم کوشش کی ہے کہ وہ اشوک' چندر گپت یا ہرش کو قومی ہیرو کا درجہ دیں۔ اگرچہ وہ نام نہاد سنہری دور کی پیداوار تھے لیکن

فرقہ پرست اچھی طرح جانتے تھے کہ اس صورت میں وہ مسلمانوں کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں ناکام ہوجائیں گے اور ان کی یہ قوم پرستی مسلمان قومیت کے خلاف نہیں ہوگی یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ آج کے دور کے ایک اہم فرقہ پرست مورخ نے کوشش کی ہے کہ تاریخی معروضیت کے پس پردہ رانی جھانسی اور نانا صاحب کے تاریخی کردار کو کم کیا جائے حالانکہ یہ ہندو تھے اور ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن چونکہ وہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے بلکہ ان کے ساتھ تعاون کررہے تھے یہاں تک کہ مغل بادشاہ کو اپنا شہنشاہ مانتے تھے۔

ہم ان اثرات کو کم کرکے پیش نہیں کرسکتے جو ان شخصیتوں کے مفروضوں نے قومی یک جہتی کو نقصان پہنچا کر اختلافات کو پیدا کیا اس کا منفی اثر اقلیتوں اور استحصالی گروہوں پر بھی ہوا ایک مسلمان کے لیے یہ آسان نہیں کہ وہ جذباتی طور پر اس قوم پرستی سے لگاؤ محسوس کرے یا اس کے لیے حقیقی جذبہ محسوس کرے کہ جس کے قومی ہیرو قومی عظمت غیر ملکی مسلمانوں سے جدوجہد کرکے حاصل کرتے ہوں اسی طرح سے اگر زمینداروں اور سرداروں کو بڑھایا جائے گا تو یہی جذبات نچلی ذاتوں اور طبقوں کے ہوں گے کیونکہ وہ انہیں استحصالی اور غاصب سمجھتے ہیں جنہوں نے ماضی میں ان پر مظالم ڈھائے۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان شخصیتوں کی جگہ دوسری شخصیتیں لائی جائیں جو ان کی جگہ پر کریں یا جو ان کے مقابلہ میں قوم پرست ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ موزوں وقت ہے کہ جب ہمارا تعلیمی نظام ذرائع ابلاغ عامہ آل انڈیا ریڈیو سمیت سیاسی پارٹیاں اور شخصیتیں لوگوں کے سامنے حقیقی افراد کو پیش کریں اور ان کے منفی و مثبت دونوں پہلوؤں کو سامنے لائیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی سیاسی تربیت کی جائے اور ان کو ایک اعلیٰ سماجی و سیاسی مقصد کے لیے تیار کیا جائے اگر کسی وجہ سے شخصیتوں کے بت تراشنے لازمی ہوں تو ان کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے تاکہ وہ مقاصد کو بہتر طریقہ سے پورا کرسکیں۔

○

عہد وسطیٰ کی تاریخ اور فرقہ پرست

اصغر علی انجینئر

عہد وسطیٰ کی تاریخ کی تعبیر و تفسیر ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کا مشغلہ ہے۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔

ہندو فرقہ پرست اس خیال کے حامی ہیں کہ مسلمان حملہ آوروں نے ہندوؤں کو غلام بنایا' ان کی عورتوں کی بے عزتی کی' اور ان کے مندروں کو لوٹا' مسلمان فرقہ پرست اس کے مقابلہ میں مسلمان عہد کی شان و شوکت بیان کرتے ہیں اور اس کو ہندوستان کا سب سے شاندار دور کہتے ہیں' برطانوی حکمرانوں نے بھی اپنے سیاسی مقاصد کو استعمال کرنے کے لیے ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلمان اختلافات کو اجاگر کیا' حقیقت میں تاریخ باقاعدگی سے کئی دھائیوں سے اسکول کے طالب علموں اور دوسرے معصوم لوگوں کے ذہن کو مسموم کرنے کے لیے استعمال ہو رہی ہے اور اس کے ذریعہ فرقہ واریت کو پھیلایا جارہا ہے اس لیے مسلمانوں کے مسائل بیان کرتے ہوئے تاریخ ایک اہم موضوع ہے اور اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ جنتا دور حکومت میں اسکول کی نصابی کتابوں پر بحث چھڑ گئی اور مرار جی ڈیسائی کی حکومت نے ایک خفیہ سرکلر کے ذریعہ ان نصابی کتابوں کو اسکول کے نصاب سے خارج کردیا۔

آخر سیاست دان تاریخ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں؟ مشہور مورخ سروے پلی گوپال کے مطابق:

"تمام سماجی سائنسوں میں تاریخ وہ علم ہے جو سیاستدانوں کے ذہن میں سب سے زیادہ دلچسپی پیدا کرتا ہے اس کی مختلف وجوہات ہیں اس کا استعمال ہمیشہ موحدانہ اور بامقصد

ہوتا ہے اگرچہ تاریخ اور دیو مالا کے درمیان بڑا باریک خط ہوتا ہے' لیکن ماضی کے ذریعہ حال کے ہر پہلو کو جائز قرار دینے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے خاص طور پر جب کہ سامراج سے مقابلہ ہو اس موقع پر تاریخ اور کلچر قوم پرستی کے استحکام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔"

اس لیے تاریخ کو سیاستدان یا تو سامراج کے خلاف جدوجہد کے لیے استعمال کرتا ہے یا اسے اپنے فرقہ پرستانہ مقاصد کے لیے اس صورت میں وہ اسے حقیقت سے دیو مالائی صورت میں تبدیل کردیتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تاریخ ان معنوں میں سائنٹفک نہیں کہ اس میں تجربات ہوسکیں اور ایسی ہی صورت حال کو تخلیق کرکے حالات و واقعات کا تجزیہ کیا جاسکے۔ کیونکہ اس میں کوئی متعین اور مقررہ قانون نہیں ہیں اس وجہ سے تاریخ کو پہلے سے طے شدہ مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے واقعات و انسانوں کا بھی سہارا لیا جاسکتا ہے۔ جیسے کہ سی۔پی۔ اسکاٹ نے کہا ہے کہ: "واقعات مقدس ہیں' رائے آزاد ہے" لیکن مشہور برطانوی مورخ ای۔ ایچ۔ کا واقعات کے تقدس کو چیلنج کرتا ہے۔ اس کی رائے کے مطابق:

"یہ کہا جاتا ہے کہ واقعات اپنے آپ بولتے ہیں حقیقت میں یہ غلط ہے۔ واقعات جبھی بولتے ہیں جب مورخ ان سے کہتا ہے کہ اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ فیصلہ کرے کن کن واقعات کو بولنے کا موقع دے کس ترتیب اور کس حوالہ سے۔ میرا خیال ہے کہ پیراندیلو (PIRAN DELLO) کے ایک کردار نے یہ کہا تھا کہ واقعات ایک تھیلے کی مانند ہوتے ہیں اور یہ اس وقت تک کھڑے نہیں ہوسکتے جب تک کہ آپ اس میں کچھ بھر نہ دیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے فرقہ پرست مورخ جس طرح چاہتے ہیں تاریخی واقعات کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں ان کا انتخاب سیاق و سباق اور واقعات کے معنی بدل دیتا ہے مثلاً" یہ ایک حقیقت ہے کہ محمود غزنوی نے حملہ کیا اور سومنات کے مندر کو نجس کیا۔ لیکن اس واقعہ کو ضرورت سے زیادہ ہماری نصابی کتابوں میں ابھارا گیا ہے اور اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے واقعات کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے حالانکہ محمود غزنوی وہ پہلا حکمران نہیں تھا جس نے ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مندروں کو

ناپاک کیا ہو' ایسے دوسرے حکمران بھی تھے جن کے ناپاک اقدامات محمود غزنوی سے زیادہ صدمہ پہنچانے والے تھے۔ کشمیر کے بادشاہ ہرش (1089ء - 1101ء) نے ڈی۔ ڈی۔ کو سامبی کے مطابق اپنی سلطنت کے قرب و جوار کے تمام دھات کے بتوں کو باقاعدہ پگھلا دیا تھا' سوائے چار بتوں' کے یہ ہرش کوئی وحشی یا غیر متمدن نہیں تھا کہ ان نجس کاموں میں ملوث ہوتا یہ مہذب بادشاہ تھا' بہترین ادبی ذوق کا مالک' ڈرامہ' موسیقی اور بیلے کا نقاد' یہ برہمنوں کی معقولیت کی حد تک سرپرستی بھی کرتا تھا اور ایک بدھ مت کے استاد کی اتنی عزت کرتا تھا کہ اس کی درخواست پر اس نے چار بتوں کو چھوڑ دیا تھا جن میں دو بدھ کے تھے' کوسمبی کی رائے کے مطابق ان بتوں کو ناپاک کرنے کی اصل وجہ معیشت تھی' بادشاہ کو ڈاسر زمینداروں کی بغاوت ختم کرنے کے لیے اخراجات کی ضرورت تھی' محمود غزنوی کی لوٹ مار کرنے والی مہمات کے پس منظر میں بھی معاشی وجوہات تھیں اگرچہ ان کو مذہبی رنگ دے دیا گیا ورنہ اس کا بنیادی مقصد لوٹ مار تھا اس کا کوئی ارادہ ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کا نہیں تھا۔ ورنہ ایک حکمران کو روا داری کے ساتھ رہنا پڑتا ہے تاکہ اس کی رعیت کے جذبات نہ بھڑک جائیں' محمود جو کہ گھومنے پھرنے والا لٹیرا تھا' اسے اپنے استحصالیوں کے مذہبی جذبات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا اہم مقصد لوٹ مار تھی بت پرستوں کو سزا دینا نہیں تھی یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اب اسے جدید مورخ بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

فرقہ پرست تاریخ کو حد سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں تاریخی کرداروں یا مشہور افراد کے عمل کا تعلق مذہب' نسل' اور ذات پات سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت سے بہت دور ہے تاریخی عمل بڑی حد تک ایک پیچیدہ عمل ہے اور یہ مادی طاقتوں کے ذریعہ متعین ہوتا ہے (مارکس نے زور دیا ہے کہ ذرائع پیداوار کی طاقتیں اور ان کے تعلقات اہم کردار ادا کرتے ہیں) جب کہ سیاست اور مذہب وہ طاقتیں ہیں جو بالائی ڈھانچہ کا ایک حصہ ہیں جیسا کہ میک مرٹی (MCMURTY) نے کہا ہے۔

"پیداواری تعلقات کلی طور پر معاشی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں اسے مارکس علم تشریح (ANOTOMY) جوہر' شکل اور تمام انسانی تاریخ کی بنیاد کہتا ہے"

تاریخ کا فرقہ وارانہ نقطہ نظر جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں' تاریخ کی پیچیدہ اور الجھی ہوئی فطرت کو یکسر نظر انداز کردیتا ہے اور صرف مذہب ان کے ہاں تاریخ کا اہم ترین عنصر قرار

پاتا ہے بلکہ یہ وہ واحد محرک ہوتا ہے جو تاریخی عمل کا جواز ہوتا ہے۔

تاریخ کے اس نقطہ نظر کو زیادہ عرصہ زندہ نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ یہ بنیادی طور پر ایسا نقطہ نظر ہے جو ایک جانب گول واکر اور دوسری جانب مسلمان فرقہ پرستوں کو اس جانب لے گیا ہے جہاں انہوں نے مذہب اور نسل کو ایک پراسرار کردار بنا دیا ہے۔ گنگا دھرتی کے مطابق گول واکر چاہتا ہے کہ خاص طور سے صرف ہندو شعور پیدا ہو۔ ان کوششوں کے ذریعہ گول واکر کا مقصد یہ ہے کہ ایک طاقتور طرفدارانہ تاریخی تنازعہ پیدا کرے اور اس کے استعمال سے لوگوں کو سحر زدہ کیا جائے اور انہیں عملی تحریک میں لایا جائے تاکہ معاشرہ کو ایک فرقہ پرست یوٹوپیا میں تبدیل کردیا جائے۔

مسلمانوں کے سوچنے کا انداز بھی اسی قسم کا ہے کہ خدا نے انہیں تاریخ میں ایک اہم کام کے لیے منتخب کیا ہے جسے پورا کرنا ان کی زندگی کا اہم مقصد ہے اور انہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ مذہب کی تعلیمات پر عمل کریں' اس کے نتیجہ میں پوری دنیا کا نظام ٹھیک ہوجائے گا۔ تاریخ کے اس نقطہ نظر کے مطابق چند افراد مذہب یا نسل کے نجات دہندہ بن جاتے ہیں۔

فرقہ وارانہ پس منظر میں مختلف افراد جیسے رانا پرتاب شیوا جی اور دوسرے لوگوں کو پر عظمت بتایا جاتا ہے اور بحیثیت ہندو ہیرو انہیں آگے بڑھایا جاتا ہے کیونکہ یہ افراد مسلمان اقتدار کے خلاف لڑے تھے اس کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کو برائی کا مجسمہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کو بھی تاریخ کے اسی نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ جس میں وہ محض ایک مذہبی جنونی کی حیثیت سے ابھرا کہ جس کی ریاستی پالیسی میں کوئی سیاسی یا دوسرے عوامل نہیں تھے۔ شیوا جی جو اورنگ زیب سے لڑا' اس نظریہ کے مطابق وہ ہندوؤں کا محافظ بن گیا اور اس حیثیت سے اسے تقدس کا درجہ دیا گیا۔ تاریخ کے پیچیدہ کردار کو نظر انداز کرکے یہاں اسے مذہب کے متعین شدہ مقاصد کے تحت استعمال کیا گیا اور مذہبی وفاداری تاریخی عمل کا ایک انتہائی اہم عنصر بن گئی۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان مذہبی جنونیوں نے بھی تاریخ کو اسی مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ طبقاتی کش مکش اور جاگیر دارانہ استحصال کو نظر انداز کرکے مسلمانوں کے عہد کو مسلمانوں کے لیے خصوصیت سے اور دوسروں کے لیے عموماً' بہترین دور خیال کرتے ہیں اس قسم کے مورخ اورنگ زیب کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ وہ

ہندوستان میں اسلام کا محافظ تھا اور تمام خوبیوں کا پیکر تھا یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس قسم کا نظریہ تاریخ اگرچہ سنجیدہ مورخوں کے لیے قابل تسلیم نہیں ہے لیکن اس نے آزادی سے پہلے اور بعد میں فرقہ وارانہ تعلقات کو نقصان پہنچانے میں بڑا حصہ لیا۔ حقیقت میں یہ ایک طاقت ور حربہ رہا ہے کہ جس کے ذریعہ فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارا گیا۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب جنتا پارٹی اقتدار میں آئی تو کچھ افراد جن کا تعلق آر۔ ایس۔ ایس سے تھا' ان کی شدید خواہش تھی کہ تاریخ کی ان نصابی کتابوں کو کورس سے نکلوا دیا جائے جن میں تاریخی واقعات کو معروضی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

جناب وجے پرشاد چوہدری کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر کے۔ کے دت جو آئی۔ سی۔ ایچ - آر- میں ہیں اور اس قسم کے دوسرے اراکین ان نصابی کتابوں کو نکلوانے میں پیش پیش تھے۔ شری نن جی دیش مکھی سابق جن سنگھ راہنما نے ایک خط وزیراعظم (شری مررا جی ڈیسائی) کو لکھا جس میں ان پر زور دیا گیا کہ وزارت تعلیم سے کہیں کہ ان نصابی کتابوں کو خارج کردیں۔ وی شنکر وزیر اعظم کے پرسنل سیکرٹری نے 27 مئی 1977ء کو وزارت تعلیم کو ایک نوٹ بھیجا جس میں کہا گیا کہ۔

"میں وزیر تعلیم کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ وزیراعظم کو کچھ کتابوں کے بارے میں نوٹس ملے ہیں اور انہوں نے محسوس کیا ہے کہ یہ کتابیں اس قسم کا مواد رکھتی ہیں جو منا تشانہ ہے اور ایک رخی تصویر پیش کرتا ہے جس کو پڑھ کر قاری ہندوستان کے بارے میں متعصبانہ رائے اختیار کرے گا... وزیراعظم کا خیال ہے کہ ان کتابوں کے اخراج کے بارے میں سوچیں گے۔ خاص طور سے وہ کتابیں جو اسکول میں نصابی کتابوں کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں جو متعلقہ اداروں نے چھاپی ہیں اور وزارت تعلیم کے تحت ہوں ان کا بھی اسی نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جائے اور مناسب اقدامات کئے جائیں تاکہ قاری ہماری تاریخ اور کلچر کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں غلط رائے قائم نہیں کرے۔"

جو نصابی کتابیں اس جھگڑے کا باعث ہوئیں وہ یہ ہیں۔

MEDIEVAL INDIA.

By R. Thapar.

MODERN INDIA,

By B. Chandra

FREEDOM STRUGGLE,

By B.De, A Tripathi, and B.Chandra,

COMMUNALISM AND THE WRITTING OF INDIAN HISTORY,

By R. Thapar, H.Mukhia, and B.Chandra.

پہلی مرتبہ ان مورخین نے جنہوں نے یہ نصابی کتابیں لکھیں تاریخ کے اس حد سے زیادہ سہل نقطہ نظر پر سوال اٹھایا کہ جس میں مذہب کو تاریخ کا سب سے زیادہ اہم متحرک اور فعال عنصر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ فرقہ پرستوں کا نظریہ تاریخ اسی مفروضہ پر ہے۔ اس لیے ان کتابوں پر ان کا غصہ سمجھ میں آتا ہے۔ ایس گوپال نے ان لوگوں پر جنہوں نے ان کتابوں کو تنقید کا ہدف بنایا کہا کہ:

"ان کی تنقید میں کمزوری اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے یہ تنقید فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے کی۔ اگر تاریخی تجزیہ اتنا آسان ہو جتنا کہ یہ سمجھتے ہیں تو ہر کوئی اپنے آپ کو اس کا ماہر کہہ سکتا ہے اور اپنے فیصلوں کا اعلان کر سکتا ہے۔"

مثلاً" اورنگ زیب ایک متعصب اور فرقہ پرست مسلمان تھا اس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور جو مورخ اسے اس حیثیت سے نہیں دیکھتے انہیں جانب داری کا ملزم قرار دیا جاتا ہے' اس حقیقت کو فراموش کردیا جاتا ہے کہ ایماندار مورخ کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ اورنگ زیب کے بہت سے ایسے فرمان بھی ہیں جن میں اس نے برہمنوں اور ہندو مندروں کو نقد اور جاگیر کی صورت میں عطیات بھی دیئے ہیں۔

یہ مورخ جنہوں نے نصابی کتابیں لکھیں اس حقیقت پر زور دینا چاہتے تھے کہ مذہب کے علاوہ تاریخ کی تشکیل میں اور بہت سے بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے تحت ایک عام آدمی کے ذہن میں یہ پیدا کردیا گیا ہے کہ عہد وسطی میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں' مسلمان حکمران پکے مذہبی تھے اور ہندوؤں پر ظلم ڈھاتے تھے اور ان کو ہر ممکن طریقہ سے تباہ کرنے کے در پے تھے اس دور میں علاقائی ہندو گورنروں اور راجاؤں نے بغاوت کی' فرقہ پرستوں کے نزدیک یہ انہوں نے ہندوؤں کی عزت بچانے کے لیے کیں لیکن وہ مورخ جن کا تاریخی شعور گہرا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان بغاوتوں کے پس منظر میں جو مقاصد تھے وہ پیچیدہ تھے اور اتنے آسان نہیں تھے جتنے کہ یہ

فرض کرلیتے ہیں طاقت کے حصول کی خواہش' مذہب سے زیادہ اہم عنصر تھا۔ نظام بادشاہت اور جاگیرداری کے زمانہ میں خاندانوں کے درمیان اقتدار کی جنگ رہتی تھی اور یہ جنگ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں بھی ہوتی تھی اور دو علیحدہ علیحدہ مذہب سے تعلق رکھنے والوں میں بھی' علاؤالدین خلجی نے ہزاروں نومسلموں کے قتل عام کے وقت کسی بھی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ انہوں نے بغاوت کی تھی اور ان کی بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ انہیں ملازمت کے بہتر مواقع نہیں ملے تھے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی حکومت اسلامی تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے کبھی بھی انتظامیہ کو اسلامی بنانے کی کوشش نہیں کی یا تو انہوں نے اس انتظامی ڈھانچہ کو رہنے دیا جو انہیں اقتدار کے وقت ملا تھا یا اس میں انہوں نے مقامی حالات کے مطابق تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے کبھی بھی گاؤں کے انتظامی ڈھانچہ اور ان کی زندگی تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی' جہاں کہ ہندوستان کی اکثریت رہتی تھی۔

کچھ طبقوں میں تاریخ کے فرقہ وارانہ نقطہ نظر کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور تاریخ کے مارکسی نقطہ نظر کی مکمل مخالفت کی جاتی ہے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مارکسزم نے تاریخی شعور میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے اور اس کا اثر تمام دنیا پر ہوا ہے اگر عہد وسطی کی تاریخ میں باہمی تصادم' کش مکش دباؤ اور تضادات کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے لیے مارکسی طریقہ کار بہت مفید رہے گا۔

سروے پلی گوپال کا کہنا ہے "اگر کوئی' مورخ سنجیدگی سے مارکسی نقطہ نظر سے تاریخ نہیں لکھ رہا ہے تو اس وجہ سے ہندوستان کی تاریخ نویسی کمزور رہ جائے گی" ہندوستان میں اب سنجیدہ مارکسی تاریخ نویسی کی ابتدا ہوچکی ہے اور یہ یقیناً" آگے چل کر اسے مالا مال کردے گی۔ بدقسمتی سے ایک طویل عرصہ تک ہندوستان کی تاریخ مذہب کے زیر اثر رہی اب وقت آگیا ہے کہ ان مختلف عوامل کا جائزہ لیا جائے جو تاریخ کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔

ای۔ ایچ کار کا کہنا ہے کہ مورخوں کو تاریخ کے سہل اور پیچیدہ عوامل کا تجزیہ کرنا چاہئے' کیونکہ تاریخ سائنس کی طرح دو مخالفانہ عوامل کے تصادم کے درمیان آگے کی جانب بڑھتی ہے۔

المیہ تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

برصغیر میں تاریخ ابتدا ہی سے المیہ کا شکار رہی ہے کیونکہ اس نے محض حکمرانوں کی شان و شوکت و عظمت کو ابھارنے کا کام کیا اور عوام کی زندگی اور ان کے کردار کو نظر انداز کیا۔ قدیم ہندوستان میں تاریخ لکھنے کا رواج نہ تھا اس لیے حکمران اپنے کارناموں کو زندہ جاوید بنانے کے لیے بھاٹوں کو ملازم رکھا کرتے تھے۔ جو ان کے خاندان کے فرضی شجروں اور ان کے کارناموں کو منظوم کرکے خاص خاص موقعوں پر سنایا کرتے تھے اور اس طرح ان کو عوام میں رواج دے کر حکمرانوں کو مقبول بنایا کرتے تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے یہاں تحریری تاریخ کا رواج ہوا مگر یہ تاریخ دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا تھی۔ اول' مورخ چونکہ حکمران طبقہ کے ملازم ہوا کرتے تھے اس لیے وہ صرف اسی طبقہ کی تاریخ لکھتے تھے اور اس بات کا پورا پورا خیال کرتے تھے کہ صرف انہیں واقعات کو منتخب کیا جائے جن سے اس طبقہ کی بڑائی اجاگر ہو۔ دوئم یہ مورخ مسلمان ہوتے تھے اس لیے ان کا رویہ ہندوؤں کی جانب سے انتہائی متعصبانہ اور غیر ہمدردانہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ایسے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے جن میں ہندوؤں کی شکست ہو ان کا قتل عام کیا گیا ہو ان کے بتوں کو توڑا اور ان کے مندروں کو مسمار کیا گیا ہو ان تحریروں سے شاید ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں حوصلہ پیدا ہو اور وہ اپنی بہادری اور شجاعت کے آگے ہندو اکثریت کو خاطر میں نہ لائیں۔

چنانچہ مسلمانوں کے عہد کی ان تاریخوں میں تعصب' ہندو دشمنی اور فرقہ وارانہ جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کو اسلام کا محافظ' حامی دین اور مسلمانوں کا پشت پناہ ثابت کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے خلاف تمام جنگوں کو جہاد قرار

دیا گیا ہے اور ان کے بتوں کو توڑنے اور مندروں کو مسمار کرنے پر انہیں "بت شکن" کے خطابات سے نوازا گیا ہے اس عہد کے ذہن کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہم عصر تاریخوں سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں: طبقات ناصری میں محمود غزنوی اور فتح سومناتھ کے بارے میں لکھا ہے'

"سومنات سے منات کا بت لے آیا اور اس کے چار ٹکڑے کیے گئے۔ ایک ٹکڑا غزنہ کی جامع مسجد میں رکھا۔ دوسرا سلطان محل میں باقی دو ٹکڑے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھیج دیئے گئے" (1)

تاریخ فرشتہ میں محمود غزنوی کے بارے میں ہے کہ اس نے تھانیسر کے راجہ کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"ہم مسلمانوں کا اس امر پر اعتقاد ہے کہ ہم اس دنیا میں جس قدر مذہب اسلام کی تبلیغ کریں گے اور غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مسمار کریں گے۔ اگلے جہاں میں ہمیں اتنا ہی ثواب ملے گا۔" (2)

متھرا کی فتح کے بعد محمود غزنوی نے شہر کو تاراج کیا اور بت خانوں کو توڑا اور جلایا اور چار سو سونے کے بت توڑ کر لے گیا۔ (3) سومنات کے بت کو توڑنے اور بت فروش کے بجائے بت شکن بننے کا واقعہ تو ہماری تمام تاریخوں میں ہے اور سب ہی اس سے بخوبی واقف ہیں۔

بت شکنی' مندروں کو مسمار کرنے اور ہندوؤں کا قتل عام کرنے کی وجہ سے محمود غزنوی کا شمار مسلمانوں کے ہر دلعزیز حکمرانوں میں ہوتا ہے اور تاریخوں میں اس کی کراماتیں بھی درج ہیں۔ مثلاً" طبقات ناصری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"جب واپسی پر ہندو راہنما اسے غلط راستہ پر لے گیا تو سلطان نے سجدہ میں گر کر باری تعالیٰ سے رو رو کر اخلاص کے ساتھ دعا کی۔ رات کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا کہ لشکر کے شمالی جانب روشنی نمایاں ہوئی' سلطان نے فرمایا کہ پورا لشکر میرے پیچھے پیچھے آئے ... دن چڑھا تو اللہ تعالیٰ نے اسلامی لشکر کو ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا جہاں پانی تھا۔ (4)

مسلمان مورخوں نے حکمرانوں کی بت شکنی کے واقعات کو بڑے فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھا ہے۔

التمش نے جب بھیلسہ کے قلعہ کو فتح کیا تو۔

"بت خانہ تباہ کرڈالا جس کی تعمیر میں تین سو سال صرف ہوئے تھے اور اس کی بلندی تخمیناً" ایک سو پچاس گز تھی۔ وہاں سے اجین نگر پہنچے اور مہاکال کا بت خانہ برباد کردیا۔" (5)

علاؤالدین خلجی کے عہد میں تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ملک کافور کی بت شکنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"معبد کے بت خانہ زریں کو مسمار کرایا اور سنہری بتوں کو جو قرنون سے اس علاقے میں ہندوؤں کے معبود تھے تڑوایا۔ بت خانہ کا تمام سونا' ٹوٹے ہوئے زریں بت اور بے انداز جڑاؤ برتن وغیرہ (مرصعات) لشکر کے خزانے میں جمع کرلیے گئے۔" (6)

ضیاالدین برنی' مسلمان حکمرانوں کے فرائض کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"وہ دین پناہی کا حق ادا نہیں کرسکتے جب تک حسبتہ اللہ اور حمیت دین رسول اللہ کی خاطر کفرو کافری اور شرک و بت پرستی کا قلع قمع نہ کردیں۔ اور اگر کفرو شرک کی مضبوطی کی وجہ سے ان کا کلیتہ" استیصال نہ کرسکیں تو کم از کم (اتنا ضرور کریں) اسلام اور حفاظت دین کی خاطر ہندوؤں' مشرکوں اور بت پرستوں کی جو خدا اور رسول کے شدید دشمن ہیں' توہین و تذلیل اور فضیحت و رسوائی میں کوشش کریں--- اسلام اور سچے دین کی عزت کی خاطر ایک طرف کافر اور مشرک کے لیے بھی یہ روانہ رکھیں کہ وہ عزت کی زندگی بسر کرے۔ (7)

عہد مغلیہ کے مورخین کے ہاں بھی اس قسم کے جذبات کی فراوانی ہے اکبر کی صلح کن اور رواداری کی پالیسی کے باوجود ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقہ کے ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ہلدی گھاٹ کی جنگ میں جہاں راجپوت مغلوں کی جانب سے اپنے ہی ہم مذہبوں سے لڑ رہے تھے تو مورخ عبدالقادر بدایونی نے یہ یادگار جملہ کہا کہ:۔

"دونوں جانب سے کافروں کا قتل ہورہا ہے"

محمد صالح کنبوہ نے شاہجہان نامہ میں جہانگیر کے عہد میں میواڑ کی مہم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ان دلاوروں نے لوگوں کو قتل کرنے' باندھنے اور پرانے بت خانوں کو ڈھانے پر کمر باندھ لی لوٹ مار اور گھروں کو پھونکنے کا ہنگامہ گرم کردیا۔" (8)

جہانگیر نے جب کانگڑہ کی فتح کے بعد اس کی سیر کی تو اس کا حال اس نے اس طرح

سے لکھا ہے:۔

"مختصر یہ کہ تقریباً" ایک کوس چڑھائی طے کر کے قلعہ میں داخل ہوا اور خدا کی توفیق سے اذان دلوا کر نماز اور خطبہ پڑھوایا اور گائے وغیرہ ذبح کرائی۔ ان میں سے کسی ایک شعار پر بھی' جب سے یہ قلعہ بنا ہے عمل نہ ہوا تھا۔ میں نے ان سب امور پر اپنے سامنے عمل کرایا اور اس نعمت پر سجدہ شکر بجا لایا۔" (9)

ان تاریخوں میں ہندوؤں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان سے بھی ان کے مذہبی تعصب کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً" کافر' لعین' مشرک ناپاک' اجل رسیدہ' گمراہ' نابکار' ان کے مرنے پر جہنم رسید ہونا۔ نجس وجود سے دنیا کو پاک کرنا۔ وغیرہ جملے استعمال کیے گئے ہیں جب کہ اپنے لوگوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں' ان میں بہادر' شجاع' مومن' نیک اور پاک باز ہیں۔ مسلمانوں کی ہر فتح تائید ایزدی اور اقبال شاہی کی وجہ سے ہوئی۔ کافروں سے لڑی جانے والی ہر جنگ جہاد تھی۔ اور اس جنگ میں لڑنے والے شہید اور فاتح غازی تھے۔

ان تاریخوں میں ہندو نقطہ نظر کی کوئی جگہ نہیں۔ ان کی تاریخ' ان کی تہذیب و ثقافت اور ان کے علم و ادب و تاریخ کے بارے میں اگر کچھ ہے تو حقارت کے ساتھ ان مورخوں نے اپنے دشمنوں اور مخالفین کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی ان کے تہوار' رسومات اور ان کی روایات و اقدار' سب سے آنکھیں بند کر کے یہ اپنی تنگ اور محدود دنیا میں آباد رہے۔

دوسری خصوصیت جو ان تاریخوں کی ہے وہ حکمران طبقہ کے افراد اور ان کی شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوششیں ہیں تاکہ رعیت میں ان کا رعب و دبدبہ رہے اور آنے والی نسلیں ان کے کارنامے پڑھ کر ان سے متاثر رہیں چونکہ ان کی تاریخ محض اس طبقہ سے وابستہ رہی اس لیے اس کا دائرہ بھی محدود رہا اور انہیں موضوعات پر تفصیل سے لکھا گیا جن کا تعلق حکمران طبقہ سے تھا' یعنی جنگیں فتوحات' دربار کی سرگرمیاں اور ان کے مشاغل بادشاہوں اور امراء کے کردار میں اس عہد کی تمام خوبیاں اور اوصاف جمع کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کی ذاتی برائیوں اور سیاسی کمزوریوں پر پردہ ڈالا جا سکے' انہیں صوم و صلوۃ کا پابند' تہجد گزار' یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنے والا' سخی' فیاض اور بعض حکمرانوں کے لیے یہاں تک کہ وہ ٹوپیاں سی کر اور قرآن شریف لکھ کر اپنی روزی کماتے تھے بعض حکمرانوں کو تو

ولی اللہ کا درجہ دے دیا گیا ہے' جن کے مزاروں پر اب بھی لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اس سے تاریخ میں اس نظریہ کو تقویت ملی کہ تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں صرف شخصیتوں کا حصہ ہوتا ہے۔ عوام محض ان کے مقلد ہوتے ہیں۔

چونکہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ عہد مسلمانوں کی کامیابیوں اور فتوحات کا ہے' اس لیے ان تاریخوں کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مسلمان حکمران طبقہ کی خوشحالی ان کی ثقافت' تہذیب و کلچر اور ان کی روایات و اقدار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اس وجہ سے یہ عہد آنے والے مسلمانوں کے لیے سنہرا اور زریں عہد بن گیا' اور اپنے زمانے میں وہ ان تاریخوں کی مدد سے ماضی کی شان و شوکت کو ابھارنے لگے تاکہ عظمت کے واقعات زوال شدہ معاشرے کے سرد دلوں کو گرما سکیں۔

برطانوی عہد میں جب ہندوؤں میں بیداری ہوئی اور ان کے ہاں بھی احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں تو ان کے مورخین نے بھی قدیم تاریخ کو کھنگالنا شروع کیا اپنی ماضی کی شان و شوکت کی تعمیر و تشکیل میں انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے یہاں ترقی کی رفتار رک گئی اور مسلمانوں کی حکومت نے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو نقصان پہنچایا اس کے رد عمل میں مسلمانوں نے اپنا دفاع شروع کیا یہ ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ واریت کا وہ زمانہ ہے جب ہندو مورخوں نے بھی تعصب و دشمنی کی جنگ میں برابر کا حصہ لیا اور تعصب کے سہارے نفرت و عداوت کے پودوں کو پروان چڑھایا۔

اس مرحلہ پر ہم ان مورخوں کو فراموش نہیں کرسکتے جنہوں نے فرقہ واریت سے بلند ہو کر انصاف کی نگاہ سے تاریخی واقعات کا جائزہ لیا ہے۔

ملک کی تقسیم ہونے کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ تاریخ سے تعصب اور فرقہ واریت کے جذبات ختم ہوجائیں گے لیکن بدقسمتی سے ایسا دونوں ملکوں میں نہیں ہوا۔ پاکستان میں اس وقت جو تاریخ' اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہے اس کی بنیاد اسی تعصب اور فرقہ واریت پر ہے ان تاریخوں میں بھی ہمیں ان ہی دو رجحانات کا پتہ چلتا ہے جو ہماری ابتدائی تاریخوں میں ہیں یعنی مذہبی تعصب اور حکمران طبقہ کی خوشامد۔

ان بنیادوں پر طالب علم کے لیے ٹیکسٹ بکس لکھی گئیں ہیں۔ یہ ٹیکسٹ بکس لکھنے والے کئی کمزوریوں کا شکار ہیں۔ اولین طور پر ان کتابوں کو سیاسی نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے

اور سیاستدان کے نقطہ نظر سے واقعات و حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان واقعات کی تعبیر و تفسیر بھی بدلتی رہتی ہے اور برسراقتدار طبقے کے افراد کو تحریک و آزادی کا سرگرم کارکن ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن دلائل دیے گئے ہیں۔ تحریک آزادی کا سہرا صرف شخصیتوں کے سرباندھا گیا ہے اور عوام کی قربانیوں کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے ان مسلمان شخصیتوں کو جو کانگریس میں شامل تھیں یا جن کا تعلق مسلم لیگ سے نہیں تھا انہیں تاریخ سے نکال دیا گیا ہے کانگریس کے ہندو راہنماؤں کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

دوئم۔ ٹیکسٹ بکس لکھنے والے جدید تحقیق سے قطعی ناواقف ہیں اس دوران میں صد ہا سوانح حیات' یاداشتیں' ڈائریاں' خطوط اور حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کے ذاتی کاغذات شائع ہوچکے ہیں جنہوں نے واقعات کو بالکل نئے انداز سے پیش کیا ہے اور ان کی بنیاد پر ہندوستان و یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام بھی ہوچکا ہے مگر یہ مصنفین واقعات کا تجزیہ اسی روایتی انداز میں کرتے ہیں اور نئی تحقیق سے کوئی استفادہ نہیں کرتے اس وجہ سے یہ ٹیکسٹ بکس ہندو دشمنی' مذہبی تعصب یک طرفہ سیاسی نقطہ نظر' شخصیت پرستی اور قومی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہیں۔

سندھ کے اسکولوں میں' ابتدائی جماعتوں میں اردو اور معاشرتی علوم کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں جن حصوں کا تعلق سندھ سے ہے ان سے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ تاریخ لکھنے کے ذہن کا اندازہ ہوسکے خاص بات یہ ہے کہ اسی نقطہ نظر کو بار بار ہر جماعت میں یکساں طریقہ سے دہرایا گیا ہے۔ مثلاً" ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کے بارے میں پانچویں جماعت کی کتاب میں ہے:

"ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑے اختلافات تھے مسلمان ایک خدا کو مانتے ہیں جب کہ بت پرستی یا خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے سخت مخالف ہیں ہندو بت سے دیوتاؤں پر ایمان رکھتے اور بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں چھوٹے بڑے یا امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں مانا جاتا کیونکہ سب مسلمان آپس میں برابر ہیں اس کے برخلاف ہندوؤں میں علیحدہ علیحدہ چار ذاتیں تھیں۔ نیچی ذات والے ہندو اونچی ذات والے ہندوؤں کے ساتھ نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ کھا سکتے تھے اور نہ ہی انہیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔" (10)

اس کتاب میں آگے چل کر لکھتا ہے کہ:

"مسلمانوں اور ہندوؤں کے رہن سہن کے طریقوں' لباس' زبان اور خوراک میں بھی فرق تھا۔ دونوں قوموں کے تہوار علیحدہ علیحدہ تھے تاریخ اور تہذیب بھی جدا تھی۔" (11)

ہندوؤں کے رویہ کے سلسلے میں چھٹی جماعت کی کتاب میں ہے۔

"بحیثیت حکمران کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ بڑی رواداری اور فراخدلی کا برتاؤ کیا' مگر ہندوؤں نے مسلمانوں سے تعاون نہیں کیا--- دراصل یہ ہندو سمجھتے تھے کہ جنوبی ایشیا ہندوؤں کی سرزمین ہے اور مسلمانوں کو اس میں آزادی سے رہنے کا حق نہیں۔" (12)

ہندو طرز تعمیر کے بارے میں ہے کہ:

"ہندوؤں کا طرز تعمیر پرانا تھا ان کے مکانات میں محراب نہیں ہوتے تھے نہ ہی گنبد یا مینار بنانا جانتے تھے۔ مسلمانوں کا فن تعمیر عروج پر پہنچ چکا تھا۔" (13)

ہندو لباس کے بارے میں ہے کہ:

"ہندوؤں کا اپنا لباس دھوتی تھا۔ ایک بغیر سلا ہوا کپڑا بدن کے چاروں طرف لپیٹ لیتے تھے' مگر رفتہ رفتہ پاجامہ شلوار کا رواج ہوگیا ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کی رسم" مکان کی وہ تقسیم جس میں ملاقات کے لیے اور مردوں کے لیے علیحدہ حصہ ہوتا ہے' تعلیم حاصل کرنے کا حق' یہ ساری باتیں جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے ساتھ آئیں۔" (14)

ہندو مسلم تعلقات کی پوری تاریخ اس سطحی اور غیر منطق انداز میں بیان کی گئی ہے۔ حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بجائے اور واقعات کا سیاسی و سماجی و معاشی نقطہ نظر سے جائزہ لینے کے بجائے ہر واقعہ کو محض تعصب اور فرقہ وارانہ جذبات کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔

1857ء کے واقعہ پر اب تک ہزار ہا کتابیں' نئے مسودوں' خطوط اور ڈائریوں کی اشاعت کے بعد تحقیق کے بعد شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں 1857ء میں صد سالہ جنگ آزادی کے موقع پر جہاں اور کتابیں چھپیں' ان میں سین کی کتاب" 1857ء میں واقعات کا اور ہندوؤں' مسلمانوں اور انگریزوں کے کردار کا واقعیت پسندی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ٹیکسٹ بکس کے مصنفین نے اس جدید تحقیقی لٹریچر کو قطعی نہیں پڑھا'

اور روایتی انداز میں 1857ء کے بارے میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے لکھا ہے۔

"یہ سانحہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ میں بڑا ہی درد ناک اور تباہ کن تھا۔ اس کے علاوہ اور ظالمانہ کارروائیاں بھی مسلمانوں کے خلاف کی گئیں۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو آگے بڑھایا گیا ان کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں اور حکومت ہر طرح ان کی سرپرستی کرنے لگی۔" (15)

1857ء کے بعد انگریزی پالیسی کے بارے میں ہے کہ:

"انہیں ہندوؤں سے زیادہ خطرہ نہیں تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہندو اب تک مسلمانوں کے غلام رہے ہیں اب ہمارے غلام بن جائیں گے یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے ہر معاملہ میں ہندوؤں کی حمایت کی اور انہیں آگے بڑھایا" (16)

آل انڈیا کانگریس کے سلسلہ میں جو معلومات فراہم کی گئیں ہیں اس کا اندازیہ ہے:

"جنوبی ایشیا میں ہندو منظم ہورہے تھے اور انہیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی---- انہوں نے 1885ء میں ایک جماعت بنائی جس کا نام کانگریس رکھا اس کانگریس کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اس کا بانی بھی ایک انگریز تھا .... کانگریس میں ہندوؤں کا پڑھا لکھا طبقہ شامل ہوگیا۔ ہندو تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے یوہ سمجھتے تھے کہ حکومت میں جو مسئلہ دوٹوں سے طے ہوگا وہ ان کے موافق ہی ہوگا۔" (17)

انہی بنیادوں پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ٹیکسٹ بکس لکھی گئی ہیں مطالعہ پاکستان کے نام سے جو کورس شروع ہوا ہے اس موضوع پر تجارتی پیانہ پر انتہائی گھٹیا کتابیں شائع ہورہی ہیں جن میں نہ تو زبان و بیان کی خوبصورتی ہے نہ کتابت کی اصلاح کی طرف توجہ دی گئی ہے اور نہ ہی جدید تحقیق سے کوئی فائدہ اٹھایا گیا ہے اس قسم کی کتابیں طالب علموں کو جہالت و گمراہی کی جانب لے جارہی ہیں۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سلیبس پر اگر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ایک ہی کورس کو بار بار مختلف کلاسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً" تحریک آزادی کا پرچہ انٹر سے شروع ہوتا ہے اور ایم۔ اے تک مسلسل پڑھایا جاتا ہے۔ یہی حال ہندوستان میں مسلمان دور حکومت یعنی سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کا ہے۔ اسلامی تاریخ میں سیرۃ رسول اللہ' خلفائے راشدین' امیہ اور عباسیہ عہد کو کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ہی معیار اور انداز میں پڑھایا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کے مرحلہ پر اہم تقاضہ اس بات کا ہوتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ ہم عصر ماخذوں کی روشنی میں کیا جائے جس کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ اور طالب علموں کو عربی و فارسی' ترکی اور یورپی زبانوں کے علاوہ انگریزی' جرمن' اطالوی' فرانسیسی اور روسی آنا چاہئے کیونکہ ان زبانوں میں مشرقی تاریخ پر بے پناہ کام ہورہا ہے۔ لیکن بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کی جماعتوں کو بھی دوسرے درجہ کی کتابوں کی مدد سے پڑھایا جاتا ہے اور طالب علم انٹر سے لے کر ایم۔ اے تک ایک ہی قسم کے سوالات کے ایک ہی قسم کے جوابات بار بار دیتا ہے اس کے علاوہ جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس کا دائرہ صرف سیاسی تاریخ تک محدود ہوتا ہے جس میں شاہی خاندانوں کی تاریخ ہوتی ہے اس عہد کی سماجی' و معاشی اور علمی و ادبی تاریخ کے بارے میں عام طور سے بہت کم پڑھایا جاتا ہے اس لیے تاریخ میں سماجی و معاشی قوتیں جو تبدیلیاں لاتی ہیں ان سے طالب علم کا ذہن ناواقف ہوتا ہے تاریخ کو سنہ وار واقعات کی شکل میں پڑھانے سے طالب علم میں واقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے اور اس میں تاریخ کا شعور پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں صرف مسلمانوں کے عروج کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور زوال کے عہد کو بالکل نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ مثلاً" عباسی دور حکومت کو المتوکل پر' عثمانی سلطنت کی تاریخ کو سلیمانی قانون پر اور عہد مغلیہ کو اورنگ زیب پر ختم کردیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علم زوال کی تاریخ اور زوال کے عمل سے ناواقف رہ جاتا ہے جب کہ ہمارے زوال شدہ معاشرے کے لئے ضروری ہے عروج کے عہد پر فخر کی بجائے زوال کے دور سے نہ صرف عبرت حاصل کرے بلکہ ان وجوہات اور اسباب کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے جو زوال کا باعث ہوئے ہیں۔

نہ ہی تاریخ کے ساتھ فلسفہ تاریخ پڑھایا جاتا ہے جو تاریخ کی آگہی کے لیے ضروری علم ہے کیونکہ فلسفہ تاریخ' تاریخ میں منصوبہ' قوانین اور فکر کی تلاش میں مدد دیتا ہے۔ اس لیے یہ تاریخی عمل اور تاریخ کی رفتار کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ہمارے ہاں امتحانی سوالات کا جو طریقہ ہے وہ بھی اپنی افادیت کھو چکا ہے وہی گھسے پٹے سوالات جو آج سے 50' 60 سال پہلے آتے تھے آج بھی آتے ہیں اس لیے آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ اگر تین سال کے پرچوں کو جمع کرکے امتحان کی تیاری کی جائے تو فیل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میڈیم کی تبدیلی نے بھی تعلیمی معیار کو گرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ اردو میں نہ تو معیاری ٹیکسٹ بکس ہیں اور نہ ہی تحقیقی کام اس لیے طالب علم غیر معیاری و گھٹیا کتابیں پڑھ کر امتحان دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا معیار تعلیم گرتا چلا جاتا ہے۔

لہٰذا تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں تاریخ کو جس انداز سے پڑھایا جاتا ہے اس سے نہ تو ہمیں برصغیر ہندوستان کے بارے میں پوری معلومات ملتی ہیں اور نہ ہی یورپ' امریکہ' افریقہ و آسٹریلیا کے بارے میں ہم کچھ جانتے ہیں۔ نہ تو ہم جدید تاریخ سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی قدیم تہذیبوں کے عروج و زوال سے آگاہ ہوتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی نسل کو پیدا کررہی ہے جو ذہنی لحاظ سے تنگ نظری' نفرت و عناد اور تعصب و فرقہ واریت کے جذبات سے مسموم ہو کر تعلیمی اداروں سے نکل رہی ہے' تاریخ کے اس محدود نقطہ نظر نے ان کے تخیل ان کی سوچ اور فکر کو سمیٹ کر ایک تنگ خول میں بند کردیا ہے جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کا پھیلاؤ بھی سمٹ کر چھوٹا ہوگیا ہے اور ان کی ذات کی تروتازگی اور شادابی مرجھا کر ختم ہوگئی ہے یہ تاریخ ایک ایسی نسل کو تیار کررہی ہے جس میں بنیاد پرستی' مذہبی جنونیت اور فاشزم کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں اور جو رواداری اور قوت برداشت سے قطعی عاری ہے یہ المیہ صرف تاریخ ہی کا المیہ نہیں بلکہ ہمارے پورے معاشرے اور ہماری پوری تہذیب و ثقافت کا المیہ ہے۔

○

حوالہ جات

(1) منہاج سراج: طبقات ناصری (اردو ترجمہ) جلد اول لاہور 1975ء ص۔ 412

(2) محمد قاسم فرشتہ تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) جلد اول لاہور۔ 1974ء۔ ص۔ 114

(3) ایضاً"۔ ص۔ 121

(4) طبقات ناصری - جلد اول - ص - 412

(5) ایضاً" - 794

(6) ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور 1969ء- ص - 488

(7) ایضاً" - 96- 97

(8) محمد صالح کنبوہ۔ شاہجہاں نامہ (اردو ترجمہ) جلد اول لاہور۔ 1971ء - ص - 80

(9) جہانگیر: توزک جہانگیری (اردو ترجمہ) جلد دوم لاہور۔ 1970ء ص - 301

(10) معاشرتی علوم' پانچویں جماعت کے لیے۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ 1983ء - ص - 6

(11) ایضاً" - ص - 6

(12) معاشرتی علوم: چھٹی جماعت کے لیے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ 1983ء - ص - 6

(13) ایضاً" - ص - 111

(14) ایضاً" - ص - 113

(15) ایضاً" - ص - 122

(16) اردو کی ساتویں کتاب۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ 1983ء - ص - 12

(17) معاشرتی علوم۔ چھٹی جماعت کے لیے۔ ص - 123' 124

○

Muslim Historiography

Morgoliouth, D.S..: Lectures on Arabic Historians. Calcutta 1930.

Rosenthal, F.: A History of Muslim Historiography. Leiden 1968.

Gibb, H.A.R.: Tarikh. In: Studies on the Civilization of Islam. London 1969.

Lewis,B.,and Holt, P.M. (eds): Historians of the Middle East. Oxford 1962.

Khalid, Tarif: Islamic Historiography: The Histories of Mas'udi. Albany 1975.

Indo-Pak Historiography

Pawan, Kiran: Sir Jadunath Sarkar: A Profile in Historiography. New Delhi 1985

Sarkar, J.N.: Romance of Historiography. Calcutta 1982.

Ganguly, D.K.: History and Historians in Ancient India. New Delhi 1984.

Hasan, Mohibul (ed): Historians of Medieval India. Meerut 1968.

Philip, C.H. (ed): Historians of India, Pakistan and Ceylon. Oxford 1961.

Mukhia, Harbans: Historians and Historiography during the reign of Akbar. New Delhi 1976.

Sarkar, J.N.: History of History Writing in Medieval India. Calcutta 1977.

Sen. S.P.: Historians and Historiography in Modern India. Calcutta 1973.
Hardy, P.: Historians of Medieval India. London 1960.
Grewal, J.S.: Medieval India: History and Historians. Amritsar 1975.

Muslim Rule in India: The Assessments of British Historians. Calcutta 1970.
Majumdar, R.C.: Historiography in Modern India. Bombay 1970.
Afonso, J.C. (ed): Historical Research in India. New Delhi 1979.
Devahuti (ed): Problems of Indian Historiography. Delhi 1979.

Bias in Indian Historiography. Delhi 1980.
Nizami,K.A.: On History and Historians of Medieval India. Delhi 1983.
Thapar, R. (ed): Communalism in Writing of Indian History. Delhi 1969.
Warderi, A.K.: An Introduction to Indian Historiography. Bombay 1972.
Mukhopadhyay, S.K.: Evolution of Historiography in Modern India. New Delhi 1981.
Basham, A.L.: Modern Historians of Ancient India. In: Studies in Indian History and Culture. Calcutta 1964.
Joshi, V.: Problems of History and Historiography. Allahabad 1964.
Pathak, V.S.: Ancient Historians of India. Delhi 1978.
Khurana, G.: British Historiography on the Sikh Power in the Punjab, London 1985.

European Historiography

Thompson, J.W.: A History of Historical Writing. Vol 1-2, New York 1962.

Schmitt, E.B.: Some Historians of Modern Europe. Chicago 1942.

Gooch, G.D.: History and the Historians of the 19th Century. London 1948.

Shotwell, J.T.: The History of Historical Writing. New York 1963.

Halperian, S.W.: Some Twentieth Century Historians. New York 1961.

American Historiography

Kraus, M.: The Writing of American History. Norman 1953.

Bellot, H.H.: American History and American Historians. London 1952.

Wish, H.: The American Historians: A Social-Intellectual History of the writing of American Past. New York 1960.

برصغیر کی تحریک آزادی میں تاریخ شناسی نے نہ صرف قوم میں آزادی اور غربت کے جذبات کو پیدا کیا' بلکہ سوئے ہوئے قومی جذبات کو ابھارا اور غیر ملکی اقتدار سے جدوجہد کا حوصلہ پیدا کیا۔ آزادی کے بعد تاریخ نویسی کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں کیونکہ اب اس کے سامنے ماضی کے مفروضوں اور نو آبادیاتی دور کے اداروں اور روایات کو توڑنے کا چیلنج ہے۔ مگر پاکستان میں تاریخ ایک جگہ منجمند ہو کر رہ گئی' اس لئے نہ تو فرسودہ اداروں کے خلاف جنگ لڑی گئی اور نہ ہی نو آبادیاتی دور کی روایات کو توڑا گیا' یہی وجہ ہے کی ہمارا تاریخی شعور ناپختہ اور ادھورا ہے۔ اس لئے جب معاشرہ کے زوال اور اس کے اسباب کے تجزیہ کا وقت آیا تو ہم خرابیوں کی جڑ تک نہیں پہنچ سکے